صالحہ عابد حسین

خواتینِ کربلا
کلامِ انیسؔ کے آئینے میں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

خواتینِ کربلا

کلامِ انیس کے آئینے میں

صالحہ عابد حسین

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲

جنوری ۱۹۷۳ء

قیمت =/۱۲

(جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۶)

فہرست

اظہر عبّاس

پیارے بھتیا، تمھاری حسین و دلکش شخصیت جو خلوص و محبت، دردمندی و دلسوزی، شرافتِ نفس اور لطافتِ ذوق، خوش طبعی اور زندہ دلی کا جیتا جاگتا مجسمہ تھی، موت کے بے رحم ہاتھوں نے مجھ سے چھین لی۔ میرے خوں چکاں قلم سے لکھے ہوئے یہ اوراق

نذر

ہیں تمھاری یاد کے جو میری زندگی کا سہارا ہے۔

دیباچہ

ابھی پوری طرح ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ حالیؔ اور انیسؔ کے نام اور کلام کان میں پڑنا شروع ہو گئے۔ حالیؔ اردو کے بہت بڑے ادیب، شاعر اور نقاد ہی نہیں ہمارے بزرگ بھی تھے۔ میری پیدائش سے چند ہی ماہ بعد ان کی وفات ہوئی تھی۔ خاندان کے تعلیم یافتہ مرد اور پڑھی لکھی لڑکیوں سے لے کر آن پڑھ بوڑھی خواتین تک بے تکلف ان کا کلام پڑھتی رہتی تھیں۔ میری بڑی پھوپھی مرحومہ کو مسدسِ حالی تقریباً ساری زبانی یاد تھی۔ یوں بھی جب حالیؔ کا ذکر آتا سب کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور ہر ایک اس انداز سے ان کا ذکر اور تعریف کرتا کہ مجھے آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

انیسؔ سے سارے خاندان کو ایک اور رشتے سے عقیدت تھی۔ یہ رشتہ تھا مدّاحِ اہلِ بیت سے ان مسلمانوں کا جو رسول اور آلِ رسول کے نام پر جان چھڑکتے ہیں۔ واضح رہے کہ میری ننھیال (مولانا حالی اور خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین) حنفی عقائد کی پابند تھی اور والد و والدہ اور ددھیال والے اثنا عشری عقیدہ رکھتے تھے

لیکن اہلِ بیت سے محبت اور انیسؔ سے عقیدت میں ننھیال و ددھیال دونوں برابر کے شریک تھے۔ مولانا حالیؔ نے مقدمۂ شعر و شاعری میں انیسؔ کے کلام کو جس طرح سراہا ہے، اس سے صاحبانِ ذوق اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کی یہ رباعی آپ نے ضرور سنی ہوگی۔

اردو گو راج چار سُو تیرا ہے ملکوں میں رواج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن باقی ہے تو لکھنؤ کی، ہے لکھنؤ تیرا ہے

میرے والد، چچا، بھائی، بہنیں، والدہ سبھی انیس کے کلام کے دلدادہ تھے۔ ہمارے وطن پانی پت میں محرّم کی چاند رات سے لے کر ۸ ربیع الاول تک بیسیوں گھروں اور متعدد امام باڑوں میں مردانی اور زنانی مجالسِ عزا برپا ہوا کرتی تھیں۔ زنانی مجلسوں میں عام طور پر سوز خوانی، حدیث خوانی اور بعد میں ماتم کے ساتھ نوحہ خوانی بھی ہوتی تھی مگر ہمارے گھر کی مجلس کی یہ خصوصیت تھی کہ شروع میں تھوڑی سی سوز خوانی تو ضرور ہوتی مگر ماتم کے ساتھ نوحہ خوانی نہیں ہوتی تھی۔ زیادہ تر انیس کے مرثیے تحت اللفظ پڑھے جاتے تھے۔ میری بڑی باجی (فاطمہ زیدی) اور چھوٹی باجی (سیدہ خاتون مرحومہ) دونوں بہت عمدہ تحت اللفظ پڑھتی تھیں۔ پہلے چند رباعیاں پڑھیں، پھر سلام کے کچھ شعر سنائے جن میں مدحِ اہلِ بیت ہوتی تھی یا پھر دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ اور اخلاقی مضامین بیان کیے جاتے۔ پھر سورۂ فاتحہ اور بآوازِ بلند درود شریف پڑھنے کے بعد انیس کا کوئی مرثیہ تاریخ کی مناسبت سے پڑھنا شروع ہوتا۔ انیسؔ کے مرثیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اپنے پیشرو مرثیہ گویوں اور ہمعصر مرزا دبیر کے برعکس وہ بینیہ مضامین کم لکھتے ہیں اور بیانیہ زیادہ۔ ہماری زنانی مجلسوں میں ان مرثیوں کے (لڑائی کا مفصّل حال یا گھوڑے اور تلوار کی لمبی لمبی تعریفوں کو چھوڑ کر) زیادہ تر وہ حصّے پڑھے جاتے جن میں واقعۂ کربلا کے کرداروں کی سیرت اور شخصیت اور آپس کے رشتوں اور محبت و پیار کا تذکرہ ہوتا ہے۔ بینیہ حصّہ آخر میں چند منٹ سے زیادہ

پڑھا ہی نہ جاسکتا تھا کہ گریہ وشیون کا جوش سننے اور پڑھنے والوں کو بے حال کر دیتا۔

کہہ نہیں سکتی کہ میں اس وقت ان مرثیوں کا کتنا حصہ سمجھتی تھی مگر کلام کی روانی، جوش اور حسنِ ادا مل جل کر کچھ ایسا منظر پیش کرتے کہ میں مسحور سی بیٹھی سنتی رہتی۔ جی چاہتا یہ پڑھے جاتے رہیں ہم سنتے رہیں۔ پھر گیارہ بارہ سال کی عمر سے خود بھی مجلس میں تحت اللفظ پڑھنا شروع کر دیا۔ الفاظ کا صحیح تلفظ اور مناسب طرزِ ادا سیکھنے کے لیے میں بڑی یا چھوٹی باجی یا اماں کو پہلے سے سنا دیتی اور پھر مجلس میں تکیے پر بیٹھ کر پڑھتی! آہ کیا سرور حاصل ہوتا تھا اس تجربے سے اور فخر کا کیسا انوکھا احساس!

اور یوں انیسؔ کے سارے محبوب ہیرو میری محبوب شخصیتیں بن گئیں۔ فاطمہ صغرا کی اپنے باپ بھائی سے محبت، زینبؑ اور امام حسینؑ کی بے پناہ الفت، سکینہ کی معصومیت، عباس کی بہادری وجاں نثاری اور حسین علیہ السلام کی ایثار و قربانی اور شہادت۔ ہر ہر واقعہ دل پر نقش ہو کر رہ جاتا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ جو کچھ انیسؔ کہہ رہے ہیں وہ میرے ہی دل کی آواز ہے۔

اس طرح میں نے کم عمری ہی سے انیس کو نہ صرف سنا بلکہ پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے کلام کے پورے محاسن کیا مطالب بھی برسوں بعد اچھی طرح سمجھ میں آیا۔ مگر غیر شعوری طور پر دل و دماغ بہت پہلے ہی سے ان سے متاثر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے اردو ادب سے جو گہری محبت اور اس کی خدمت کی جو لگن ہے اور اس سے تھوڑی بہت جو واقفیت ہے، اس میں انیسؔ کے کلام کا فیض بھی شامل ہے۔

جب ذرا پڑھنا لکھنا آیا تو کتابوں کا چسکا لگا اور مطالعہ کا شوق اتنا بڑھا کہ جو کتاب ہاتھ میں آئے بے پڑھے نہ چھوٹتی۔ زیادہ شوق نثر کی کتابوں اور وہ بھی افسانوی ادب کا تھا۔ ہزاروں ہی اچھی بری کتابیں پڑھ ڈالی ہوں گی۔ شعری ادب میں انیسؔ اور حالیؔ (جیسا کہ میں لکھ چکی ہوں) بچپن ہی سے محبوب تھے۔ اقبالؔ کے کلام سے دلچسپی

پیدا کرنے میں بھائی جان (سیدین صاحب) کا ہاتھ تھا کہ وہ ان کے بہت بڑے مداح ہیں۔ مگر غالب سے کب اور کیسے دلچسپی پیدا ہوئی یاد نہیں۔ اتنا جانتی ہوں کہ ان کا جو شعر سنتی یا پڑھتی فوراً یاد ہو جاتا۔ ان تینوں عظیم شاعروں میں میرا سب سے محبوب شاعر کون ہے، یہ آج بھی نہیں بتا سکتی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تینوں میرے اپنے ہیں اور ان کا بے بہا کلام میری انمول پونجی ہے۔

میں نے اپنے ان محبوب فنکاروں پر متعدد مضامین لکھے ہیں۔ حالیؔ پر علاوہ مضامین کے ایک پوری کتاب یادگارِ حالیؔ کے نام سے شائع کی ہے۔ غالبؔ پر بھی سات آٹھ مضمون لکھ چکی ہوں (کتاب لکھنے کی ہمت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے کہ اس حکیم فلسفی شاعر کے کلام پر تفصیل سے کچھ لکھنے میں پول کھلنے کا اندیشہ ہے)۔ انیسؔ پر بھی چھوٹے بڑے کئی مضمون اور تقریریں لکھ چکی ہوں۔ سب سے پہلے ادیب فاضل کے امتحان میں انیسؔ پر ایک مقالہ لکھا تھا (اس پرچے میں مرحوم تلوک چند محرومؔ ممتحن تھے اور کئی برس بعد انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس میں انھوں نے سو میں سے پچانوے نمبر مجھے دیے تھے)۔ مدت سے میرے دل میں یہ تمنا تھی کہ انیسؔ پر کتاب لکھوں۔ مگر میں یہ کتاب کیوں لکھنا چاہتی ہوں اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ میں انیسؔ کو اپنا محسن سمجھتی ہوں۔ ان کے کلام کا میرے ذہن، ذوق، اخلاق اور زبان پر بہت اثر پڑا ہے اور ہر بھلے آدمی کا جی چاہتا ہے کہ وہ اپنے محسن کا حق ادا کرے۔

لیکن ایک وجہ اور بھی ہے کہ مجھے بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ انیسؔ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ یوں تو انیسؔ کے کلام میں بے شمار خوبیاں ہیں لیکن ان کے ہاں کردار نگاری اور جذباتِ انسانی کی عکاسی ایسی ہے کہ جس کا پورے اردو ادب میں (اور غالباً فارسی ادب میں بھی) جواب نہیں۔ خصوصاً عورتوں کے کردار کی مصوری میں انھوں نے کمال کر دیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنی مجوزہ کتاب کا موضوع انیسؔ کی

کردار نگاری رکھوں۔ لیکن موضوع اتنا ہمہ گیر اور وسیع ہے جس کا پورا حق ادا کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ میں نے طے کیا کہ فی الحال موضوع کو سمیٹ کر اسے صرف خواتینِ اہلِ بیتِ اور ان دیگر عورتوں تک محدود کر دوں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح واقعاتِ کربلا سے ہے اور جن کی سیرت نگاری میں انیسؔ نے بڑی چابک دستی سے کام لیا ہے۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو بشرطِ صحت و زندگی ایک اور کتاب لکھنے کی آرزو ہے جس میں کربلا کے عظیم ہیرو امام حسین علیہ السلام اور اصحابِ حسینؑ کی جیتی جاگتی تصویروں پر جو انیسؔ نے کھینچی ہیں روشنی ڈالی جائے۔

میں یہاں اس واقعے کا بھی ذکر کر دوں جس کی وجہ سے یہ کتاب جو برسوں سے ذہن میں گھوم رہی تھی مگر کسی طرح لکھی نہیں جاتی تھی، خدا کا نام لے کر لکھنی شروع کر دی۔ انیس سے جو اُنس و محبت ہے اس کی وجہ سے ان کے مزار پر جانے اور ان کا گھر دیکھنے کی مدت سے تمنا تھی جو کچھ عرصے پہلے لکھنؤ جا کر پوری ہوئی۔ کئی چھوٹی موٹی گندی پتلی گلیوں میں سے ہو کر ہم کوچۂ میر انیسؔ پہنچے۔ کبھی اس گلی کے تمام مکانات میر انیسؔ کے گھرانے کی ملکیت تھے مگر نامساعد حالات کی وجہ سے ایک ایک کر کے مسمار ہوتے گئے اور رہے سہے بعض مکینوں کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے ٹھکانے لگ گئے۔ صرف ایک حویلی جس میں میر انیسؔ رہتے تھے، یادگارِ انیسؔ کمیٹی کی کوششوں سے کسٹوڈین کے قبضے سے بچائی جا سکی۔ اس حویلی کے دو حصے ہیں، ایک حصہ غالبًا دیوان خانہ ہوگا دوسرا زنانخانہ اور امام باڑہ وغیرہ۔ اب اس ٹوٹی پھوٹی حالت میں بھی یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ کبھی وہ بہت عالی شان اور خوبصورت حویلی تھی۔ باہر کے شاندار دروازے کا آرائشی کام اندر کے دالانوں میں محرابوں کی نزاکت، ان پر کندہ کیے ہوئے نقش و نگار صاحبِ خانہ کی خوشحالی، خوش ذوقی اور نفاستِ طبع کو اپنی زبانِ بے زبانی سے بیان کرتے ہیں۔ دوسرے حصے کو ٹھیک سے نہ دیکھ سکی۔ میں نے اندر جانا چاہا تو سیّد محمد ہادی صاحب نے جو میر نفیسؔ کے نواسے اور میر محمد عارف کے بیٹے ہیں اور اسی مکان میں رہتے ہیں، وہاں

جانے نہ دیا جس کی وجہ میں نہ سمجھ سکی۔ پھر بھی میں نے جھانک کر دیکھا۔ مکان کا بیشتر حصہ کھنڈر بنا پڑا تھا۔ بیچ میں وہ تاریخی حوض بھی شکستہ حالت میں نظر آرہا تھا جس میں انیس نے اپنے بھائی میر مونس کا مرثیہ ڈبو دیا تھا۔

میر محمد ہادی کی صورت اور نقش ونگار، لباس، انداز اور بات چیت میں اپنی خاندانی آن بان کی جھلک نظر آرہی تھی۔ ان کے پاس کچھ تبرکاتِ انیس ہیں جن میں سے میر انیس کی ہاتھی دانت کی ایک چھوٹی سی تصویر (جو انتہائی نزاکت ونفاست سے کسی باکمال آرٹسٹ نے بنائی ہے) ان کی دو چوگوشہ ٹوپیاں جن کا جالی اور بیل بوٹی کا کام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ان کی تحریر کے کچھ نمونے میر صاحب نے مجھے دکھائے اور وعدہ کیا کہ آئندہ فرصت سے آؤ گی تو اور بھی چیزیں دکھاؤں گا۔

حویلی سے ملحق ایک حصّے میں میر انیس اور ان کے خاندان کے کچھ افراد کی تربتیں ہیں۔ یادگارِ انیس کمیٹی نے مزارِ انیس کا ایک بڑا عمدہ نقشہ بنوایا ہے بلکہ بڑی حد تک عمارت تعمیر بھی ہو گئی ہے مگر ابھی تکمیل نہیں ہو سکی۔ مکان کی مرمت بھی خاطر خواہ نہیں کی جا سکی۔ کیونکہ ہمارے اس دیس میں صاحبانِ دولت وثروت بیکار تقریبوں، غلط رسموں، مذموم رواجوں پر لاکھوں روپیہ خرچ کر دیتے ہیں لیکن اپنے قومی ادیبوں اور فنکاروں کی یاد زندہ رکھنے کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا اور دھیان دلایا جائے تو گرہ سے پیسہ نہیں نکلتا۔ اور جو اِنے گنے صاحبانِ ذوق اور اہلِ دل ہیں وہ اکثر تہیدست ہوتے ہیں۔

برخلاف اس کے دوسرے ملکوں میں لوگ (جس میں حکومت، اہلِ ثروت، اور عوام سبھی شامل ہوتے ہیں) اپنی زبان کے ادیبوں اور شاعروں کے شاندار مزار بنواتے ہیں اور ان کے مکان اور گھر کی ایک ایک چیز کو محفوظ رکھتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ انیس جیسے یگانۂ روزگار شاعر کا مکان اور مزار بھی زمانے کے دست برد سے نہیں بچا سکتے۔

میر انیس کے مکان کو دیکھ کر اور مزار پر جاکر جو کیفیت تھی اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ملکِ سخن کے تاجدار کے سامنے ایک کم مایہ عقیدتمند کی جو کیفیت ہو سکتی ہے، وہی میری سمجھ لیجیے اور وہاں سے آنے کے بعد باوجود مشکلوں اور رکاوٹوں کے اس کتاب کی تصنیف کی لگن اور زیادہ بڑھ گئی اور کام شروع کر دیا۔ میری کئی سال کی کوشش کا جو نتیجہ نکلا وہ اب صاحبانِ ذوق اور انیس کے پرستاروں کی خدمت میں حاضر ہے۔

کچھ
میر انیسؔ
کے بارے میں

اچھے شاعر کے لیے اچھا انسان ہونا ضروری ہے یا نہیں، اس بارے میں کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا کہ ادب کی تاریخ شاہد ہے۔ ایسے اچھے شاعر گذرے ہیں جو اونچے اخلاقی اصولوں پر پورے نہیں اُترتے مگر فن کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فن کار کے فن میں ایک حد تک اس کی شخصیت، سیرت، اندازِ فکر اور اخلاقی اقدار کا پرتو ضرور نظر آتا ہے۔ وہ کبھی غیر محسوس اور کبھی شعوری طور پر اپنے فن پاروں میں اپنی فکر اور ذات کو سمو دیتا ہے۔ اور اس یقین کی روشنی میں جب ہم میر انیسؔ کی سیرت کو پرکھتے ہیں تو وہ ہمیں بہت بلند نظر آتی ہے۔

مرثیۂ امام حسین علیہ السلام یوں تو اردو شاعری میں ابتدا ہی سے لکھا جانے لگا تھا مگر اس وقت مرثیے میں زیادہ تر بینیہ مضامین ہوتے تھے جس میں امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کا دردناک بیان کر کے سننے والوں کو متاثر کیا جاتا، اس کا مقصد زیادہ تر رونا رلانا اور ثواب حاصل کرنا سمجھا جاتا۔ انھیں سن کر عقیدت مندوں کی آنکھیں اشکبار اور دل بیقرار ہو جاتے ہوں گے لیکن دل کی گہرائیوں میں عقیدت و احترام کی وہ شمع

شاید نہ جل سکتی ہو جس کی روشنی میں واقعاتِ کربلا کی عظمت اور اس کے ہیرو کی بلند سیرت کو صفائی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ نے مرثیے کی ہیئت بدلی۔ چو مصرعے کی جگہ مسدس کی طرز اختیار کی اور بینیہ مضامین کے ساتھ ساتھ دوسرے مضامین کو داخل کر کے مرثیے کے میدان کو بہت وسیع کر دیا۔ اس طرح "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کی کہاوت کو سراسر غلط ثابت کر کے دکھایا۔

لیکن اردو مرثیے کو اس بلند رتبے پر پہنچانے کا عظیم کام قدرت نے میر انیسؔ کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ جس کی بدولت یہ صنف اردو شاعری کی بہت بلند صنف بن گئی۔ علاوہ دیگر صفات کے (جن پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے) میر انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ امام حسینؑ کے ایمان و یقین کے نور کی چھوٹ ان کے عقیدتمندوں کے دلوں پر بھی (خواہ وہ لمحہ بھر کے ہی لیے ہو) پڑ جاتی ہے۔ دماغ انسانیت اور شرافت کے ان اونچے اصولوں سے متاثر ہوتا ہے جو اسلام کی جان ہیں اور جن کا مکمل نمونہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ پُر اثر اور دردناک واقعات بھی انیسؔ اس انداز سے دکھاتے ہیں کہ سننے والا اس غم میں بھی ایک خاص فخر اور روحانی تسکین محسوس کرتا ہے۔

امام حسینؑ پر ہر اسلامی ملک اور ہر دور میں مرثیے لکھے جاتے رہے ہیں۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں میں واقعاتِ کربلا پر اپنے اپنے انداز میں شعر کہے گئے ہیں اور خود اردو زبان میں لگ بھگ چار سو سال سے مرثیے لکھے جا رہے ہیں لیکن بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ میر انیسؔ کا سا باکمال، بلند پایہ، مرثیہ نگار نہ ہوا اور نہ آئندہ ہونے کی کوئی امید ہے۔ کیونکہ میر انیسؔ نے مرثیہ گوئی کو ایک ایسے بلند مقام پر پہنچا دیا ہے جس سے آگے لے جانا بظاہر ممکن نہیں نظر آتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں میرؔ و غالبؔ جیسے یگانۂ روزگار شاعر اپنا عجز بیان کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ حق تو یہ ہے کہ امام حسینؑ جیسے ممدوح کی

مداحی انیس جیسے مداح ہی پر پھبتی ہے۔

لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اپنی قادرالکلامی کے باوجود اگر وہ گھٹیا اخلاق کے خود غرض، دنیا دار، لالچی، خوشامدی قسم کے انسان ہوتے تو کیا ان کا کلام اتنا بلند پایہ ہو سکتا؟ جن قدروں کو انھوں نے امام حسینؑ کی ذات میں اجاگر کر کے دکھایا ہے، اتنے خلوص و اثر کے ساتھ وہ ان کے کلام کی جان بن سکتیں؟ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ کسی اور شاعر کے لیے اچھے اخلاق کا انسان ہونا ضروری ہو یا نہ ہو مگر جو شاعر سماجی اصلاح یا اخلاق و مذہب کے اصولوں کی تبلیغ و تفسیر کرنا چاہے، کبھی بلند پایہ شاعر نہیں بن سکتا جب تک خود ان پر گہرا عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنی زندگی میں حتی الامکان ان کا پابند نہ ہو۔ میر انیس کے یہاں ہمیں جو گہری عقیدت، خلوص اور جوش نظر آتا ہے وہ اس بات کا شاہد ہے کہ شاعر خود دل و جان سے ان قدروں پر ایمان رکھتا ہے جن کا وہ ذکر کر رہا ہے۔ میر انیس کی زندگی کے جو واقعات ہم نے سنے اور پڑھے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ انیس بڑے اونچے اخلاق، مضبوط سیرت اور بلند شخصیت کے مالک تھے۔

انیس اس گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو ایک طرف شرافت و نجابت، بلند اخلاق اور وضعداری میں مشہور تھا۔ اور دوسری طرف علم و فن میں اس کا لوہا مانا جاتا تھا۔ ان کے دادا میر حسن کی مثنوی سحر البیان اردو ادب میں آج تک بے مثل سمجھی جاتی ہے۔ ان کے والد میر خلیق نے مرثیہ گوئی کے میدان میں اپنی انفرادیت اور قابلیت کے جوہر دکھائے تھے اور میر انیس کے ورثے میں یہ ساری خاندانی دولت آئی تھی۔ لیکن محض ورثہ کسی شخص کو باکمال یا بلند سیرت نہیں بنا سکتا۔ اس میں تعلیم، تربیت، ذاتی اپج، قدرتی صلاحیت بھی درکار ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس باکمال شاعر کو فطرت نے یہ سب چیزیں بھی بخشی تھیں۔ اور اسی ورثہ، تربیت اور ذاتی جوہر نے مل کر انیس کو

انیس بنایا۔

انیس کی جسمانی، دماغی اور ذہنی تربیت اور تعلیم میں یقیناً ان کے والد میر خلیق اور ان کے قابل استادوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان کی پرورش اور تربیت میں ان کی والدہ کا بھی بہت بڑا حصہ نظر آتا ہے۔ سید مسعود حسین رضوی (جنھوں نے انیس پر بڑی تحقیق کی ہے اور بہت کچھ لکھا ہے)، فرماتے ہیں کہ انیس کی والدہ پڑھی لکھی خاتون تھیں جو اردو فارسی اور مذہبی مسائل سے کافی واقفیت رکھتی تھیں۔ اس دور میں بلاشبہ عورتوں کی تعلیم عام نہ تھی۔ لیکن تہذیب، شائستگی اعلیٰ تربیت اور عمدہ اخلاق تعلیم یافتہ گھرانوں کی عورتوں کا جوہر ہوتے تھے۔ اور پھر جن اِنے گنے گھروں میں عورتوں کو زیورِ تعلیم سے بھی آراستہ کیا جاتا تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا۔ میر انیس کی ذات میں ہمیں جو خودداری اور شرافت، بلند اخلاق، مذہب سے گہری عقیدت نظر آتی ہے وہ شہادت دیتی ہے کہ جس گود میں انھوں نے پرورش اور جس ہستی کی تربیت پائی وہ اونچے اخلاق اور کردار والی ہوگی۔ بے شک ہمارے پاس اس بارے میں تفصیلی معلومات موجود نہیں لیکن عورت کا جو گہرا احترام اور اس کی عظمت کا جو نقش ہمیں کلام انیس میں نظر آتا ہے وہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بچپن ہی سے ان کے دل میں عورت کی عزت کا احساس تھا۔ بچپن کے اثرات جس طرح بچے کے دل پر نقش ہو جاتے ہیں اس کے بارے میں آج کل کے ماہرانِ نفسیات نے بہت کچھ لکھا ہے۔ پھر جو بچہ فنکار بننے والا ہو اس کا دل تو اور زیادہ حساس ہوتا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے واقعات کا بڑا گہرا اور دیرپا اثر قبول کرتا ہے۔ بہت سے بڑے شاعروں اور ادیبوں کے فن پاروں کو غور سے پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا بچپن اور لڑکپن کس ماحول میں گذرا ہوگا۔ بلکہ مجھے تو یہ یقین ہے کہ ماں کی عظمت اور محبت کا نقش ہی فنکار کے فن میں عورت کا مقام متعین کرتا ہے۔ میر انیس کے کلام سے جس میں سینکڑوں مرثیے اور لاکھوں اشعار ہیں، ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں

عورت کا درجہ بہت بلند ہے۔ عام طور پر وہ عورت کو محبت کی دیوی، حیا کی کان، ایمان کی جان، شرافت و نیکی کی تصویر، قربانی و ایثار کی مورتی سمجھتے ہیں یہی نہیں بلکہ انھیں عورت میں بے خوفی، جرأت و ہمت، عزم و حوصلہ اور استقلال اور بہادری کے جوہر بھی نظر آتے ہیں جو اصول و حق کے لیے بڑے سے بڑے پہاڑ سے ٹکر لے سکتی ہے۔ جان اور جان سے زیادہ عزیز شے قربان کر سکتی ہے۔ اور ان کا یہ عقیدہ صرف خاندانِ نبوت کی عورتوں اور اہلِ بیتِ امام حسینؑ تک محدود نہیں بلکہ وہ عام عورتوں یہاں تک کہ امام حسین کے دشمنوں کی عورتوں میں بھی عالی ظرفی اور ایمان و شرافت کی جھلک دیکھ سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انیسؔ کے لکھے ہزاروں صفحات کھنگال ڈالیے مگر کہیں آپ کو ظالم نفس پرست، بدعقیدہ، حرص و ہوس کی غلام عورت نظر نہیں آئے گی۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ انیسؔ کی ماں، بیوی اور خاندان کی دوسری عورتیں بلند کردار اور مضبوط شخصیت کی مالک ہوں گی۔

میر انیسؔ کے کلام کی ایک حیرت ناک خوبی یہ ہے کہ وہ عورت کی نفسیات، جذباتی کشمکش اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اس قدر سمجھتے اور اس کے احساسات و جذبات کی اس خوبی سے ترجمانی کرتے ہیں کہ تصویریں منھ سے بولنے لگتی ہیں۔ ان کے کلام کا یہ ایک معجزہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جن ہستیوں کی مرقع کشی کی ہے ان کی طرف سے پڑھنے والے کے دل میں مذہبی عقیدے کی وجہ سے صرف عقیدت و ہمدردی ہی نہیں پیدا ہوتی بلکہ ان سے ایک ایسا لگاؤ محسوس ہونے لگتا ہے جو بالعموم اپنے بہت پیارے اور قریبی عزیزوں سے ہوا کرتا ہے۔ اور کسی شاعر یا ادیب کی اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے کردار زندہ انسانوں کی طرح چاہے جانے لگیں۔

ایک سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمام اصنافِ سخن میں سے انیسؔ نے مرثیے ہی کا انتخاب کیوں کیا؟ جس زمانے میں ان کے شعور نے آنکھ کھولی اس وقت ہندوستان

عموماً، اور اودھ میں خاص طور پر غزل کا طوطی بول رہا تھا اور بڑے بڑے شاعر اس میدان میں اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔ پھر میر انیسؔ جیسے قادر الکلام شاعر نے غزل کو چھوڑ کر مرثیے کو کیوں اپنایا۔

کہا جاتا ہے کہ شعر گوئی کی ابتدا انھوں نے بھی غزل سے کی تھی۔ اور ان کو اپنی بعض غزلوں (یا اشعار) پر استادوں کی داد بھی ملی لیکن اپنے والد کے مشورے سے انھوں نے مداحیِ اہلِ بیت کو جو خاندانی شرف تھا اپنایا اور اس میں اپنے کمال کے جوہر دکھائے۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہ ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ ان کا مزاج غزل اور خاص کر اس دور کی غزل سے کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غزل اپنے بنیادی حُسن، سادگی اور دلپذیری کھو چکی تھی۔ عشقِ حقیقی کی لگن بلکہ عشقِ مجازی کے سچے ولولے سے تہی دست ہو کر صنعت گری بن گئی تھی۔ صنائع و بدائع کی شعبدہ بازیاں، مشکل غیر مانوس ردیفوں اور قافیوں کی کرتب بازی، سطحی اور سستے جذبات کی نمائش اور غیر فطری محبت یا ہوس کا اظہار غزل میں اتنا عام تھا کہ جو لوگ اس ڈگر سے ہٹ کر چلتے انھیں گھٹیا درجے کا شاعر سمجھا جاتا۔ اس کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ میرؔ پر سوداؔ کو آتشؔ پر ناسخؔ کو ترجیح دی جاتی۔ مگر انیسؔ کا دل جو احساس کی نزاکت، جذبات کی شدت اور خلوص و انسانیت کے درد کا سرچشمہ تھا اس دور کی غزل سے کیسے نباہ سکتا تھا؟ بے شک مرثیہ گوئی ان کا خاندانی ورثہ تھا۔ اسلام و پیغمبرِ اسلام اور نواسۂ رسول کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ لیکن اگر ان کا مزاج اور طرح کا ہوتا تو وہ غزل گوئی بالکل ترک کیوں کرتے؟ میر خلیقؔ سے بڑھ کر کون اندازہ کر سکتا تھا کہ ان کے بیٹے کی جولانیِ طبع کے لیے مرثیہ سب سے موزوں اور وسیع میدان ہے۔ جہاں اس کے پورے جوہر نکھر کر سامنے آئیں گے۔

مرثیہ گوئی کی ابتدا انیسؔ نے باپ کے مشورے کی ضرور مگر بہت جلد خود انھیں

اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہی وہ صنفِ شاعری ہے جو ان کی ذہانت، قابلیت اور قادرالکلامی کا پورا بار اٹھا سکتی ہے۔ اور ان کی انفرادیت ابھر کر سامنے آسکتی ہے۔ اسی لیے تو شاعر نے پھر کسی اور طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور عمرِ عزیز کے پچاس سال سے زیادہ اردو مرثیے کی خدمت میں بسر کرکے اسے اردو شاعری کی سب سے بلند صنفِ سخن بنادیا۔

انیسؔ کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ وہ بلند پایہ شاعر ہیں اور صرف اُردو مرثیے ہی کو نہیں اردو زبان کو انھوں نے مالا مال کیا ہے۔ ان کے متعدد ایسے اشعار ہیں جن میں انھوں نے اپنی خدمت اور مقام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور انیسؔ کا بڑے سے بڑا معترض بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شیخی یا تعلّی تھی! فرماتے ہیں:۔

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر — مگر ہم نے پلّہ گراں کردیا
مری قدر کر اے زمینِ سخن — تجھے بات میں آسماں کردیا

گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو — ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

نظم ہے یا گوہرِ شہوار کی لڑیاں انیسؔ
جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں

ہزار رنگ کے گل اس چمن میں پھولیں گے — ترے بھی رنگ کو اہلِ سخن نہ بھولیں گے

ان کے ہم عصر اور ان کے بعد کے تمام شاعروں اور نقادوں نے اس بات کو مانا ہے اور ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔ حالیؔ کی رائے ہے کہ زبانِ اُردو کی جتنی خدمت انیسؔ نے کی،

دوسروں کے بس کی بات نہیں :۔

دلّی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ　　　اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیسؔ
دلّی جڑ تھی تو لکھنؤ اس کی بہار　　　دونوں کو یہ دعویٰ ہے ہمارا تھا انیسؔ

مرزا دبیرؔ نے جو خود بہت بڑے مرثیہ گو بھی تھے اور انیسؔ کے زبردست حریف بھی، انیسؔ کے انتقال پر کہا تھا :۔

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طورِ سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ

حقیقت یہ ہے کہ انیسؔ کی شاعرانہ عظمت تسلیم کرانے کے لیے دلیلوں، ثبوتوں اور مثالوں کی ضرورت ہی نہیں ۔ ان کا کلام خود اس کا شاہد ہے ۔ یعنی

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

انھوں نے اردو کے خزانے کو اتنے بے شمار اور بے بہا جواہر دیے ہیں جس نے اس کی قدر و قیمت بہت بڑھا دی ہے ۔ مناسب اور موزوں لفظوں کا بیکراں ذخیرہ حُسنِ بیان اور حسنِ ادا، کردار نگاری اور جذبات کی گہری عکاسی اور درد و اثر کی دولت یہ سب انیسؔ کے قلم کے زیرِ نگیں تھے، جن سے وہ جس طرح چاہتے کام لے سکتے تھے۔ حق تو یہ ہے :۔

کسی نے تری طرح سے اے انیسؔ
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

میر انیسؔ

کے

مرثیوں کا پس منظر

میر انیسؔ کے کلام پر کچھ لکھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کی شہادت کا، جس کو عام طور پر واقعۂ کربلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تھوڑا سا ذکر کر لیں۔ تاکہ ان پڑھنے والوں کو بھی جو تاریخِ اسلام کے اس دور سے واقف نہیں ہیں، کچھ اندازہ ہو جائے کہ انیسؔ کے مرثیوں کے ہیرو کون تھے۔ اور انھوں نے یہ عظیم الشان قربانی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی کیوں دی؛ ہم کوشش کرینگے کہ ذاتی جذبات کو الگ کر کے تاریخی حقیقت کی روشنی میں اس المیہ کو دیکھ اور دکھا سکیں۔

پیغمبرِ اسلام کے عہدِ نبوت کے شروع میں اسلام کی مخالفت اور آنحضرت کی دشمنی میں یوں تو سبھی اہلِ مکہ شامل تھے مگر بنی امیہ سب میں پیش پیش تھے۔ ان کا شجرۂ نسب ساتویں پشت میں جا کر آنحضرت کے خاندان سے مل جاتا تھا لیکن کئی پشتوں سے دونوں خاندانوں میں دشمنی چلی آرہی تھی۔ دشمنی کی جڑ یہ تھی کہ بنی ہاشم کا خاندان جس سے آنحضرت تعلق رکھتے تھے بحیثیت مجموعی دینداری، دیانت اور شرافت میں

مشہور تھا اور اسی لیے خانۂ کعبہ کی حفاظت اور خدمت اس کے سپرد تھی۔ اور بنی امیہ جو اپنے آپ کو اس منصب کا حق دار سمجھتے تھے ان سے حسد کرتے تھے۔ بعثت کے بعد آں حضرت کو اہلِ قریش سے عموماً اور بنی امیہ سے خصوصاً سخت تکلیفیں پہنچیں اور آخر کئی سال تک ان مخالفتوں کو جھیلتے جھیلتے جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو آنحضرت حکمِ خدا سے یثرب ہجرت فرما گئے جہاں کے کچھ لوگ دینِ حق کو قبول کر چکے تھے اور دوسرے لوگ اس پر لبیک کہنے کے لیے آمادہ تھے۔

مگر اہلِ مکّہ نے مسلمانوں کو یثرب میں بھی چین نہ لینے دیا۔ وہ بار بار جنگی تیاریوں کے ساتھ مدینۂ منورہ پر حملہ آور ہوتے رہے اور ساتھ ہی مدینے کے آس پاس کے یہودی اور دوسرے قبائل کو اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی دشمنی پر اکساتے رہے۔ مجبوراً مسلمانوں کو اپنے دین کی سلامتی اور حق کا پالن کرنے کے بنیادی حق کے لیے دفاعی جنگ کرنی پڑتی تھی۔ مگر ان مٹھی بھر حق پرستوں کے عزم و یقین کا یہ معجزہ تھا کہ باطل کی زبردست طاقتیں بار بار ان سے ہار ماننے پر مجبور ہوتی رہیں۔ آخر ۹ھ میں فتحِ مکہ کے بعد جو تائیدِ الٰہی سے آنحضرت کو ایک قطرہ خون بہائے بغیر حاصل ہوئی۔ ساری عرب دنیا حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئی۔

اس وقت بنی امیہ بھی مجبور ہوئے کہ اسلام قبول کر لیں۔ ان میں سے بعض نے دل سے اسلام قبول کیا ہوگا مگر زیادہ تر ایسے لوگ تھے جن کا یہ اقرار صرف زبان سے تھا، دل سے نہیں — دل میں اب بھی اقتدار اور امارت کی ہوس باقی تھی مگر اب وہ اسے تلوار سے نہیں تدبیر سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

آنحضرت کی وفات کے بعد جو چار خلیفہ ہوئے ان کا زمانہ خلافتِ راشدہ کہلاتا ہے۔ پہلی اور دوسری خلافت کے دوران میں بنی امیہ کھل کر سامنے نہیں آئے، مگر بعد میں ان کو اقتدار ملنا شروع ہوا۔ پہلے امیر معاویہ کے باپ اور ان کے

بعد وہ خود ملکِ شام کے گورنر مقرر کیے گئے۔ جہاں انھوں نے بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکومت شروع کی جو اسلام کی روح کے خلاف اور آنحضرت و خلفائے راشدین کی مثال کے برعکس تھی۔ جب حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے اور دنیائے اسلام کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق حکومت کرنے کی کوشش کی۔ وہ فقیر منش بوریا نشین خلیفہ تھے۔ اپنے ذاتی خرچ کے لیے مزدوری کرتے اور بیت المال سے کسی عزیز یا دوست کو ایک پیسہ بھی بلے استحقاق نہ دیتے تھے اور اسی زہد و تقویٰ کی توقع وہ اپنے ماتحت حاکموں سے رکھتے تھے۔ یہ بڑی بڑی وجوہ تھیں جس کے باعث اکثر لوگ ان کے خلاف ہوگئے اور ان لوگوں میں زیادہ تر وہی تھے جن کو بہت سی ناجائز مراعات حاصل تھیں۔ جن میں بنی امیہ کے خاندان والے پیش پیش تھے۔ امیر معاویہ نے شام پر پورا تسلط قائم کر لیا تھا اور ان کا تصورِ حکومت حضرت علی سے بالکل مختلف تھا۔ شاہانہ کرّ و فر کے ساتھ حکومت کرتے تھے اور باقاعدہ فوج رکھتے تھے۔ چنانچہ ان سے حضرت علی کو جنگ کرنا پڑی۔ خونریزی کو روکنے کے لیے انھوں نے ثالثی کے ذریعہ فیصلہ کرانا چاہا، مگر یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔ غرض بنی امیہ اور بنو ہاشم کی دیرینہ دشمنی کی وجہ سے مسلمانوں میں اختلاف کا جو بیج بویا گیا تھا وہ پروان چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ۴۰ھ میں حضرت علی کو ایک خارجی نے شہید کر دیا۔ آپ کی وفات کے بعد اہلِ حجاز و عراق نے آپ کے بڑے صاحبزادے امام حسن کو خلیفۂ رسول تسلیم کیا مگر شام میں امیر معاویہ نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا تھا۔ امام حسن نے جنگ و جدل، خون خرابے سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی بہت کوشش کی۔ اور آخر رفع شر کے لیے انھوں نے اس شرط پر امیر معاویہ کی خلافت تسلیم کر لی کہ وہ اپنے بعد کسی کو اپنا جانشین نہ بنائیںگے۔ لیکن امیر معاویہ نے اپنی زندگی ہی میں معاہدے کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ اور

اس اثنار میں امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد اب دینِ اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری محمدؐ کے نواسے اور علیؑ و فاطمہؑ کے چھوٹے بیٹے امام حسینؑ کے کندھوں پر آپڑی۔ وہ بھائی کی زندگی ہی میں حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اسلام کی کشتی بھنور میں پھنسی ہے۔ اور اس کو ڈوبنے سے بچانے کا فرض دیر سویر انھیں کو ادا کرنا ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ حالات کو دیکھتے رہے اور اس طرح کئی سال بیت گئے۔

امیر معاویہ نے اپنی وفات سے پہلے ہی اہلِ شام سے یزید کے لیے بیعت لے لی تھی۔ ان کے بعد یزید نے باضابطہ خلیفۂ رسول ہونے کا اعلان کر دیا۔ مگر یزید جو زبان اور عمل سے کھلم کھلا اسلام کی خلاف ورزیاں کر رہا تھا کسی طرح بھی اس منصب جلیل کا اہل نہ تھا۔ اس کے کردار اور فسق و فجور کو دیکھ کر عام طور پر مسلمان اس سے بیزار ہو گئے اور امام حسین کے پاس کوفہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں سے خط آنے شروع ہوئے کہ خلافتِ رسول آپ کا حق ہے۔ اور آپ ہی اس وقت اسلام کی ڈوبتی کشتی کو پار لگا سکتے ہیں۔ آئیے اور اس فاسق و فاجر کی حکومت سے ہمیں نجات دلائیے۔ ادھر یزید بھی غافل نہ تھا۔ اس کے گرگے شام میں مسلمانوں سے اس کی بیعت لے رہے تھے۔ عرب میں بھی یہی کوشش جاری تھی۔ اور اس کے لیے لالچ، ظلم، دہشت ہر حربہ کام میں لایا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ امام حسین علیہ السلام کی ذات ہے۔ چنانچہ حاکم مدینہ کے نام جو یزید کا ساتھی تھا اس کا فرمان پہنچا کہ حسینؑ ابن علیؑ سے میری بیعت لے ورنہ انھیں قتل کرا دے۔ اس نے فوراً امام حسینؑ کو بلایا اور بیعت یزید کا مطالبہ ان کے سامنے رکھا۔

اب حسینؑ کے سامنے دو ہی راستے تھے، یا یزید کی بیعت کر لیں یا اس کی بیعت سے انکار کر کے حکومت سے ٹکر لیں اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دیں ـــــ امام حسینؑ نے اندازہ

لگا یا کہ مدینے میں عافیت سے رہنا محال ہے تو مکّے جانے کی تیاری کی اور اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر کوفہ روانہ کیا کہ وہ اہلِ کوفہ سے آپ کی بیعت لیں اور وہاں کے صحیح حالات سے آپ کو مطلع کریں۔

امام حسینؑ کے ساتھ جانے کے لیے عزیزوں اور دوستوں میں سے بہت سے لوگ تیار ہو گئے۔ خاندان کی عورتوں نے بھی ساتھ جانے پر اصرار کیا۔ اور حسینؑ اپنے رفیقوں، عزیزوں، عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر مکّے کی سمت روانہ ہوئے۔ مدینے میں خاندان میں صرف ایک آپ کی نوعمر بیٹی فاطمہ صغرا، آپ کی سوتیلی ماں اُمّ البنین اور آنحضرت کی ضعیف بیوی ام المومنین اُمِ سلمہ رہ گئیں۔ اس کے علاوہ امام حسین کے بہنوئی یعنی حضرت زینب کے شوہر عبداللہ بھی (جو نابینا ہو گئے تھے) ساتھ نہ جا سکے مگر اپنے دو بیٹوں کو امام حسینؑ کے ساتھ کر دیا۔

امام حسینؑ کا ارادہ تھا کہ حج کر کے مکے سے آگے روانہ ہوں مگر یہاں پہنچ کر آپ کو اندازہ ہوا کہ یزید کے گرگے حاجیوں کے بھیس میں موجود ہیں۔ اندیشہ تھا کہ عین حج کے مقدس موقع پر چپکے سے حسینؑ کو شہید کر دیا جائے۔ حسینؑ نہ خانۂ کعبہ کی بے حرمتی گوارا کر سکتے تھے نہ چاہتے تھے کہ چپکے سے شہید کر دیئے جائیں اور دنیا کو پتہ بھی نہ چلے کہ نواسۂ رسول نے کس مقصد کے لیے جان دی۔ اور کس نے انھیں شہید کیا اور کیوں؟ شہادت تو ان کی منزلِ مقصود تھی مگر اس طرح کہ یزید اور یزیدی قوتوں کی حرکتیں دنیا پر اظہر من الشمس ہو جائیں۔ اور اسلام کو جو سخت خطرہ درپیش ہے وہ مٹ جائے۔

چنانچہ امام حسینؑ حج کے لیے نہیں ٹھہرے بلکہ عمرہ کیا۔ اور مکے سے روانہ ہو گئے۔ اس وقت لگ بھگ سو کے قریب مرد آپ کے قافلے کے ساتھ بتائے جاتے ہیں۔ عورتیں اور بچے اس کے علاوہ تھے۔ گرمی کا زمانہ، صحرائے عرب کی بنجر پہاڑیوں کا سفر، پانی اور غذا کی کمیابی۔ مگر یہ قافلہ ساری تکلیفیں صبر و خاموشی سے

سہارتا کوفے کی سمت چلا جا رہا تھا۔ ادھر یزیدی حکومت کو دم دم کی خبریں مل رہی تھیں۔ اور شام و رے کی فوجیں جوق در جوق حسینؑ پر حملہ کرنے کے لیے اکٹھا ہو رہی تھیں۔ کوفے میں گویا مارشل لا قائم ہو چکا تھا۔ امام حسین کے سفیر مسلم اور ان کے بچوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ان کے دوستوں اور ہمدردوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اور اکثریت کو خوف، جبر اور لالچ کے ہتھیاروں سے زیر کر کے حسینؑ کی بیعت سے منکر بنا دیا گیا تھا۔ اب وہ کوفہ جس نے سینکڑوں خط بھیج کر امام حسین کو ہدایت کے لیے مدعو کیا تھا۔ یزیدی طاقت کے خوف سے ان سے پھر چکا تھا۔

ابھی حسینؑ کوفے سے کئی منزلیں ادھر ہی تھے کہ مسلم کی شہادت کی خبر ملی۔ لیکن آپ نے کوفے کی سمت سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ یزیدی فوج کے ایک مسلح دستے نے جس کا افسر حُر بن ریاحی تھا آپ کا راستہ روک لیا۔ امام حسین چاہتے تو اس دستے سے راستے میں نبٹ سکتے تھے۔ مگر وہ جنگ کی ابتدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کو بجائے کوفے کے دوسری سمت رخ کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ ۲ محرم کو کربلا (جو نینوا کہلاتی تھی) کے میدان میں پہنچے۔ دریائے فرات کی ایک شاخ نہر فرات یہاں بہتی تھی۔ امام حسین اس کے کنارے اپنے خیمے نصب کرنا چاہتے تھے، مگر اس اثنا میں یزیدی فوجوں کے دستے وہاں پہنچ گئے اور آپ کو دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالنے نہ دیا۔ بلکہ دور صحرا کی گرم ریت پر خیمے نصب ہوئے۔

صحیح روایات میں یزید کی فوجوں کی تعداد جو ۷ محرم تک کربلا میں جمع ہو چکی تھی، بیس ہزار سے چالیس ہزار تک بتائی جاتی ہے جو اس وقت کے تمام تباہ کن ہتھیاروں سے مسلح تھی۔ یزید نے حاکم کوفہ ابن زیاد کو اور اس نے عمر ابن سعد (سپہ سالارِ فوج) کو پورا اختیار دے دیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے حسینؑ سے بیعت لو یا ان کو قتل کر دو۔

دو تین دن تک امام حسینؑ اور یزیدی افسروں کے درمیان بات چیت چلتی رہی، حسینؑ نے ہر ممکن کوشش کی کہ صلح ہو جائے۔ انھوں نے ان گمراہوں کو راہِ راست دکھانے کے لیے متعدد خطبے دیئے (جو تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں) لیکن وہاں تو ایک ہی رٹ تھی یا یزید کی بیعت یا حسینؑ کا سر۔ ۷ محرم سے نہر فرات پر دور دور تک پہرے بٹھا دیے گئے۔ باہر سے آنے جانے کے ناکے بند ہو گئے کہ حسینی قافلہ بھوک و پیاس کے کرب سے مجبور ہو کر اطاعت قبول کر لے۔ وہ یہ کیسے جان سکتے تھے کہ اس وقت ان کا سابقہ ایمان و یقین، صبر و استقلال کی ان چٹانوں سے ہے جن کو دنیا دی مصائب کی بڑی سے بڑی قوت ذرا سا بھی ہلا نہیں سکتی۔

۸ محرم کو عمرو بن سعد نے پھر امام حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا کہ اب بھی آپ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچا سکتے ہیں۔ امام حسین نے سختی سے انکار کیا مگر چونکہ آپ حتی الامکان جنگ اور خونریزی کو روکنا چاہتے تھے۔ اس لیے یہ مطالبہ رکھا کہ یا انھیں اس ملک سے کسی اور ملک کی طرف جانے دیا جائے (روایت ہے کہ آپ نے ہندوستان کا نام بھی لیا تھا) یا کم سے کم اتنی مہلت دی جائے کہ وہ شام میں جا کر یزید سے خود بات کریں۔ مگر حاکمِ کوفہ نے دونوں باتیں ماننے سے انکار کر دیا اور عمرو بن سعد کو کہلا بھیجا کہ یا بیعت لو یا ان سب کو قتل کر دو۔

اس سے پہلے جیسا ہم نے ذکر کیا امام حسینؑ کئی بار یزیدی فوج اور سرداروں کو ہدایت کا راستہ دکھانے کی کوشش کر چکے تھے۔ لیکن اب آپ کو یقین ہو گیا کہ ان راہ گم کردہ لوگوں پر کسی بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا آپ نے دشمن سے ایک شب کی مہلت لی اور اس رات اپنے سب ساتھیوں کو جمع کر کے صورت حال وضاحت کے ساتھ ان کے سامنے پیش کی۔ کہا کہ یزید کی فوج صرف میری جان کی دشمن اور میرے سر کی طالب ہے۔ میں تم پر سے اپنی بیعت اٹھاتا ہوں اور اجازت دیتا ہوں کہ رات

کی تاریکی میں تم لوگ جہاں چاہو چلے جاؤ۔ یہاں تک کہا کہ تم میں سے ہر ایک میرے ایک عزیز کا ہاتھ پکڑ کر لے جائے۔

اب یہاں تاریخ کا ایک بے مثال واقعہ سنیے۔ امام حسینؑ کے ساتھ اب صرف وہی سرفروش مجاہد رہ گئے تھے جن کے دل نورِ ایمان سے منوّر تھے اور جو حسینؑ کے پسینے پر اپنا خون بہانے کا ولولہ رکھتے تھے۔ ان جانبازوں میں (جن کی تعداد بہتّر سے ایک سو دس تک بتائی جاتی ہے) کچھ بہت ضعیف تھے، کچھ ادھیڑ عمر کے لوگ تھے، کچھ نوعمر لڑکے کچھ کم سن بچے اور چند جوان۔ ان مجاہدانِ حق میں سے ہر ایک نے حسینؑ کی بات کے جواب میں یہ کہا کہ ہم آپ کے ساتھ حق پر جان دینے آئے ہیں جان بچانے نہیں۔ اگر ایک نہیں ستر زندگیاں بھی ہوں تو اسلام کی خدمت اور حسینؑ کی حمایت میں قربان ہیں۔ اور یہ صرف کہا ہی نہیں بلکہ روزِ عاشورہ کر کے بھی دکھا دیا۔ ان کے دل کی آواز یہ تھی ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن

صبحِ عاشور نمودار ہوئی۔ یزیدی لشکر میدان میں صف آرا ہو گیا۔ امام حسینؑ نے نمازِ فجر ادا کی اور ساتھ ہی یزیدی لشکر سے تیروں کی بوچھار ہوئی۔ امام حسینؑ اتمامِ حجت کے لیے آگے بڑھے اور دشمن کے سامنے ایک نہایت فصیح و بلیغ تقریر کی اور فرضِ ہدایت کو پورا کیا۔ مگر یزید کے پورے لشکر میں صرف ایک شخص حُر بن ریاحی ایسا نکلا جس پر آپ کی باتوں کا اثر ہوا۔ اور وہ دشمن کی فوج سے نکل کر آپ کی طرف آگیا۔ اپنے قصور کی معافی مانگی اور سب سے پہلے حسینؑ کی حمایت میں اپنی جان نچھاور کی۔ ظاہر ہے مرثیہ گو حضرات جس تفصیل سے جنگ کا حال بیان کرتے ہیں اور ایک ایک مجاہد کی رخصت، جنگ، شہادت کی جزئیات دکھاتے ہیں، اس میں شاعرانہ مبالغہ اور تخیل کی کارفرمائیوں کا کافی دخل ہے۔ وہاں اتنی فرصت کہاں تھی، بہرحال تاریخی روایات شاہد ہیں کہ باقاعدہ جنگ

شروع ہونے کے بعد سب سے پہلے حسینؑ کے رفیقوں اور دوستوں نے دادِ شجاعت دی اور شہادت پائی۔ اس کے بعد عزیزوں نے اپنی جانیں نچھاور کیں۔ یہاں تک کہ ظہر کے وقت تک حسینی فوج کا ایک ایک سپاہی شہید ہو چکا تھا۔ اور اب حسین کے سب سے بڑے بیٹے امام زین العابدین اور گود کا بچہ علی اصغر باقی رہ گیا۔ اصغر بھوک اور پیاس سے جاں بلب تھا۔ امام حسینؑ کو اب آخری حجت تمام کرنا تھی۔ اور دنیا کو دکھانا تھا کہ فوجِ یزید شقی القلبی میں کس حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ وہ ننھے بچے کو لے کر دشمن کی فوج کے سامنے گئے۔ اس کی حالت بتائی اور اس کے لیے پانی کا مطالبہ کیا۔ لیکن انھوں نے اس کا جواب تیروں کی بوچھار سے دیا جس میں سے ایک سہ پہلو تیر علی اصغر کے سوکھے گلے اور حسین کے بازو میں پیوست ہو گیا اور ننھا معصوم تڑپ کر باپ کے ہاتھوں پر ختم ہو گیا۔

اب شہادت کی آخری منزل آگئی۔ حسینؑ محمد مصطفےٰؐ کے نواسے علیؑ مرتضیٰ جیسے شجاع کے بیٹے تھے۔ وہ جہاد کے لیے تیار ہوئے اور بے خوفی و دلیری کے ساتھ کچھ دیر تک تنِ تنہا دشمن کا بے نظیر بہادری سے مقابلہ کیا جس کا ذکر تاریخی تذکروں میں موجود ہے۔ اور پھر فوجِ دشمن کی تیغوں، تیروں، تلواروں کے سینکڑوں زخم کھا کر خاکِ کربلا پر اس وقت گھوڑے سے گرے جب عصر کی اذان کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ اور یہ آواز سن کر بانیِ اسلام کے نواسے نے اپنی پیشانی جو زخموں سے چور تھی سجدے کے لیے ریگ گرم پر رکھ دی اور اس حالت میں شمر نے سرِ اقدس تن سے جدا کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

امام حسینؑ کے جہاد کی منزل ختم ہوئی تو حسینؑ کے گھرانے کی عورتوں کا جہاد شروع ہوا۔ یزیدی فوجیوں کی دشمنی کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی تھی وہ خیموں میں گھسے اور ان محترم خواتین کے سروں سے چادریں چھینیں جو ان نام نہاد مسلمانوں کے محترم نبی کی عزیز تھیں، ان کے خیموں کو آگ لگائی۔ حسینؑ اور ان کے عزیزوں، رفیقوں کی لاشیں بے گور و

کفن صحرائے کربلا میں پڑی رہیں اور سید سجاد کو ان کو دفن کرنے کی مہلت نہ دی گئی۔ حسینؑ کے اہلِ حرم کے بازوؤں کو رسّی میں باندھ کر بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کیا گیا اور سیّد سجاد کے پاؤں میں بیڑی، گلے میں طوق پہنا کر ماں بہنوں کے اونٹوں کی مہار تھما دی گئی۔ اور ان کو عرب کے تپتے ہوئے خاردار صحرا میں سے کوفہ اور وہاں سے شام لایا گیا۔ حسینؑ پر مصیبتوں کے دس دن گذرے تھے لیکن ان مظلوموں پر قیامت کا ایک سال بیتا۔ کون سا ظلم اور کون سی (معاذ اللہ) ذلّت تھی، کون سا دکھ تھا جو انھیں نہ دیا گیا ہو، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ خاندانِ نبوت کی ان خواتین نے جن میں پچپن برس کی زینب بنتِ علیؑ سے لے کر ۴، ۵ سال کی سکینہ بنت حسینؑ تک شامل تھی۔ بڑے حوصلے، عزم اور بے خوفی کے ساتھ یہ سب سہارا۔ ان کے دلوں میں ایمان کی شمع روشن رہی اور اپنے مقصد کی کامیابی کا یقین راسخ رہا۔ دشمن جس طرح حسینؑ کو بیعت کرنے پر آمادہ کرنے پر ناکام رہا تھا۔ اسی طرح ان کے اہل حرم کو ڈرانے اور جھکانے میں کامیاب نہ ہوا۔ کربلا سے دمشق تک کے راستے میں حسینؑ کی بہنوں نے بار بار تقریریں کیں۔ لوگوں کو امام حسین کی شہادت کا حال بتایا اور اس عظیم مقصد کو واضح کیا جس کے لیے حسینؑ نے جان دی تھی۔ کوفے اور شام کے دربار میں حضرت زینب نے ابن زیاد اور یزید کو شرمندہ و ذلیل کیا اور دربار کے بہت سے لوگ جو واقعات کی تفصیل سے بے خبر تھے اس حاکم اور حکومت سے نفرت کرنے لگے۔

اور پھر ڈھائی سال کے اندر اندر اہلِ عرب نے قاتلانِ حسینؑ کو چن چن کر مار ڈالا۔ یزید اور ابن زیاد کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہا۔ ہاں ان کے ظلم و ستم کی وہ داستان باقی رہ گئی جس پر رہتی دنیا تک لوگ نفریں کریں گے۔

لیکن وحشت، بربریّت اور اسلام دشمنی کے اس دور میں کہیں کہیں ایماندار لوگوں کے چہرے بھی نظر آجاتے ہیں۔ دشمن کے صفوں میں بھی اسلام کے بعض شیدائیوں کی

جھلک نظر آجاتی ہے۔ جنھوں نے حق گوئی اور انصاف پسندی کی خاطر اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان میں مردوں سے کہیں زیادہ عورتیں ہیں۔

روایت ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب یزید کی فوج اہلِ حرم کو اسیر کر کے لے گئی اور شہدائے کربلا کے لاشے صحرا میں بے گور و کفن پڑے رہ گئے تو کربلا کے آس پاس کے دہقانوں نے جن کا پیشہ کھیتی باڑی تھا یہ دیکھا مگر یزید کے خوف سے چپ رہے۔ مگر جب یہ حقیقت ان کے عورتوں پر ظاہر ہوئی تو انھوں نے حسینؑ پر گریہ و ماتم کیا اور مردوں کو نفرین کی۔ ان کی غیرت کو للکارا۔ تب قبیلۂ بنی اسد کے مردوں نے ان کو دفن کیا۔ جب کوفے میں شہیدوں کے سر نیزوں پر بلند پہنچے اور قاتلانِ حسین اور دشمنانِ اہلبیت کی عورتوں کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ یہ رسولؐ کی نواسیاں قید ہو کر آئی ہیں اور خاندانِ رسول کے سر قلم ہوئے ہیں تو وہ سر و سینہ پیٹتی ہوئی، گلیوں میں نکل پڑیں اور کئی ایسی روایتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی حیثیت سے بعض عورتوں نے بے نظیر بہادری اور جرأت سے اپنے مردوں کا مقابلہ کیا۔ خولی جب امام حسین کا سر اپنے گھر لے گیا تو اس کی دو بیویوں نے سخت احتجاج کیا۔ اسی طرح یزید کی بیوی ہندہ کو امام حسینؑ اور اہلِ بیت سے گہری عقیدت اور محبت تھی۔ اس نے اپنے ظالم شوہر کو بے حد ملامت کی اور مجبور کیا کہ وہ اہلِ بیت کو قید سے رہا کر دے۔ اسی طرح کئی اور عام عورتیں اس یادگار واقعے میں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور ان تاریخی حقیقتوں کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان ننگِ کائنات لوگوں میں جنھوں نے امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس شقاوت کے ساتھ شہید کیا، عورتوں کا کوئی ہاتھ نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس وہ جب کبھی حقیقتِ حال سے آگاہ ہوئیں تو انھوں نے حق کا نعرہ بلند کیا اور مظلوموں کا ساتھ دیا۔

کربلا کے عظیم المیہ کا یہ سادہ سا خاکہ ہم نے حتی الامکان بے کم و کاست تاریخ کی

روشنی میں پیش کیا ہے۔ یہی وہ "سادہ و رنگین" داستان ہے جو سینکڑوں برس سے شاعروں اور ادیبوں کا موضوعِ سخن رہی ہے۔ ہمارے عظیم شاعر میر انیسؔ نے انھیں دلدوز اور پر اثر واقعات کو اپنے معجز نما کلام میں ڈھالا اور ان میں وہ دلکش رنگ بھرے ہیں جن کی چمک جب تک اردو زبان باقی ہے مٹ نہیں سکتی۔ امام حسینؑ اور مجاہدانِ کربلا کی سیرت کے علاوہ انھوں نے خواتینِ اہلِ بیت کے کردار کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا اور ان کے خط و خال و سیرت کو بڑی خوبی سے دکھایا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے دوسری عورتوں کی شرافت، حق کی محبت اور انسان دوستی کے جذبات کا بھی اعتراف کیا ہے۔ ان سے پہلے کے مرثیہ گو حضرات ان عام عورتوں کا ذکر تو کرتے ہیں۔ اور اہل بیت سے ان کی محبت کو بھی دکھاتے ہیں مگر انھوں نے ان کی سیرت اور کردار کو اس انداز سے پیش نہیں کیا جس طرح انیسؔ نے کیا ہے اور اس طرح واقعات کربلا میں انھیں ایک نمایاں جگہ دے کر ادب میں بھی زندہ جاوید بنا دیا۔

اب کہ میر انیسؔ کے مرثیوں کا پس منظر مختصر طور پر آپ کے سامنے ہے، وہ لوگ بھی جو ان واقعات سے اچھی طرح آگاہ نہیں ان کرداروں کی عظمت کو اور شاعر کے کلام کے حسن کے ساتھ ساتھ ان کی سیرت نگاری اور جذبات نگاری کے کمال کو پرکھ سکتے ہیں۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان چند اہم ہستیوں کا مختصر سا تعارف بھی کرا دیں۔ تاکہ جو پڑھنے والے ناواقف ہیں وہ بھی ان کے کارناموں، ان کے باہمی رشتوں کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

۱۔ امام حسینؑ۔ پیغمبر اسلام کے نواسے جو واقعۂ کربلا کے المیہ کے ہیرو ہیں۔

۲۔ عباسؑ بن علیؑ۔ امام حسینؑ کے بھائی حسینی لشکر کے علمبردار اور ننھے بچوں کے بھشتی۔

۳۔ علی اکبر۔ امام حسینؑ کے منجھلے بیٹے، جن کی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی جن کو عام طور پر ہمشکلِ نبی کہا جاتا ہے۔

۴۔ علی اصغر۔ امام حسینؑ کے چھوٹے صاحبزادے جن کی عمر واقعۂ کربلا کے وقت چھ ماہ سے ڈیڑھ سال تک کی بتائی جاتی ہے۔ جو امام حسینؑ کے ہاتھوں میں دشمنوں کے تیر سے شہید ہوئے تھے۔

۵۔ قاسم بن حسن۔ امام حسینؑ کے بھتیجے۔

۶، ۷۔ عون اور محمد، امام حسینؑ کے بھانجے اور حضرت زینب کے نوعمر بیٹے، جنھوں نے روز عاشور ماموں پر جانیں نثار کیں۔

۸۔ امام زین العابدین (جن کو اکثر سید سجاد یا عابد، یا بیمار کربلا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) امام حسینؑ کے سب سے بڑے صاحبزادے چوتھے امامؑ وہ اس وقت سخت بیمار تھے۔ اس وجہ سے روزِ عاشورا انھوں نے جہاد نہیں کیا اور اس طرح دشمن کی قید میں گئے۔

۹۔ حضرت زینب۔ امام حسینؑ کی بہن جو واقعۂ کربلا کی سب سے اہم خاتون ہیں۔ انھیں خاتونِ کربلا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ امّ کلثوم۔ امام حسینؑ کی چھوٹی بہن۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ امام حسین کے مقصد کو پھیلانے اور لٹے قافلے کی حفاظت کرنے میں برابر کی شریک رہیں۔

۱۱۔ فاطمہ کبرا۔ امام حسینؑ کی بڑی صاحبزادی۔

۱۲۔ فاطمہ صغرا۔ امام حسینؑ کی منجھلی صاحبزادی جو بیمار ہونے کی وجہ سے مدینے رہنے پر مجبور ہوئیں۔

۱۳۔ سکینہ۔ امام کی چار سالہ بچی۔

۱۴۔ شہر بانو۔ روایت کے مطابق شاہ ایران کی بیٹی ہیں۔ جو ایران کی فتح کے بعد مدینے آئی تھیں۔ حضرت علیؑ نے امام حسینؑ سے ان کا عقد کر دیا تھا۔

۱۵۔ فضہ جناب فاطمہ زہرا کی کنیز جو واقعۂ کربلا میں امام حسینؑ کے ساتھ رہیں۔

۱۶۔ ہندہ۔ یزید کی بیوی، جس نے خاندانِ نبوت میں پرورش پائی تھی۔

۱۷۔ شیریں۔ شہر بانو کی آزاد کردہ کنیز اور ایک رئیس کی بیوی۔

میر انیسؔ
کے
کلام میں ہندوستانی تہذیب

واقعۂ کربلا جہاں امام حسینؑ کے بہادر و جانباز رفیقوں کی قربانی و سرفروشی کا بے مثال مرقع ہے وہاں اس یادگار واقعے میں امام حسینؑ کے خاندان کی عورتوں کا کردار بھی تاریخ میں بے مثال ہے۔ ان صاحبِ عزم و ایثار خواتین کی سیرت اور کردار کو دکھانے میں انیسؔ نے اپنے قلم کا سارا زور صرف کر کے حسنِ بیان اور حسنِ ادا کا وہ کرشمہ دکھایا کہ ہر تصویر منہ سے بولنے لگی۔ یوں تو ہر مداحِ اہلِ بیت کے لیے ان کی شخصیت قابلِ احترام رہی ہے۔ لیکن دوسرے مرثیہ گو شاعر زیادہ تر ان مصائب کا تذکرہ کرتے جو ان کو کربلا میں پیش آئے۔ یہ میر انیسؔ کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے خاندانِ نبوت کی خواتین کی سیرت نگاری ان کے شایانِ شان کی مگر کردار نگاری کا حق بھی ادا کر دیا۔ مدینے سے کربلا تک کے سفر اور پھر محرم کے دس دن میں پیش آنے والے واقعات کی مرقع کشی کر کے انھوں نے دکھا دیا کہ وہ کس شان اور کس کردار کی بیبیاں تھیں اور جو کچھ انھوں نے جھیلا وہ کسی مجبوری یا بے بسی کی وجہ سے نہیں۔ وہ چاہتیں تو رنج و مصیبت کے اس سفر میں امام حسینؑ کے ساتھ نہ جاتیں

یا پھر جب امام حسینؑ نے شب عاشور اپنے رفیقوں اور عزیزوں پر سے اپنی بیعت اٹھالی تھی اور اصرار سے کہا تھا کہ جو جانا چاہتا ہے بخوشی چلا جائے۔ اس وقت یہ بیویاں اپنے بیٹوں یا شوہروں کو مجبور کر کے وہاں سے لے جاسکتی تھیں کہ اپنے پیاروں کی موت سامنے دیکھ کر عورت اور سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ مگر نہیں، ان حق اور ایمان پر جان دینے والی عورتوں نے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہستیوں کو حسینؑ اور ان کے اعلیٰ مقصد پر قربان کر کے اپنی شخصیت کی مضبوطی اور سیرت کی بلندی کا بے نظیر مظاہرہ کیا۔ کوئی شک نہیں کہ انھیں دکھ بھی ہوتا تھا اور صدمہ بھی اور وہ پیاروں کی موت پر گریہ و زاری بھی کرتی تھیں۔ مگر یہ تو وہ انسانی جذبے ہیں جو قدرت نے ہر انسان کو بخشے ہیں۔ (جن کے بغیر وہ فرشتہ ہوگا یا پتھر کا دیوتا، انسان نہیں) دل کی اس تڑپ اور پیاروں کی جدائی پر گریہ و ماتم سے ان کے کردار کی عظمت اور مقصد کی لگن پر کوئی حرف نہیں آتا۔

پھر امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کے مقصد کی تکمیل کا فرض انھوں نے اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھالیا اور اس راہ میں ہر جسمانی و ذہنی اور روحانی کرب جھیلا۔ مگر ان کے قدم راہِ رضا سے نہیں ڈگمگائے اور باطل کی ساری قوتیں بھی ان کو ڈرانے یا جھکانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اور جیسا پہلے کہا گیا ہے خواتین اہلِ بیت کے پہلو بہ پہلو ہمیں عام عورتوں کے کردار بھی ملتے ہیں۔

ان عورتوں میں خاندانِ نبوت کی کنیزیں ہیں، عام شہری اور بدوی عورتیں ہیں، حاکمِ شام یزید کی بیوی ہندہ ہے، امام حسین کی بیوی شہربانو کی آزاد کردہ کنیز شیریں ہے۔ قاتلانِ حسینؑ کی عورتیں ہیں جو اپنے سفّاک مردوں کے برعکس سچی مسلمان اور بانیِ اسلام کے چہیتے نواسے کی فدائی ہیں۔ غرض ہر طبقے اور ہر قسم کی عورتیں انیسؔ کے نگارخانے میں آتی ہیں۔ جن کے ساتھ انیسؔ نے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اور بڑی

خوبی و دلسوزی کے ساتھ ان کرداروں کو پیش کیا ہے۔

جن گھرانوں میں (اور یہ گھرانے ہزاروں سے زیادہ ہیں) انیس کا کلام پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ وہاں سیدۃ النسار فاطمہ زہرا، زینب اور کلثوم، صغرا اور کبرا، شہر بانو اور سکینہ، ام البنین اور زوجۂ عباس بڑی محبوب اور دلکش ہستیاں ہیں۔ اور ان کے ساتھ فضّہ، ہندہ، شیریں، زوجۂ حارث اور بنی اسد کی عورتوں سے بھی انھیں لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ ان کو اپنی ہی جیسی محب اہل بیت سمجھ کر دوست اور عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن محض مذہبی عقیدت اتنی محبت اور احترام پیدا نہیں کر سکتی جب تک وہ ہستیاں جن سے آپ کو عقیدت ہے ایسے جیتے جاگتے کردار بنا کر پیش نہ کی جائیں کہ زمان و مکان کا بعد گویا مٹ جائے۔ انیس کے کلام کا یہ کمال ہے کہ اس کو پڑھتے اور سنتے وقت ذرا دیر کو تیرہ سو برس کا فاصلہ جیسے درمیان سے غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنائیت کا یہ احساس شاید اس حد تک پیدا ہونا مشکل تھا اگر عرب کی ان ہستیوں کی تصویروں میں ہندوستانی رنگ نہ بھرے جاتے ویسے تو اردو کے سبھی مرثیہ گویوں نے کربلا کی شخصیتوں کو ہندوستانی رنگ میں پیش کیا ہے۔ خاص کر دکن میں جہاں چار سو برس سے زیادہ ہوئے اردو مرثیہ کی ابتدا ہوئی تھی، مقامی رنگ اور دکنی تہذیب خاص طور پر نمایاں تھی۔ پھر شمالی ہند میں بھی اکثر مرثیہ گو شاعروں نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ بلکہ بعض شاعر تو اتنی دور نکل گئے ہیں کہ اس میں تصنّع کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ مرزا دبیر تک نے اکثر جگہ مرثیہ کے کرداروں خاص کر نسوانی کرداروں کی زندگی میں اس شدت اور غلو کے ساتھ ہندوستانی کیا لکھنوی تہذیب اور رسم و رواج کو دکھایا کہ اس میں حقیقت کی جھلک تک پیدا نہیں ہو سکی۔ انیس نے بھی اس روایت کو اپنایا، خاص طور پر خاندان نبوت کی تہذیب اور رہن سہن کو ہندوستانی روپ میں پیش کرنے کی شعوری کوشش کی۔ مگر ان کے یہاں یہ رنگ

تصویر کے باریک خط و خال کے ابھارنے اور نکھارنے کا کام انجام دیتے ہیں اس کو بگاڑتے نہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اگر انیسؔ نے عرب خواتین کو ہندوستانی لب و لہجہ نہ دیا ہوتا اور ہندوستانی تہذیب و رسم و رواج کا پابند نہ بنایا ہوتا جب بھی ہم ان کا دل سے احترام کرتے۔ لیکن ان کے ساتھ اپنائیت کا احساس اس قدر شدت کے ساتھ محسوس نہ ہوتا کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنی زبان، تہذیب، رہن سہن کو زیادہ پسند کرتا ہے اور جن تاریخی ہستیوں میں اس کی جھلک نظر آئے ان سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

لیکن وہ لوگ جو انسانی فطرت کی خصوصیت کو نہیں سمجھتے' اعتراض اور نکتہ چینی کے شوقین ہوتے ہیں، انیسؔ پر معترض ہیں کہ انھوں نے عرب کی ان سادہ مزاج عورتوں کو ہندوستانی روپ میں پیش کر کے واقعات کربلا کی غلط مرقع کشی کی ہے اور وہ تاریخی غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ اعتراض کرنے والے خدا جانے بھول جاتے ہیں یا سمجھتے ہی نہیں کہ انیسؔ مؤرّخ نہیں شاعر ہے۔ اس نے واقعاتِ کربلا کی منظوم تاریخ پیش نہیں کی بلکہ بڑے بڑے اہم واقعات اور بنیادی حقیقتوں کو لے کر انھیں شعر کے روپ میں ڈھالا ہے۔ وہ اپنے گہرے احساس اور بلند تخیل کی بدولت ان واقعات کی چھوٹی بڑی جزئیات کو تصور کی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے کہ ایسے موقعے پر کیا ہوتا ہے، کیا ہو سکتا ہے اور کیا ہوا ہوگا۔ اور پھر چشم تخیل سے دیکھے ان واقعات کی وہ فنکارانہ انداز میں وہ تصویر کشی کرتا ہے۔

اس نے ہمیں واقعۂ کربلا کے لگ بھگ ڈیڑھ سو کرداروں کی زندگی کی ایسی دلکش اور پر اثر تصویریں دکھائی ہیں، درد و غم کے واقعات کی ایسی مرقع کشی کی ہے کہ یہ سب جیتی جاگتی ہستیاں بن کر ہمارے دل کے تاروں کو چھوتے اور دماغ میں اپنے ان مٹ اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ میر انیسؔ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ دنیا میں کچھ ایسی آفاقی شخصیتیں بھی ہوتی ہیں جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی تصویریں دنیا کے ہر ملک ہر قوم اور ہر

رنگ و نسل کے لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں بنائی ہیں۔ ہر جگہ کی مصوّری میں مقامی رنگ موجود ہے۔ حبشی نسل کے لوگوں نے ان کا چہرہ مہرہ حبشی بنایا ہے۔ اور یورپین نے انھیں مغربی حسن کا شاہکار دکھایا ہے۔ ڈی سوزا نے حضرت عیسیٰ کی مشہور تصویر ہندوستانی رنگ میں بنائی ہے۔ خود مہاتما بدھ کی تصویریں اور بُت ہندوستان، چین، جاپان، اور دوسرے ملکوں میں جہاں ان کو مانا جاتا ہے، اپنے اپنے مقامی رنگ اور انداز میں بنائے گئے ہیں۔ امام حسینؑ انھیں ہستیوں میں سے ایک ہیں جو سب کی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کی یاد سبھی اسلامی ملکوں میں اپنے اپنے انداز میں منائی جاتی ہے۔ ان کے مصائب پر گریہ و ماتم کے الگ الگ طریقے رائج ہیں۔ عراق، ایران، ہندوستان، پاکستان ہر ملک کے اپنے اپنے آدابِ تعزیہ داری ہیں۔ وہ یقیناً عرب نسل کے تھے مگر ان کا پیام عالمگیر ہے۔ ان کی محبوبیت اور احترام بھی عالمگیر ہے۔

یہ بات سوچنے کی ہے کہ انیسؔ جیسے عالم فاضل اور قادرالکلام شاعر کے لیے یہ کونسا مشکل کام تھا کہ تاریخی حقائق کی پوری پوری پابندی کرکے عرب اشخاص کو ان کے تہذیب و تمدّن کے پسِ منظر میں پیش کر دیا جائے۔ انھوں نے جان بوجھ کر ان کو ہندوستانی[لہ] رنگ و روپ دیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ ہندوستانی حسینؑ اور زینب ہندوستانیوں کے دل سے زیادہ قریب ہوں گے۔

ایک اور بات قابلِ غور ہے کہ انیسؔ کے یہاں کربلا کے مرد مجاہدوں میں ہندوستانی رنگ ہلکا اور خواتین میں زیادہ شوخ ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر

لہ میں معصوم رضا راہی کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ انیسؔ کے مرثیوں کا پس منظر بھی لکھنؤ اور لکھنوی تہذیب تھی۔ جہاں تک دبیرؔ کا تعلق ہے یہ بات ان کے اکثر مرثیوں پر صادق آسکتی ہے۔ لیکن انیسؔ نے جو کلچر اور تہذیب دکھائی ہے وہ شمالی ہند کے بیشتر حصّے اور دکھنی ہند کے کچھ حصے میں اس وقت عروج پر تھی۔ اور اب بھی اس کے بچے کھچے اثرات نظر آسکتے ہیں۔

ہوتی ہے کہ وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ بہادر، عالی حوصلہ، عرب مرد ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کے لوگوں کو یکساں متاثر کر سکتے ہیں مگر عورتوں کی سیرت نگاری میں مقامی رنگ و روپ اور انداز پیدا نہ ہوا تو وہ عورتوں کے دلوں کے تاروں کو نہیں چھیڑ سکتے۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بنیادی اخلاقی قدریں ہر ملک، ہر دور، ہر زمانے کی ایک ہوتی ہیں۔ نسوانی کرداروں کا لب ولہجہ اور رسم و رواج میں تھوڑی سی ترمیم کر دینے سے ان میں ذرا سی ہندوستانیت ضرور پیدا ہو جائے گی جو لوگوں پر زیادہ اثر کرے گی۔ لیکن باقی جو صفات ان عرب خواتین میں ہیں۔ وہ آفاقی اور عالمگیر ہیں۔ اور ہر دور، ہر مقام کی اونچے اخلاق اور بلند سیرت عورتیں ان سے مزین ہوتی ہیں۔ سیتا ہو یا مریم خدیجہ ہو یا فاطمہ زینب ہو یا فضہ، شہر بانو ہو یا ہندہ۔

میر انیس کے کلام میں خواتین کی سیرت اور زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ان باتوں کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہیے۔ ورنہ ہم اس کلام کے پورے حسن، پوری اہمیت اور مقصد کو نہ سمجھ پائیں گے۔

———— :: ————

اہم ہستیاں

اردو میں میر تقی میر اور نظیر اکبرآبادی بڑے پرگو شاعر گذرے ہیں۔ جن کے کلیات بہت ضخیم ہیں مگر میر جیسے شاعر کا بھی معیاری اور بلند پایہ کلام نسبتاً کم ہے۔ نظیر نے بہت کہا ہے بہت سی اچھی چیزیں اردو شاعری کو بخشیں۔ عوامی مذاق اور عوام کی پسند کو خواص کی شاعری میں پہلو بہ پہلو جگہ دی۔ اور ان کے کلام کا ایک حصہ یقیناً معیاری شاعری کی کسوٹی پر پورا اترے گا۔ مگر ان کا بہت سا کلام ایسا ہے جو عوامی نہیں عامیانہ بلکہ سوقیانہ ہے۔ غالب کا دیوان بے شک ایسا ہے جس کو کسوٹی پر کسا جائے تو ننانوے فیصدی کھرا نکلے گا۔ لیکن غالب کا جو کلام ہمارے پاس ہے وہ ان کا منتخب کلام ہے جس کا انتخاب خود ان کا کیا ہوا ہے۔ دوسرے وہ حجم میں اتنا کم ہے کہ رطب و یابس کے لیے گنجائش نہیں باقی رہ جاتی۔ یہ خصوصیت اردو شاعری میں انیس ہی کے حصے میں آئی ہے کہ اتنے پرگو شاعر ہونے کے باوجود ان کے یہاں گھٹیا یا کم درجے کی کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ کہیں کہیں بچارے معترض حضرات بہت ڈھونڈ کر زبان یا عروض کی کوئی خامی، یا کوئی سپاٹ مصرع تلاش کر لیتے ہیں اور بس۔ حقیقت یہ ہے کہ

ان کے سینکڑوں مرثیوں، سینکڑوں سلام اور رباعیوں کے ہزاروں شعروں میں زبان و بیان کا عجز، روزمرّہ کی غلطی یا محاورے کی غلط بندش شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ کیا صرف یہی ایک وصف میر انیسؔ کو اردو کا سب سے بڑا شاعر منوانے کے لیے کافی نہیں ؟

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا میر انیسؔ نے سینکڑوں مرثیے سلام اور رباعیاں لکھی ہیں۔ لیکن میں نے اپنی اس کتاب کے لیے انتخاب صرف مرثیوں (مسدس مسلسل نظم) میں سے کیا ہے۔ سلام اور رباعیوں کو ہاتھ نہیں لگایا کہ کام اور زیادہ پھیل جاتا۔ ان مرثیوں میں انیسؔ نے جنابِ رسالت مآب محمد مصطفیٰؐ کی ذات گرامی سے لے کر کربلا کے ننھے مجاہد علی اصغر تک کی سیرت کی مرقع کشی کی ہے۔ عام طور پر ایک مرثیہ میں کسی ایک ہیرو کی زندگی اور موت کی داستان بیان ہوتی ہے اور کمال یہ ہے کہ ہر ہیرو کی شخصیت کی انفرادی شان باقی رہتی ہے۔ اور اس میں وہ جان، تازگی، دلکشی، اور عقیدت کی کرشمہ سازی نظر آتی ہے۔ جس کا جواب دنیائے شعر میں ملنا محال ہے۔

ان شخصیتوں میں سے بعض سے انھیں بے پناہ عقیدت اور محبت ہے۔ (اور یہ وہی شخصیتیں ہیں جو دنیائے اسلام کی اور واقعۂ کربلا کے بھی اہم اور عظیم کردار ہیں) اسلام کے شجاع اور جانباز ہیرو علیؑ مرتضیٰ، خود شہیدِ اعظم امام حسینؑ، ان کے بہادر بھائی عباس بن علیؑ، کربلا کا نوجوان مجاہد علی اکبر، حضرت زینبؑ کے نوعمر لڑکے عون اور محمد کی سیرت اور زندگی کو انھوں نے خاص کر گہری عقیدت اور خلوص کے ساتھ دکھایا ہے۔ بچوں میں ننھے علی اصغر کی شہادت کا تذکرہ ہر جگہ اس انداز سے کیا ہے کہ سننے اور پڑھنے والا کلیجہ تھام لیتا ہے۔

ہمارا موضوع اس وقت واقعاتِ کربلا کے مردوں کی ذات نہیں۔ پھر بھی جہاں

کہیں ان کا ذکر ضروری ہوگا کیا جائے گا۔ اور اس سے ہمارے اس بیان کی تصدیق ہو سکے گی۔ خواتین اہلِ بیت میں یوں تو ہر بی بی کا احترام انیسؔ کے دل میں ہے۔ لیکن ان میں چند ہستیاں ایسی ہیں جن سے انھیں والہانہ عقیدت ہے۔ یعنی فاطمہ زہرا، حضرت زینب، فاطمہ صغرا، سکینہ اور شہربانو۔ لیکن عقیدت و محبت کے باوجود انیسؔ کے ذہنی توازن کا یہ ایک معجزہ ہے کہ وہ ان کی سیرت اور زندگی میں انسانی فطرت کی خصوصیات کو نظر انداز نہیں کرتے اور ان مثالی ہستیوں میں حقیقت کے ایسے رنگ بھرتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے ہی جیسے جیتے جاگتے انسان نظر آتے ہیں۔

جنابِ فاطمہؑ کا واقعۂ کربلا سے براہ راست تعلق نہیں۔ لیکن وہ حسینؑ و زینب کی والدہ ہیں۔ اسی گود میں ان عظیم ہستیوں نے تربیت پائی ہے۔ اس لیے اس تذکرے کو ہم ان کی ذاتِ گرامی سے شروع کریں گے اور دوسری خواتین کے کردار میں سے بعض کو الگ الگ اور تفصیل سے اور بعض کو اختصار سے دکھائیں گے۔

———— ∴ ————

سیّدۃ النساء
فاطمہؑ بنت محمدؐ

فاطمہؑ زہرا پیغمبرِ اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ و علیہ وآلہٖ وسلم کی بیٹی اور دنیائے اسلام کی وہ عظیم شخصیت ہیں جن کا احترام بلا استثنا ہر عقیدے اور ہر فرقے کے مسلمان کرتے ہیں۔ صرف اسی لیے نہیں کہ وہ ان کے ہادی و رہنما کی لختِ جگر ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ وہ زہد و اتقا، علم و فضل، ایثار و قربانی، خدمت و جفاکشی، خداترسی اور فیاضی، صبر و برداشت کی بے بہا صفات کی حامل تھیں۔ جس طرح پیغمبرِ اسلام کی ذاتِ قدسی صفات، اعلیٰ اخلاقی خوبیوں کا مجموعہ اور مسلمانوں کے لیے نمونہ تھی۔ ان کی بیٹی بھی اپنے والد کی تعلیم و تربیت کی بدولت عورتوں کے لیے نمونہ بن گئی تھیں۔

سیدۃ النساء کے عزّ و شرف کا کیا کہنا؟ پیغمبرِ اسلام کی لختِ جگر، اسلام کے جانثار اور بہادر ہیرو علیؑ کی شریکِ حیات، حسنؑ اور حسینؑ جیسی عظیم شخصیتوں کی ماں، کس عظمت و کردار کی مالک ہوگی۔ وہ ہستی جس کی آغوشِ تربیت سے ایسی کامل ہستیاں پروان چڑھیں۔ علامہ اقبال ایک فارسی نظم میں جنابِ فاطمہؑ کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:-

مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرتِ زہرا عزیز
نورِ چشمِ رحمت للعالمیں
آں امامِ اوّلین و آخریں
بانوئے آں تاجدارِ ھَل اَتیٰ
مرتضیٰؑ، مشکل کشا، شیرِ خدا
مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
مادرِ آں کارواں سالارِ عشق
آں یکے شمعِ شبستانِ حرم
حافظِ جمعیّتِ خیر الامم
واں دگر مولائے ابرارِ جہاں
قوّتِ بازوئے احرارِ جہاں
در نوائے زندگی سوز از حسینؑ
اہلِ حق حرّیت آموز از حسینؑ
سیرتِ فرزندہا از اُمّہات
جوہرِ صدق و صفا از اُمّہات
مزرعِ تسلیم را حاصل بتول
مادراں را اسوۂ کامل بتول
بہرِ محتاجِ دلش آنگونہ سوخت
با یہودے چادرِ خود را فروخت
گریہ ہائے او ز بالین بے نیاز
گوہر افشاندے بدامانِ نماز
رشتۂ آئینِ حق زنجیرِ پاست
پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفاؐ ست

ورنہ گرد تربتش گردیدمے
سجدہا بر خاکِ او پاشیدمے

فاطمہؑ کی پیدائش کا ذکر انیسؔ نے یوں کیا ہے :-

گھر میں رسولِ حق کے عجب دھوم دھام تھی
نوروز تھا کہ صبحِ ولادت کی شام تھی

بیٹی کی پیدائش کی خوشخبری سن کر رسالت مآب گھر میں تشریف لاتے ہیں اور دایہ بچی کو آپ کی آغوش میں دے دیتی ہے ؎

فرطِ خوشی سے سرخ ہوا روئے مصطفیٰ
بیٹی کا نام فاطمہ اس شاہ نے رکھا

فاطمہؑ زہرا کی شادی کا تذکرہ دیکھیے۔ واضح رہے کہ عرب میں نو برس کی لڑکی بالغ سمجھی جاتی تھی۔

لکھا ہے نو برس کی ہوئی جب وہ نامدار — پیشِ رسول آکے ہوئے لوگ خواستگار
فرمایا مصطفیٰ نے مجھے کیا ہے اختیار — تزویج فاطمہ کا ہے مختار کردگار

پیاری ہے کبریا کی، مجھے بھی عزیز ہے
بندہ ہوں جس کا میں وہ اسی کی کنیز ہے

اس کے بعد انیسؔ ان کی شادی اور منگنی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جبریلِ امین رسول اللہ کے پاس یہ پیام لاتے ہیں کہ ؎

بعد از سلام بھیجا ہے خالق کا یہ پیام
کیجیے علی سے عقد بتولؔ[1] فلک مقام

اور جب علی مرتضیٰ مزدوری سے فارغ ہو کر کہ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا،

---

[1] حضرت فاطمہؑ کا لقب۔

گھر آتے ہیں تو رسولِ خدا خوش ہو کر بھائی کو پاس بلا کر فرماتے ہیں کہ خدا کے حکم سے میں فاطمہ کی تم سے شادی کروں گا۔

ٹھہرا ہے تم سے عقدِ بتولِ فلک اساس
دنیا کے مال و زر سے بھی ہے کچھ تمھارے پاس
کی سر جھکا کے حیدرِ صفدر نے التماس
روشن ہے حال آپ پر یا شاہِ حق شناس

گو ہے لقب امیر یہ خادم فقیر ہے
اک تیغِ تیز، ایک زرہ اک بعیر ہے

ایک بند میں باکمال شاعر نے حیدرِ کرار کی سیرت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ پھر علیؑ کہتے ہیں کہ تیغ سے جہاد کرتا ہوں، اونٹ سے آب پاشی کر کے روزی کماتا ہوں۔ زرہ میری حفاظت کرتی ہے تو رسول اللہ کے فرمان کے بموجب علیؑ زرہ فروخت کر کے فاطمہ زہرا کا مہر ادا کرتے ہیں اور رسول اللہ سلمان فارسی کو بیٹی کا جہیز فراہم کرنے کے لیے فرماتے ہیں۔

دیکھیے یہاں شاعر نے ہندوستانی رسم و رواج کو نہیں ٹھونسا ہے اسے اسلامی احکام کی سادگی اور قابلِ عمل رسوم کی تبلیغ مقصود ہے تو وہ خاص عرب کے رواج اور اسلام کے حکم کے مطابق فاطمہ کا مہر علیؑ سے قبل شادی دلوا دیتے ہیں اور رسول اللہ اسی روپے سے بیٹی کا جہیز فراہم کرتے ہیں۔ جہیز کے ذکر میں بھی وہ رسول اللہ کی قابلِ تقلید مثال اور اس دور کی عسرت اور تنگی کے پیشِ نظر اپنی طرف سے مبالغہ نہیں کرتے بلکہ صحیح احادیث میں جو درج ہے اس کی روشنی میں جہیز کی تفصیل بتاتے ہیں:

تھا اس میں ایک بادیہ اور ایک مشکِ آب
دو چادریں تھیں اوڑھنی تھیں جن کو وہ جناب
لوٹا تھا اک فقط کہ وضو سے ہوں بہرہ یاب
تکیے تھے لیف خرمہ کے دو، ایک فرشِ خواب

زیور تھا فقر فاطمۂ خوش صفات کا
تھا یہ جہیز بنتِ شہِ کائنات کا

میر انیسؔ جہاں بھی فاطمہؑ کی سیرت کا ذکر کرتے ہیں، اُن کی مضبوطیِ کردار کی عظمت اور ان کی صفات کو بڑی خوبی سے دکھاتے ہیں وہ ان کو ایک مثالی عورت سمجھتے ہیں جو دنیا کی سبھی عورتوں کے لیے نمونہ ہو سکتی ہے۔

مہرِ سپہرِ عزّ و شرافت ہے فاطمہ　　شرحِ کتابِ عصمت و عفت ہے فاطمہ
مفتاحِ بابِ گلشنِ جنت ہے فاطمہ　　نورِ خدا و آیۂ رحمت ہے فاطمہ
رتبے میں وہ زنانِ دو عالم کا فخر ہے
حوّا کا افتخار ہے مریم کا فخر ہے

ان کی بزرگی کے اسباب یوں بیان کرتے ہیں۔

اللہ رے فاطمہ کی بزرگی زہے شرف　　بابا ملا تو فخرِ رسولانِ ماسلف
شوہر ملا امیرِ عرب اور شہِ نجف　　اللہ نے حسین و حسن سے دیئے خلف
دونوں امام خلق کے حاجت روا ہوئے
مشکل کشا کے بیٹے بھی مشکل کشا ہوئے

جنابِ رسالت مآب کو بیٹی سے جو محبت تھی اس کا تذکرہ جگہ جگہ انیسؔ نے کیا ہے ایک جگہ آں حضرت کی زبان سے فاطمہ کی بزرگی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

اکثر زباں سے اپنی یہ فرماتے تھے نبی　　ہے فاطمہ کو حق نے بزرگی عطا دہ کی
پیدا اگر جہاں میں نہ ہوتا مرا وصی　　دنیا میں پھر بتول کا ہمسر نہ تھا کوئی
جو سمجھے حور، عقل کا اس کے قصور ہے
میں سایۂ خدا ہوں وہ خالق کا نور ہے

اب فاطمہؑ کی سیرت کی وہ خصوصیات دیکھیے جنھوں نے ان کو اس مقام بلند پر پہنچایا۔ ایک جگہ ان کی ریاضت و عبادت، جفاکشی و تنگ دستی اور رضائے الٰہی پر راضی رہنے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

اب زہد و فقر فاطمہ کا کچھ سناؤں حال　　فاقے پہ فاقے کرتی تھی اکثر وہ پُر ملال
لاتے جو مزدِ آب کشی شیرِ ذوالجلال　　تب جو منگا کے پیستی تھی وہ نکو خصال
دولت سے کچھ غرض تھی نہ حشمت سے کام تھا
آٹھوں پہر خدا کی عبادت سے کام تھا

جز اک ردائے کہنہ نہ تھی دوسری ردا　　اس میں بھی لیفِ خرمہ کے پیوند جا بجا
بستر سے تھا کبھی نہ تنِ پاک آشنا　　فرشِ زمیں تھا خواب گہ بنتِ مصطفا
دنیا میں جیتے جی کبھی راحت نہیں ملی
فاقوں میں گر ملی بھی تو نانِ جویں ملی

رسولِ خدا کے مشہور صحابی سلمان فارسی جب فاطمہ زہرا کے یہاں جاتے اکثر ان کو چکی پیستے اور گھر کے کام کاج میں مشقت اٹھاتے دیکھتے ؎

پیشانی پر عرق ہے کفِ دست ہے فگار　　دیتی ہیں دودھ روتا ہے جب طفلِ شیرخوار
جاری زبانِ پاک پہ ہے شکرِ کردگار　　پہلو میں مارے بھوک کے شبرؑ ہے بیقرار
فرماتی ہیں نہ روؤ کچھ اس میں بھی راز ہے
داری خدا کریم ہے، بندہ نواز ہے

سلمان پوچھتے ہیں ؎

اے دخترِ رسولِ خدائے فلک جناب　　ان محنتوں کی آپ کے دل میں کہاں ہے تاب
جو پیستی ہیں، دودھ پسر کو پلاتی ہیں　　فضہ کے ہوتے آپ یہ ایذا اٹھاتی ہیں

فرمایا فاطمہ نے پس از شکرِ کردگار　　اک دن تو فضہ کرتی ہے سب گھر کا کاروبار
اور کی ہے میں نے محنت یک روزہ اختیار　　ایذا ہو اس کو یہ نہیں منظور زینہار
گو میں محمدِ عربی کی عزیز ہوں
حق کی کنیز وہ بھی ہے میں بھی کنیز ہوں

ان کی سخاوت کا بیان دیکھیے :-

محتاج تھی مگر تھا سخاوت کا بھی یہ حال
فاقے میں در پہ آن کر جس نے کیا سوال

دے آئی کچھ نہ کچھ اسے جا کر وہ خوش خصال
دنیا کے مال کو نہ سمجھتی تھی کچھ بھی مال

سینے میں دل علائقِ دنیا سے پاک تھا
کوہِ طلا بھی سامنے زہرا کے خاک تھا

اسلام کا ابتدائی زمانہ سخت مشکلات، عسرت و تنگی کا دور تھا۔ اور پیغمبرِ اسلام اور ان کے خاندان والے فقر و فاقے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ فاطمہ زہراؑ کے یہاں اس عسرت کا نظارہ سب سے زیادہ نظر آتا تھا۔ لیکن سائل کی سب سے پہلے اسی گھر سے ضرورت پوری ہوتی تھی۔ ان کی سخاوت اور ایثار کے بہت سے واقعات انیسؔ نے بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ کہیں کہیں سے اشعار لے کر دکھانا چاہتی ہوں۔ روایت یوں ہے کہ ایک سائل مسجدِ نبوی میں آکر رسولِ اکرمؐ سے کپڑے اور کھانے کا سوال کرتا ہے۔ آں حضرت فرماتے ہیں کہ کوئی ہے جو اس کی حاجت روائی کرے؟ اس وقت سب سے پہلے علی مرتضیٰؑ اور پھر دوسرے لوگ سائل کی مدد کرتے ہیں ؎

سرتاجِ دیں نے اپنا عمامہ دیا اسے
حیدر کے بعد سعد نے جامہ دیا اسے

پھر سلمان فارسی سائل کو فاطمہؑ کے گھر لاکر اسے کھانا کھلانے کے لیے کہتے ہیں :-

مخدومۂ جہاں نے کہا تب جھکا کے سر
غیر از خدا کسے ہے مرے حال کی خبر

فرزند میرے بھوک کی شدت سے مرتے ہیں
مجھ پر تو تین روز سے فاقے گذرتے ہیں

لیکن دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ سائل اس در سے مایوس جائے ؎

پر ہوں سخی کی بیٹی مجھے آتا ہے حجاب
یہ تو کبھی نہ ہوگا کہ سائل کو دوں جواب

خیر النساء خدا نے کیا ہے مرا خطاب
ہے شرم کی جگہ وہ نہ ہووے جو بہرہ یاب

اب تک تو رد سوال کسی کا کیا نہیں
اس در پہ سائل آن کے خالی پھرا نہیں

سخی کی بیٹی پر غور کیجیے اپنے منہ سے اپنی سخاوت کا تذکرہ ناگزیر ہے تو اس کو کس انداز میں کہا ہے جس میں فخر بھی ہے اقرار بھی انکسار بھی۔ اور یہیں انیس کا کمال نظر آتا ہے ؎

آخر اتار کر سرِ پُرنور سے ردا — سلماں سے زوجۂ اسد اللہ نے کہا
کر رہن یہ ردا مری اور جو شتاب لا — تا سیر ہو طعام سے اک بندۂ خدا

چادر گرو ہونے ایک یہودی کے یہاں جاتی ہے جس کو زہرا کی اس بے نظیر سخاوت میں اسلام کی سچائی کا جلوہ نظر آتا ہے اور وہ ایمان لے آتا ہے۔ سلمان جو لے کر واپس آتے ہیں۔ بنت رسول یہ نہیں کہتیں کہ جو فقیر کو دے دو یا تم خود کسی اور سے روٹی پکوا کر اسے کھلوا دو۔ میں بیمار ہوں، بھوکی ہوں، نہیں بلکہ ؎

جلدی سے لے کے دخترِ سلطانِ مرسلیں — چکی میں پیسنے لگیں جو بادلِ حزیں
پر تھیں یہ ناتواں کہ بدن تھرتھراتا تھا
زہرا کو مارے ضعف کے غش پر غش آتا تھا

اس حالت میں آٹا پیس کر روٹی پکا کر سائل کو شکم سیر کر دیتی ہیں ؎

آخر پکا کے روٹیاں اور اس پہ خرمہ دھر — سلماں کو دیں تو کہنے لگا یوں وہ خوش سیر
ہیں آپ تین دن سے گرسنہ مع پسر — اک نانِ جو رکھو کہ حسن ہوئے بہرہ ور

اس مومنہ کا یہ جواب کیا اہلِ دل کو تڑپانے کے لیے کافی نہیں ؎

بولیں بتول اس میں سے لینا روا نہیں
سائل کا کیا خدا ہے ہمارا خدا نہیں

شادی کے بعد بھی فاطمہ زہرا جیسا کہ اوپر کے بندوں سے ظاہر ہے عسرت اور تنگی کی

زندگی بسر کرتی تھیں۔ آنحضرتؐ کے مخالفین ان کی اور ان کے خاندان اور دوستوں کی اس عسرت کی زندگی پر تمسخر کرتے کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں تو خدا ان کو دولت وعیش و آرام کیوں نہیں بخشتا۔ اس جذبے کی تحت ایک بار قریش کی عورتیں فاطمہؑ کو اپنے یہاں ایک شادی میں مدعو کرتی ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ ان کے باپ اور شوہر کی غریبی کا مذاق اڑایا جائے۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ فاطمہ جانے میں اسی لیے تامل کرتی ہیں۔ مگر خدا انھیں جنت سے لباس فاخرہ بھیجتا ہے اس روایت کو انیسؔ نے بہت تفصیل اور جوش سے بیان کیا ہے۔ چند بند نمونے کے طور پر پیش کروں گی۔

آں حضرت جب بیٹی سے شادی میں جانے کو کہتے ہیں تو جیسے پہلی بار بیٹی کے منہ سے بے ساختہ اپنی حالت کا اظہار ہو جاتا ہے۔ انداز میں برائے نام شکوہ بھی ہے اور یہ کنایہ بھی کہ آپ کو میرے حال کی شاید خبر نہیں۔ ایک خود دار جوان لڑکی کا اپنے باپ سے یہ کہنا کتنا فطری معلوم ہوتا ہے ؎

عسرت میں فاطمہ پہ گذرتے ہیں ماہ و سال
نے فاخرہ لباس، نہ زیور، نہ زر، نہ مال
ہاتھوں پہ میرے آسیہ سائی کے ہیں نشاں
دن بھر میں گھر کے کام میں رہتی ہوں خستہ جاں
ظاہر حسن حسین کے ہیں تن پہ استخواں
محنت سے اب علی بھی نہایت ہیں خستہ جاں

اور اپنی حالت بتاتی ہیں ؎

اک پیرہن بدن میں ہے بس اور اک ردا
جس میں ہیں لیفِ خرمہ کے پیوند جا بجا

پاکبازی و زہد اور نسوانی فطرت کی کش مکش کی جھلک دیکھیے :-

ہر چند ہم غریبوں کو زیور سے کیا ہے کام
گہنا ہمارا زہد ہے یا سید الانام
ہے آرزو کہ گذرے عبادت میں صبح و شام
شادی سے کیا انھیں کہ جو غمگین ہے مدام

اور اس لیے ؎

شادی کے گھر میں جانے کے قابل نہیں ہوں میں

مفلسی کی وجہ بھی سن لیجیے اور شوہر پر فخر کا انداز بھی دیکھیے :۔

زیور ملا تھا جو مجھے اے مالک الرقاب — سب راہِ حق میں دے دیا آگاہ ہیں جناب
مجھ سے کہیں زیادہ سخی ہیں ابوتراب — پاتے ہیں وہ جو دیتے ہیں محتاج کو شتاب
لے کر اناج شب کو غریبوں میں جاتے ہیں
فاقے میں بھی فقیروں کو کھانا کھلاتے ہیں

اور پھر خیال آجاتا ہے کہ رسولِ خدا سے یہ شکایتی انداز گستاخی ہے تو معذرت بھی کرتی جاتی ہیں۔ نسوانی فطرت ہر ہر لفظ میں بول رہی ہے۔

مطلب یہ ان سبھوں کا ہے یا سید الامم — آئے تو یاں خجل کریں بنتِ نبی کو ہم
میں کیا ہوں نام آپ کا ہے اے فلک حشم — مجھ کو وہاں کے جانے میں گر ہے تو یہ ہے غم
وہ لوگ خستہ حال جو زہرا کو پائیں گے
منہ سے نہ کچھ کہیں گے مگر مسکرائیں گے

پھر میر انیسؔ یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ کس طرح فاطمہ زہرا کے لیے جنت سے لباسِ فاخرہ اور بے بہا جواہر آتے ہیں اور حوروں کا قافلہ لونڈیوں کے روپ میں ساتھ جاتا ہے۔ یہاں دیکھنے کی چیز یہ نہیں کہ آیا ایسی روایت آج کی دنیا میں قبول کی جائے گی یا نہیں بلکہ ہمیں یہاں خود شاعر کا گہرا عقیدہ دیکھنا ہے جو اس روایت کے لفظ لفظ پر ایمان رکھتا ہے اور دکھاتا ہے کہ جب اس شان و دبدبے سے بنتِ رسول شادی کے گھر میں تشریف لاتی ہیں تو کافر اور دشمن سب محوِ حیرت ہو کر رہ جاتے ہیں :۔

دیکھا جو فاطمہ کی یہ آمد کا بندوبست
اٹھ کر خدا خدا لگے کرنے وہ بت پرست

سب پر اس قدر رعب طاری ہو جاتا ہے کہ منہ سے بات نہیں نکلتی۔ دلھن کی ماں

فاطمہؑ کی خاطر و مدارات میں بچھی جاتی ہے اور اس احسان کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ آپ اس کے یہاں تشریف لائیں اور کھانے پینے کا سامان پیش کرتی ہے تو فاطمہؑ کہتی ہیں:۔

شربت کی احتیاج نہ ہے خواہشِ طعام
عادت گرسنگی کی ہمیں رہتی ہے مدام

بنتِ رسول اپنے اس فقر و فاقے کو باعثِ شرم نہیں باعثِ فخر سمجھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم ؎

دانستہ آپ فقر کی ایذا اٹھاتے ہیں
دو روز فاقہ کرتے ہیں اک روز کھاتے ہیں

اور ساتھ ہی ان کو دینِ حق کی تبلیغ فرماتی ہیں دو شعر اس کے بھی سُن لیجیے ؎

منظور تم کو ہووے جو خوشنودیِ خدا تو دل سے تم قبول کرو دینِ مصطفےٰؐ
تاخیر اس میں بد ہے کہ جو کام نیک ہے
ہاں چاہیے وہ کام کہ انجام نیک ہے

فاطمہؑ کی شان و رعب، دبدبہ و وقار، شخصیت و سیرت کو دیکھ کر وہ عورتیں پہلے ہی مسحور ہو چکی تھیں۔ یہ درسِ ہدایت سیدھا ان کے دل تک پہنچتا ہے اور وہ کلمہ پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہو جاتی ہیں ؎

ایماں کا نشہ چڑھنے لگا جھومنے لگیں
جھک جھک کے فاطمہ کے قدم چومنے لگیں

جنابِ رسالت مآب کو جہاں بیٹی سے بے حد محبت تھی وہاں اپنے دونوں نواسوں حسنؑ اور حسینؑ کو بھی بہت چاہتے تھے۔ متعدد صحیح روایتیں اور حدیثیں اس سلسلے میں موجود ہیں کہ آپ ان بچوں، خاص طور پر حسین پر حد سے زیادہ شفقت فرماتے تھے: "حسین منی وانا من الحسین" آپ کی مشہور حدیث ہے۔ میر انیس نے آنحضرت کی

اس محبت و شفقت کی بہت سی روایتیں مرثیوں میں بیان کی ہیں۔ ان میں ایک روایت یہ ہے کہ ایک بار جب آنحضرت مسجد میں تشریف فرما تھے۔ دونوں کم سن نواسے آئے اور نانا کی گود میں چڑھ گئے۔ اس وقت رسولِ خدا نے حسنؑ کے لب اور حسینؑ کا گلا چوما۔ اس روایت کو انیسؔ نے بڑی تفصیل سے اور بڑے ہی پراثر انداز میں نظم کیا ہے جس میں بچوں کی نفسیات، ماں کے جذبات، حفظِ مراتب وغیرہ اس خوبی سے دکھایا ہے کہ سبحان اللہ! کہیں کہیں سے چند شعر پابند دیکھیے:

دوڑے یہ بات سن کے برابر وہ خوش سیر پاس آئے آفتابِ رسالت کے دو قمر
لپٹے حسین ہنس کے اِدھر اور حسن اُدھر تھے پاؤں زانوؤں پر تو تھے ہاتھ دوش پر
نانا کے ساتھ پیار میں دونوں کا ساتھ تھا
گردن میں ایک اِن کا اور اک اُن کا ہاتھ تھا

پھر پھر کے دیکھتے تھے شہنشاہِ مشرقین گہ جانبِ حسن تو گہ جانبِ حسین
بیٹھے جو زانوؤں پہ وہ زہرا کے نورِ عین تھا تن کو لطف، جسم کو طاقت، جگر کو چین
جھک جھک کے منہ رسولِ زمن چومنے لگے
ان کا گلا تو ان کا دہن چومنے لگے

معصوم بچے کا ایسے موقع پر ایک دوسرے کو یہ جتانا کہ دیکھو نانا ہمیں تم سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اور دوسرے کا کھسیانا اور دل برداشتہ ہونا بڑی فطری بات ہے۔

شبیر چاہتے تھے کہ چومیں مرے بھی لب پر کچھ گلے کے بوسوں کا کھلتا نہ تھا سبب
نانا کے منہ کے پاس یہ لاتے تھے منہ کو جب جھک جھک کے چومتے تھے گلا سیدِ عرب
بھائی کو دیکھ کر جو حسن مسکراتے تھے
غیرت سے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے

اور پھر جب برداشت نہیں ہو سکتا تو

اٹھے حسین زانوئے احمدؐ سے خشمگیں
غصے سے رنگ زرد تھا آنکھوں پہ آستیں
رخ پر پسینہ جسم میں رعشہ جبیں پہ چیں
پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں
گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے

یہ شاعری نہیں مصوری ہے۔ شاعر کے ساتھ ساتھ ہم بھی اپنی آنکھوں سے ایک ناز پرورد لاڈلے بچے کے پیار بھرے غصے کا یہ منظر دیکھنے لگتے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ روتے بچے کو دیکھ کر ماں کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ فاطمہ زہرا بھی ماں ہیں ان کے دل کی حالت میں آپ کسی بھی چاہنے والی ماں کے جذبات کا عکس پا سکتے ہیں ؎

دوڑیں یہ کہہ کے فاطمہ زہرا جگر فگار
ہے ہے حسین کیا ہوا تو کیوں ہے اشکبار

بہت پوچھنے پر بھی جب بچہ کچھ نہیں بتا سکتا اور روتا رہتا ہے تو سمجھتی ہیں، دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہوا ہے ؎

گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو
سمجھی میں کچھ حسن سے خفا ہو کے آئے ہو
تم چپ رہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر کے آئیں
گذری ہیں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رلائیں
ان سے نہ بولیو وہ تمہیں لاکھ گر منائیں
لو آؤ جانے دو تمہیں چھاتی سے ہم لگائیں
واری اگر حسن نے رلایا برا کیا
پوچھوں گی کیا نہ میں مرے بچے نے کیا کیا

ظاہر ہے ماں دونوں بچوں کو برابر چاہتی ہے۔ لیکن حسین چھوٹا ہے خفا ہو کر آیا ہے رو رہا ہے لہذا اس کی دلداری ضروری ہے۔ کس خوبی، کس حکمت، کس پیار سے منایا جا رہا ہے مگر صاف جھلک رہا ہے کہ حسن سے یہ خفگی اوپری ہے لیکن جب ؎

بولے حسین ہم تو ہیں اس بات پر خفا
نانا نے چومے بھائی کے لب اور مرا گلا

تم اماں جان منہ کو تو سونگھو مرے ذرا کچھ بوئے ناگوار ہے میرے دہن میں کیا

تب ماں سمجھتی ہیں کہ خفگی بھائی سے نہیں پیارے نانا سے ہے تو دلداری کرتی اور سمجھاتی ہیں ؎

منہ رکھ کے منہ پہ بولی یہ زہرا جگر نگار بوئے گلاب آتی ہے لے میرے گلعذار

چوما اگر گلا تو خفا ہو نہ میں نثار تم کو زباں چوساتے تھے محبوب کردگار

یہ مشک میں مہک نہ گل و یاسمن میں ہے
خوشبو اسی دہن کی تمھارے دہن میں ہے

لیکن بچہ مچلا ہوا ہے ؎

رو رو کے آج جان ہم اپنی گنوائیں گے پانی نہ اب پییں گے نہ کھانا ہی کھائیں گے

ماں یہ سن کر بے تاب ہو جاتی ہیں۔ اور بچے کو گود میں لے کر مسجد نبوی میں جاتی ہیں تو آمدِ زہرا کی خبر سن کر ؎

احمد کے گرد و پیش سے اٹھے خدا پرست انسان کو کیا ملک کو نہ تھی قدرتِ نشست

آئیں تو شاد شاد رسولِ زمن ہوئے
گھر میں خدا کے ایک جگہ پنجتن ہوئے

تعظیم[1] فاطمہ کو اٹھے سید البشر دیکھا کہ چشمِ فاطمہ ہے آنسوؤں سے تر

خم تھے حسین دوش پہ ماں کے جھکائے سر تھا اک ہلال مہر کے پہلو میں جلوہ گر

ماں کہتی تھی نہ روؤ مگر چپ نہ ہوتے تھے
آنکھیں تھیں بند ہچکیاں لے لے کے روتے تھے

دوسرے، تیسرے، چوتھے مصرعہ میں روتے بچے اور ماں کی حالت کی کیسی عکاسی ہے۔ چوتھے مصرعے کا شاعرانہ حسن اور تشبیہہ کا کمال دیکھیے۔ یہ دیکھ کر سید البشر گھبرا گئے۔

[1] حدیث ہے کہ رسولِ خدا بیٹی کی تعظیم کو اٹھا کرتے تھے۔

گھبرا کے پوچھنے لگے محبوبِ ذوالجلال ۔۔۔ روتا ہے کیوں حسین کہ آنکھیں ہیں دونوں لال

اب فاطمہ زہرا والدِ محترم کو جو جواب دیتی ہیں۔ اس میں شاعر کے قدرتِ بیان کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کا کمال ملاحظہ کیجیے۔ باپ کا احترام بھی ہے، ناز بھری شکایت بھی کی جا رہی ہے۔ ماں کی ماتا اور عورت کی اس کمزوری کا اظہار بھی کہ بچے کو روتا دیکھ کر وہ اور سب کچھ بھول جاتی ہے ۔

بولیں بتول آج قلق ہے مجھے کمال
رویا ہے یہ حسین کہ آنکھیں ہیں دونوں لال

شکایت کا انداز کتنا پیارا ہے ۔

آتے ہیں ہنستے روتے ہوئے گھر میں جاتے ہیں
شفقت بھی آپ کرتے ہیں آپ ہی رلاتے ہیں

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہِ بحر و بر ۔۔۔ شفقت کی اس کے حال پہ ہر دم رہے نظر
رونے سے اس کے ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر ۔۔۔ مجھ فاقہ کش غریب کا پیارا ہے یہ پسر

حیدر سے پوچھیے مری عسرت کے حال کو
کس کس دکھوں سے پالا ہے اس نونہال کو

پیغمبرِ اسلام مسلمانوں کی بہت عظیم شخصیت اور محترم ہستی ہیں اور سب سے زیادہ خود فاطمہؑ کے لیے۔ مگر وہ اِن کے چاہنے والے باپ بھی ہیں۔ اور ایک بیٹی کو چاہے وہ پیغمبر ہی کی بیٹی کیوں نہ ہو باپ سے شکایت کرنے، ناز کرنے کا حق بہر حال حاصل ہوتا ہے۔ انیس اس نکتے کو جانتے ہیں۔ اب اپنی شکایت کی وضاحت کرتی ہیں ۔

شفقت سے آج آپ نے چومے حسن کے لب ۔۔۔ بوسہ لیا نہ ان کے لبوں کا یہ کیا سبب
رتبے میں دونوں ایک ہیں یا سرورِ عرب ۔۔۔ میں سچ کہوں یہ سن کے مجھے بھی ہوا عجب

اس کو ہو جو خوشی تو دل اس کا بھی شاد ہو
چھوٹے سے چاہیے کہ محبت زیاد ہو

اور شکایت کرتے کرتے ایک دم احساس ہوتا ہے کہ ماما کے جوش میں کوئی بے ادبی نہ سرزد ہو جائے تو بے اختیار معذرت کا انداز پیدا ہو جاتا ہے ؎

آپ ان کے ناز اٹھاتے ہیں یا شاہ بحر و بر
پھر کس سے روٹھیں آپ سے روٹھیں نہ یہ اگر
اکثر انھیں چڑھایا ہے حضرت نے دوش پر
گیسو دیئے ہیں ننھے سے ہاتھوں میں بیشتر
روٹھے تھے یہ سو قدموں پہ سر رکھنے آئے ہیں
منہ کے نہ چومنے کا گلہ کرنے آئے ہیں

پھر بیٹے سے کہتی ہیں ؎

لو جا کے اب نبی کے قدم پر جھکا دُ سر

لیکن فاطمہ کیا دیکھتی ہیں کہ ان کی بات سن کر آنحضرت نواسے کو لپٹا کر بے اختیار رو رہے ہیں۔ پیغمبر کی بیٹی سمجھ جاتی ہیں کہ یہ رونا بے سبب نہیں ہو سکتا ؎

جلدی بتائیے کہ مجھے تاب اب نہیں
رونا خدا کے دوست کا یہ بے سبب نہیں

بے قرار ہو کر پوچھتی ہیں ؎

کیا آئی آج وحیِ خداوندِ دو جہاں
ہونا ہے جو حسین پہ مجھ سے کر دو عیاں
فاقوں سے کاٹتی ہوں مصیبت جہان کی
کیوں بابا جان خیر تو ہے اس کی جان کی

مخبرِ صادق جواب میں بیٹی کو اس کے دونوں لاڈلوں کی شہادت کی خبر سناتے ہیں ؎

زہرا شہید ہوئیں گے یہ تیرے دونوں لال

حسن کی شہادت تفصیل یوں بیان کرتے ہیں ؎

الماس پی کے ہوئے گا بے جاں ترا حسن
یہ وجہ ہے کہ چومتا ہوں اس کا میں دہن

حسین کی شہادت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آنحضرت بیقرار ہو جاتے ہیں ؎

زہرا مجھے کلام کی طاقت نہیں ہے اب — حلقِ حسین چومنے کا کیا کہوں سبب
اک بن میں تین روز رہے گا یہ تشنہ لب — کٹ جائے گا گلا یہی خنجر سے ہے غضب
نیزے پہ سر چڑھے گا ترے نورِ عین کا
گھوڑوں سے روند ڈالیں گے لاشہ حسین کا

ماں پر اپنے بچوں کی اس ظلم و ستم کے ساتھ مارے جانے کی خبر سن کر قدرتی طور پر یہی رد عمل ہونا چاہیے تھا ؎

فریاد یا نبی شہِ ابرار الغیاث — اے مرسلانِ حق کے مددگار الغیاث
قدرت ہے سب طرح کی شہِ مشرقین کو
حضرت سے لوں گی اپنے حسن اور حسین کو

اور پھر التجا کرتی ہیں :-

کیجیے دعا کہ خالقِ اکبر مدد کرے — اللہ یہ بلا مرے بچے کی رد کرے

یہ سن کر ؎

بیٹی سے رو کے کہنے لگے شاہِ کائنات — روح الامیں نے مجھ سے تو یہ بھی کہی ہے بات
چاہو تو رد کرے یہ بلا ربِ پاک ذات — لیکن نہ ہوئے گی مری امت کی پھر نجات
محبوب حق نثار ترے نورِ عین پر
موقوف ہے یہ امر تو قتلِ حسین پر

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جس طرح عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق ان کی نجات حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے پر منحصر تھی کیا اسی طرح امتِ محمدی کی نجات کے لیے

شہادتِ حسینؑ کا عقیدہ بنالیا گیا۔ لیکن اگرچہ بار بار مرثیوں وغیرہ میں اس کا ذکر آتا ہے کہ امت کی نجات امام حسین کی شہادت پر منحصر ہے۔ مگر مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ یزید کے اعلانِ خلافت کے بعد اگر حسینؑ نے جان کی بازی نہ لگائی ہوتی اور اسلام کو مسخ ہونے سے نہ بچاتے تو اس دینِ برحق کی فطرت دوست نما دشمنوں نے اس طرح بدل دی ہوتی کہ اسلام اسلام نہ رہتا۔ اس کی سچی تعلیم باقی ہی نہ رہتی۔ اور ظاہر ہے کہ پھر امتِ محمدی یا مسلمانوں کی نجات کا کیا سوال تھا؟ بہر حال یہ تو ایک جملۂ معترضہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے تھا۔ دکھانا یہ ہے کہ فاطمہؑ جیسی عاشق ماں جب یہ سنتی ہے کہ اسلام کی سلامتی کے لیے اس کے لاڈلوں کی شہادت ناگزیر ہے تو وہ سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے اور یہیں ان کے کردار کی عظمت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ایک طرف بیٹوں سے وہ عشق اور دوسری طرف حق کی یہ محبت اس قلب صافی میں جاگزیں ہے ؎

اللہ رے صبر دخترِ محبوبِ کردگار

امت کا نام سن کے جھکایا سر ایک بار

اور یہ دیکھ کر ان کے راز داں شوہر بیوی کی ترجمانی لفظوں میں یوں کرتے ہیں ؎
"صدقے حسنؑ حسینؑ تصدق، علیؑ نثار"

اس راہ میں نہ مال نہ دولت عزیز ہے

پیارے پسر نہیں ہمیں امت عزیز ہے

اس طرح فاطمہؑ کی سیرت کے دو رخ ہمارے سامنے اجاگر ہو کر آتے ہیں۔

اپنے خالق کی اتھاہ محبت اور اطاعت کا جذبہ اور اپنے عزیزوں سے گہری محبت، انھیں اپنے بیٹوں سے والہانہ محبت ہے۔ اور اپنے والدِ محترم محمد مصطفٰےؐ سے ان کی محبت اور عقیدت نے مل کر وہ مقام حاصل کر لیا ہے جہاں محبت عشق کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اس محبت میں پروانے کا سا سوز و ساز ہے۔ جب پیغمبرِ اسلام اس

دارِ فانی سے رحلت فرماتے ہیں تو اگرچہ سارا عالمِ اسلامی سوگوار ہے، نواسے بیقرار، علیؑ مرتضیٰ رنج و غم سے نڈھال، مگر فاطمہؑ کا غم سب سے بڑھ کر ہے۔ صحیح روایات بتاتی ہیں کہ رسولِ اکرم کی وفات کے چند ماہ بعد ہی فاطمہ زہرا نے اس غم میں رو رو کر جان دے دی۔ یہ وہی غم تھا جو یعقوب کو یوسف کا ہوا تھا۔ غم جس میں عظمت ہوتی ہے۔ انیسؔ نے فاطمہ زہرا کی حالت کی باپ کی جدائی کے بعد یوں مرقع کشی کی ہے ؎

سوزش جگر میں ہوش پراگندہ رنگ زرد　　سینے میں دردِ غم، تو بدن زار، رنگ زرد
پوشاک میلی، بال پریشان، رخ پہ گرد　　تن میں کبھی بخار، کبھی ہاتھ پاؤں سرد
بند آنکھیں، دل میں یادِ رسالت پناہ کی
تکیے سے سر کبھی جو اٹھایا تو آہ کی

دردِ جدائی کی ماری بیٹی کی کیسی سچی تصویر ہے ؎

چہرے پہ آنسو بہتے تھے آنکھیں تھیں دونوں لال　　رغبت نہ کھانے پر تھی نہ پانی کا تھا خیال
بکھرے زمیں پہ غش میں پڑی رہتی تھیں نڈھال　　کرتہ سیاہ بر میں پریشان سر کے بال
نے فرش سے غرض تھی نہ بستر سے کام تھا
گر کام تھا تو ذکرِ پیمبر سے کام تھا

اس غم میں وہ اپنے آپ کو بھی بھول گئی تھیں ؎

گر بات کی تو شفقتِ خیر الوریٰ کی بات　　فریاد کی کبھی، کبھی چھاتی پہ مارا ہاتھ
زہرا جیسے جہاں میں، پیمبر کی ہو وفات　　غم تھا یہی کہ سر پہ نہیں شاہِ کائنات

فاطمہ زہرا کی حالت گرتی گئی۔ بیماری اور غمِ جدائی دونوں نے مل کر نوجوان سیدہ کو لبِ گور پہنچا دیا۔ حالت یہ ہو گئی کہ گھر کا کام کاج تک جس سے کبھی غفلت نہ برتی تھی پس پشت پڑ گیا۔ یا باپ کو روتی رہتیں یا عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتیں۔ شوہر

اور بچے ان کا حال دیکھ کر پریشان تھے لیکن ایک دن علی مرتضیٰ نے دیکھا کہ سیدہ گھر کا کام بہت سرگرمی اور شوق سے کر رہی ہیں ؎

دیکھا خمیر کرتی ہے آرد وہ خوش سیر — مٹی بھی کچھ بھگوئی ہے تشویش ہے مگر

اور ؎

سامان سب درست ہیں بچوں کے چین کے
بے قصد کرتے دھوئیں حسن اور حسین کے

حضرت علی کچھ خوش کچھ حیران ہو کر استفسار کرتے ہیں کہ آج تمہاری طبیعت بحال معلوم ہوتی ہے جو تم گھر کا اتنا کام کر رہی ہو۔ جواب میں فاطمہؑ کہتی ہیں آج رات میں نے بابا کو خواب میں دیکھا جنھوں نے مجھے کل ملاقات کی بشارت دی ہے ؎

سو اب خمیر کرتی ہوں آرد میں خستہ تن — تا بھوک سے نہ کچھ مرے بچوں کو ہو محن
مٹی بھگوئی دھونے کو سر نورِ عین کے
گیسو ہیں پُر غبار حسن اور حسین کے

شوہر کو بے قرار و پریشان دیکھتی ہیں۔ خود بھی بہ تقاضائے بشری پیاروں سے چھٹنے کا صدمہ ہے مگر اتنی ہی خوشی بچھڑے باپ سے ملنے کی ہے۔ شوہر سے وقتِ رخصت اپنی کوتاہیوں کی معافی چاہنا ایک چاہنے والی بیوی کی فطرت کے عین مطابق ہے ؎

اے شیرِ حق بتول کی رخصت کا وقت ہے — دن وصل کے گذر گئے فرقت کا وقت ہے
بے صبر میرے ہجر میں حضرت کو کبریا
خدمت کا حق جو تھا نہ ہوا مجھ سے کچھ ادا
سہواً بھی فاطمہ سے ہوا ہو اگر قصور — فرمائیے گا عفو اسے اے کبریا کے نور

یہ سن کر ؎

بولے علی لگا کے یہ چھاتی سے اس کا سر — یہ کیا کلام کرتی ہو زہرائے نامور

مجھ کو ہمیشہ شاد رکھا اے نکو سیر فاقوں میں صبر و شکر سے اوقات کی بسر
میں جس سے شاد ہوں وہی تم نے سدا کیا
فاقے کیے مگر نہ زباں سے گلا کیا

مثالی بیوی کا اس سے مکمل نمونہ اور کہاں ملے گا ؟ ماں کا دل اپنے خالق کے حضور جاتے ہوئے بھی بچوں کی محبت سے بے چین ہے ؎

شفقت ہمیشہ کیجیو بچوں پہ میں نثار میرے حسن حسین کو غم ہو نہ زینہار
دائم مری طرح سے انھیں پیار کیجیو کچھ ہو قصور گر تو اسے بخش دیجیو

یہاں فاطمہ زہرا خاص عرب عورت کی طرح شوہر کو ابن عم کہہ کر خطاب کرتی ہیں. اے جی ... یا اے ... کہہ کر نہیں ؎

بولیں بتول اے پسرِ عمِ نامدار
ہے دوسری یہ عرضِ بتولِ جگر فگار

اس طرح وصیتیں کرتے کرتے عورت کا دل بیتاب ہو جاتا ہے کہ عمر بھر کے رفیق سے جدائی ہو رہی ہے ؎

دل سے بھلائیو نہ مجھے تم پہ میں فدا تربت پہ آیا کیجیو زہرا کی تم سدا
گذرے ہیں اتنے روز جو اس اتفاق سے
صدمہ ہے فاطمہ پہ تمہارے فراق سے

شوہر صدمے کو ضبط کر کے کہتے ہیں کہ :

شرمندہ تم سے ہوں کہ نہ کچھ مجھ سے ہو سکا
اظہار حال سینۂ سوزاں ضرور ہے فرمائو تم بھی عفو جو میرا قصور ہے

شوہر سے دل کی باتیں کرنے کے بعد سیدۃ النساء آخری سفر کی تیاری کرتی ہیں ؎

طاہر تھا جو لباس وہ پہنا بصد وقار
حیدر سے سعی بیٹوں کی فرمائی چند بار
منہ خلد میں رسول بھی اشکوں سے دھوتے تھے
زہرا بھی روتی جاتی تھیں حیدر بھی روتے تھے

شوہر اور بیٹوں کو مسجدِ نبوی میں نماز کے لیے بھیج دیتی ہیں اور خود اپنے حجرے کا دروازہ بند کر کے خالقِ حقیقی سے یوں راز و نیاز ہونے لگتے ہیں ۔

اے خالقِ زمین و زماں ربِ بے نیاز
میں ہوں تری کنیز تو عالم کا کارساز
مقبول یہ دعا مری اس آن کیجیو
مشکل فشار قبر کی آسان کیجیو

وقت آخر بھی ہادیِ دارین کی بیٹی باپ کی امت کو نہیں بھولتی۔ خدا سے دعا کرتے وقت انسان بزرگ ہستیوں کا واسطہ دیتا ہے۔ مگر یہ بزرگ ترین ہستیاں تو خود فاطمہؑ کی اپنی ہیں۔ شاعر دیکھیے کس انداز سے اس مرحلے سے گذرتا ہے ۔

بیٹی ترے رسول کی ہوں میں جگر فگار
زوجہ ہوں اس کی بخشی جسے تو نے ذوالفقار
فرزند وہ دیئے کہ کیا جن کو تو نے پیار
سب کچھ دیا تو دے مجھے اتنا بھی اختیار
محشر میں اٹھ کے قبر سے جب جائے فاطمہ
چاہے جسے بہشت میں لے جائے فاطمہ

اور پھر جب محسوس کیا کہ جان جان آفریں کے سپرد کرنے کا وقت آ پہنچا تو ۔

بستر پہ قبلہ رو ہوئی وہ صاحبِ کرم
اور دونوں ہاتھ اٹھا کے کہا یہ بہ دردِ وغم
یارب بحقِ حضرتِ احمدؐ شہِ امم
یارب بحق حیدرِ کرار باحشم
اس دم دعا قبول ہو مجھ دل ملول کی
اپنے کرم سے بخش دے امتِ رسول کی

انیس کا یہ مرثیہ (جس میں سے زیادہ تر اقتباسات ہم نے دیئے ہیں) غالباً ابتدائی دور کا ہے۔ اس لیے کہ اس میں زبان اتنی زیادہ منجھی ہوئی، روزمرّہ اور محاورہ اتنا رچا ہوا نہیں جو ان کے بہت سے دوسرے مرثیوں کی خصوصیت ہے لیکن جہاں تک سیرت نگاری اور جذبات کی عکاسی کا تعلق ہے، اس میں انیس پوری طرح کامیاب ہیں۔

اُمُّ البنین اور زوجۂ عبّاس

دنیا میں سوتیلے رشتے بہت بدنام ہیں۔ اور ہندوستان تو اس معاملے میں سب سے آگے ہے۔ یہاں تک کہ سوت اور سوتیلے کا نام آجانا ہی دشمنی کا ضامن ہو جاتا ہے۔ اس معاملے میں غلو اور تعصب اتنا بڑھا ہوا ہے کہ سوتیلی ماں بچوں کے لیے جان بھی دے دے تو دنیا اسے مکروفریب ہی سمجھتی ہے۔ اور سوتیلے بچے کتنی ہی محبت کریں ماں اور اس کے رشتے دار ان کے خلوص پر یقین نہیں کرتے۔ ادب اور شاعری میں بھی مستثنیات کو چھوڑ کر یہی صورت کارفرما نظر آتی ہے۔ اس قسم کی باتوں کا جو اثر اور ردِّ عمل انسانی فطرت پر پڑتا یا پڑسکتا ہے اس کی طرف شاید ہی کسی کا دھیان جاتا ہو لیکن واقعۂ کربلا کی تاریخ شاہد ہے کہ یہاں حسینؑ کے سگے اور سوتیلے سبھی رشتہ داروں نے یکساں محبت خلوص اور جاں نثاری دکھائی۔ سگی بہن زینب اور سوتیلے بھائی عباس کے کردار میں ذرا بھی فرق نظر نہیں آتا بلکہ کہیں کہیں تو عباس کی جاں نثاری اور جاں فروشی زینب سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

میر انیس حضرت عباسؑ اُن کی والدہ اور بیوی کے کردار سے بہت متاثر ہیں۔ انھوں نے ان سوتیلے رشتہ داروں کی محبت، جاں نثاری، خلوص اور وفا کو بڑی خوبی

اور کمال کے ساتھ دکھایا ہے۔ امام حسینؑ کی سوتیلی ماں ام البنین کا کردار جہاں بھی سامنے آتا ہے دل کو متاثر کرتا ہے۔ ———— وہ عالی ہمت خاتون ہیں۔ خاندانِ رسول سے گہری محبت اور عقیدت رکھتی ہیں جس کا اثر قدرتی طور پر ان کے بیٹوں پر پڑا ہے۔ اس باب میں ہم عباس کی والدہ ام البنین اور ان کی بیوی کا کردار انیسؔ کے کلام کی روشنی میں دکھائیں گے۔

واقعۂ کربلا میں ام البنین کے چار بیٹوں نے شہادت پائی، جن میں سب سے بڑے حضرت عباس تھے جن کے بیوی بچے بھی ساتھ آئے تھے۔ حسینؑ کے ان جانباز بھائیوں کی سیرت میں شاعر ان کی ماں کی سیرت اور کردار کا جلوہ دیکھتا ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ بنتِ پیمبر سیدۃ النساء کے بعد جس عورت سے علی مرتضیٰ نے شادی کی اس کے لیے خاندان میں اپنی جگہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ تاریخی روایات میں جو ذرا سی جھلک ان کی نظر آتی ہے اس سے شاعر ان کی پوری شخصیت اور کردار کا اندازہ لگاتا اور اس سادہ سے خاکے میں بڑے دلکش اور شوخ رنگ بھرتا ہے۔ میر انیسؔ کا ایک مشہور مرثیہ ہے ؎

عباسِ علی شیرِ نیستانِ نجف ہے   تابندہ دُرِ تاجِ سلیمانِ نجف ہے
سروِ چمن و خضرِ بیابانِ نجف ہے   آئینہ روئے مہ کنعانِ نجف ہے

طفلی سے اسے عشقِ امامِ دوسرا تھا
شہ اس پہ فدا تھے، وہ شہِ دیں پہ فدا تھا

اس کو انھوں نے عباس ابن علیؑ کی پیدائش کے ذکر سے شروع کیا ہے اور ابتدا ہی میں والدۂ عباس کا ذکر یوں شروع ہوتا ہے ؎

جب خلد کو دنیا سے ہوئیں فاطمہ رہگیر   یاور تھی زبس مادرِ عباس کی تقدیر
جس روز سے آئی تھی یدُاللہ[1] کے گھر میں
رہتی تھی شب و روز تمنائے پسر میں

[1] حضرت علیؑ کا لقب۔

اگلے ہی بند میں جب وہ ان کا تعارف کراتے ہیں تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کوئی غیر معمولی صفات کی بی بی ہیں ۔ جسے فاطمہ زہرا[۴] سے بجائے رقابت کے عقیدت اور سوتیلے بچوں سے بجائے جلن کے گہری محبت ہے ۔ اور علی مرتضیٰ سے شادی کے بعد جو اہم ذمہ داری اس پر عاید ہوئی ہے ۔ اس کا پورا احساس ہے ۔ یہ بھی سمجھتی ہے کہ علی کے دل میں جگہ بنانے کا ایک ہی ذریعہ ہے ۔ یعنی ان کے بچوں سے پرخلوص محبت اور خدمت :۔

دعوائے کنیزی تھا اسے بنتِ نبی سے — تھا اُنس بہت آلِ رسولِ عربی سے
مطلب نہ تھا اپنی اسے حاجت طلبی سے — آگاہ تھی شبیر[۵] کی عالی نسبی سے
مصروف وہ فضہ سے بھی خدمت میں سوا تھی
سو جان سے فرزندوں پہ زہرا کے فدا تھی

حیدر سے کبھی پوچھتی تھی یا شہِ صفدر — دونوں میں بہت چاہتے تھے کس کو پیمبر
اس بی بی سے فرماتے تھے یوں فاتحِ خیبر — الفت تھی محمدؐ کو نواسوں سے برابر
یہ دونوں دل و جانِ رسولِ دوسرا تھے
صدقے کبھی اس پر تھے کبھی اس پہ فدا تھے

قدرتی طور پر ان کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ ان کے بھی کوئی بیٹا ہو جو دنیا میں کچھ کام کرے اور نام اور شہرت پائے مگر کس طرح ؟

جب مصحفِ ناطق سے سنی اس نے یہ تقریر — کی حق سے مناجات کہ اے مالکِ تقدیر
گر دے تو مجھے اک پسرِ صاحبِ توقیر — میں اس کو خوشی ہو کے کروں فدیۂ شبیر
ممتاز غلاموں میں جو ضرغام ہو میرا
زہرا کی کنیزوں میں بڑا نام ہو میرا

---

۵ امام حسینؑ کا لقب

اس کی مرادِ برآتی ہے اور نخلِ تمنا بارآور ہوتا ہے ۔

اللہ نے بخشا پسرِ نیک شمائل
دکھلائی جو تصویرِ پسر بختِ رسا نے
عباس علی نام رکھا شیرِ خدا نے

عباس کے بعد ان کے تین بیٹے اور ہوئے۔ چار بیٹوں کی ماں ہونے ہی کی وجہ سے ان کا لقب ام البنین پڑا تھا اور اس صاحبِ حوصلہ بی بی نے چاروں بیٹوں کی ایسی تربیت کی کہ دنیا کی تاریخ الفت و وفا میں ان کا نام امر ہو گیا۔

عباس اور ان کے بھائیوں نے میدانِ کربلا میں حق کی خاطر اور حسین کی محبت میں جس طرح جانیں فدا کیں اور وفاداری کے جو بے مثال کارنامے انجام دیے، انیس بتاتے ہیں کہ ان کی بنیاد ابتدا ہی سے ماں نے ڈالی تھی۔ کوئی اور ماں ہوتی تو سب سے بڑے بیٹے کی پیدائش کا جشن مناتی اور چاہے منہ سے نہ کہتی مگر دل میں یہ سوچتی کہ اب وہ بھی کسی سے گھٹ کر نہیں، خود بیٹے والی ہے مگر مادرِ عباس کا کردار ہی اور تھا ۔

شبیر کو عباس کی مادر نے بلایا
اور گود میں فرزند کو دے کر یہ سنایا
لو وارثِ و نادار غلام آپ کا آیا
نعلین اٹھانے کو تمھاری میرا جایا
آقا ہو شہنشاہ ہو سردار ہو اس کے
مالک ہو تمھیں اور تمھیں مختار ہو اس کے

یہاں مادرِ عباس کا یہ بیان ہندوستانی ہے ۔ ایک عرب عورت کے تاثرات میں صاف ہندوستانی تہذیب و ادب و آداب کی جھلک نظر آرہی ہے مگر شاعر کا مقصد سوتیلی ماں کی سوتیلے بیٹے سے محبت اور اس کا احترام دکھانا ہے جس میں وہ کامیاب ہے۔ ماں نے بچے کے دل میں سوتیلے بھائی بہنوں خاص کر حسینؑ کی محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ ایک دن ماں بچے کا امتحان لیتی ہے کہ دیکھیں میری تربیت اور تعلیم نے بچے

پر کہاں تک اثر ڈالا ہے ؎

جب سات برس کا ہوا وہ گیسوؤں والا
ماں نے کہا تم نے مری جاں ہوش سنبھالا
مانی تھی یہ نذر اور تھا اس واسطے پالا
اب تم کو کروں گی میں نثارِ شہ والا
حق الفتِ زہرا کا ادا کرتی ہوں بیٹا
جو عہد کیا اس کو وفا کرتی ہوں بیٹا

اب بیٹے کا جواب سنیئے ؎

خوش ہو کے یہ کی حضرتِ عباس نے تقریر
یہ عین تمنا ہے کہ ہوں فدیہ شبیر
حاضر ہوں کرو جلد فدا ہونے کی تدبیر
لازم نہیں اماں عملِ خیر میں تاخیر
گو عمر میں چھوٹا ہے گل اندام تمہارا
پر خلق میں ہوئے گا بڑا نام تمہارا

بظاہر یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ بے وجہ و بلا مقصد مادرِ عباس بیٹے کو زہرا کے پسر پر کیوں نثار کر رہی ہیں مگر یہاں انیس ہندوستانی تہذیب کے انداز میں عقیدت و جانثاری کا مظاہرہ کر کے ام البنین کے جذبۂ ایثار کی عکاسی کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ بیٹے کو علی مرتضیٰ کے پاس لے جا کر کہتی ہیں ؎

تھا دین ادا کرنے کا اس کا مرے سر پر
اب اس کو فدا کیجیے زہرا کے پسر پر

"زہرا کے پسر" کا ٹکڑا رکھ کر انیس نے یہ بات صاف کر دی کہ ام البنین کا یہ جذبہ کسی احساس کمتری پر مبنی نہیں اور نہ شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کا بہانہ ہے۔ بلکہ وہ فاطمہ زہرا کی عظمت کا اعتراف کرنا چاہتی ہیں۔ شوہر یہ سن کر بیٹے سے مخاطب ہوتے ہیں ؎

شبیر پہ ماں تجھ کو فدا کرتی ہے بیٹا
عباس بتا دے مجھے مرضی ہے تری کیا؟

تو عباس جواب دیتے ہیں ؎

میں عاشقِ فرزندِ رسولِ دوسرا ہوں
سو بار جو زندہ ہوں تو سو بار فدا ہوں

حضرت علیؑ جو رسولِ اکرمؐ سے واقعات کربلا کی پیشین گوئی سن چکے ہیں۔ یہ سن کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں اور آنے والے واقعات کا منظر تصوّر میں گھوم جاتا ہے ؎

رد کر اسداللہ نے دیکھا رخِ شبیر جنگاہ کی آنکھوں کے تلے پھر گئی تصویر
پیاسوں کا خیال آگیا حالت ہوئی تغییر یاد آئی بھری مشک کلیجے پہ لگا تیر
طاقت نہ رہی ضبط کی احمدؐ کے وصی کو
نزدیک تھا صدمے سے غش آجائے علی کو

عباس کو لپٹا کے گلے کرنے لگے پیار چومے کبھی عباس کے بازو کبھی رخسار
فرماتے تھے تجھ سا نہیں دنیا میں وفادار صدقے ترے اے دلبرِ زہرا کے مددگار
ماتم ترا ہر تعزیہ خانے میں رہے گا
شہرہ تری الفت کا زمانے میں رہے گا

تاریخ اپنے ورق پلٹنے لگی۔ عباس اور ان کے بھائی جوان ہوئے۔ علیؑ مرتضیٰ نے شہادت پائی۔ امام حسنؑ کو بھی ظلم وستم کی طاقتوں نے چپکے سے زہر دلوا دیا اور روحانی قیادت امام حسینؑ کے حصے میں آئی۔ لیکن تختِ خلافت پر امیر معاویہ کا قبضہ رہا۔ امیر معاویہ کی وفات کے بعد یزید نے اپنے خلیفۂ رسول ہونے کا اعلان کیا اور امام حسینؑ سے بیعت طلب کی۔ حسینؑ کے انکار پر ان کے قتل کے درپے ہوا۔ حسینؑ نے مدینے میں عافیت نہ دیکھی تو حج کا عزم کیا اور وہاں سے کوفے جانے کا ارادہ، جہاں سے خط پر خط آ رہے تھے کہ آپ آئیے اور ہماری قیادت فرمائیے۔ امام حسینؑ کی مدینے سے روانگی سے متعلق انیس کے کئی مرثیے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ ان میں مادرِ عباس کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن جب

کربلا میں امام حسینؑ مع اپنے عزیز و احباب کے شہادت پا جاتے ہیں اور سال بھر کے قید و بند اور مصائب اٹھانے کے بعد اہلِ حرم کا لٹا قافلہ مدینے واپس آتا ہے۔ اس وقت کے مرثیوں میں ام البنین کا تذکرہ پھر ملتا ہے۔

اہلِ حرم حسینؑ اور سارے خاندان کو کھو کر آئے ہیں۔ سارا مدینہ گریہ و ماتم سے گونج رہا ہے۔ صغرا باپ کی جدائی میں خون رو رہی ہیں۔ خواتینِ مدینہ سینہ کوبی کر رہی ہیں۔ بیاروں موئی، ماں بہنیں تڑپ رہی ہیں، مگر مادرِ عباس کا کیا حال ہے؟ کیا چار کڑیل جوان بیٹوں کی شہادت کی خبر ان کو بدحواس کرنے میں کامیاب ہوئی؟ نہیں۔ ان کو تو یہ فکر ہے کہ ان کے بیٹوں نے اپنے بھائی حسینؑ پر جان قربان کرنے میں کوئی کوتاہی یا دیر تو نہیں کی۔ سب سے زیادہ فکر ہے سب سے لاڈلے بیٹے عباس کی۔ کہیں اس کے لختِ جگر نے ان کی محبت اور وفا پر تو آنچ نہیں آنے دی۔ بیبیوں سے بیٹوں کے مرنے کا ذکر سن کر بے اختیاری کی حالت میں پوچھتی ہیں ؎

میں سن چکی، اتنا تو کہ مارا گیا عباس　　مرنا تو یقین ہو گیا لیکن ہے یہ وسواس
کس وقت تلک جنگ میں بھائی کے رہا پاس　　سچ کہہ دو جو کچھ گذری ہے توڑو نہ مری آس
کچھ قاسم و اکبر پر تو آفت نہیں دیکھی
شبیر کی خیمے سے تو رخصت نہیں دیکھی

ان کے لیے اتنا ہی کافی نہیں کہ بیٹا حسینؑ کے ساتھ مارا گیا بلکہ وہ یہ بھی چاہتی تھیں کہ جان یوں دی جائے کہ رہتی دنیا تک اس وفا و محبت کا نام رہ جائے۔ بیٹے سے رخصت کے وقت کی باتیں یاد آ رہی ہیں ؎

رخصت کو تھا وہ چلتے ہوئے جس گھڑی آیا　　حق دودھ کا بخشا تھا مجھے سے مرا جایا
میں نے اسے یہ کہہ کے تھا چھاتی سے لگایا　　شبیر کے قدموں پہ جو سر تو نے کٹایا
تو دودھ بھی بخشوں گی دعا بھی تجھے دوں گی
جان اپنی بچائی تو کبھی نام نہ لوں گی

آخری شعر میں ایک بہادر عرب عورت کی شجاعت کس انداز میں بول رہی ہے۔

اُمِ کلثوم امام حسینؑ کی چھوٹی بہن جو عباس کو بہت چاہتی تھیں۔ سوتیلی ماں کو ان کے بیٹوں کی جانثاری اور بہادری کے کارنامے سناتی ہیں اور کہتی ہیں:۔

اس خوبی سے مارا گیا فرزند تمھارا　　دو دھ اس کو نہ بخشا ہو تو اب بخشو خدارا
پھر فاطمہؑ زہرا کا وہ کیوں کر نہ ہو پیارا　　واللہ سر اس نے قدمِ شاہ پر وارا
دکھلائی وہ جانبازی شہ تشنہ دہن کو
راضی کیا حیدرؑ کو، محمدؐ کو، حسنؑ کو

یہ سن کر مادرِ عباس بیٹوں پر ماتم کرنے کی جگہ جو عین فطرت انسانی کے مطابق ہوتا سجدۂ شکر بجا لاتی ہیں کہ ان کے لیے بیٹوں کا کارنامہ باعثِ فخر و مسرت ہے ؎

یہ سنتے ہی بس مادرِ عباسِ دلاور　　قبلے کی طرف گر پڑی سجدے کو زمیں پر
اور دردِ جدائی کی ٹیس دل کے دل ہی میں دفن کرکے یہ باہمت بی بی ؎
جب کر چکی سجدہ تو وہ کہنے لگی رو کر　　سب مل کے کرو ماتمِ فرزندِ پیمبر
یہ جو کہا غل ہونے لگا سینہ زنی کا
اور ذکر تھا شبیر کی تشنہ دہنی کا

ام البنین، والدہ حضرت عباس کی جھلک اگرچہ مرثیوں میں کہیں کہیں نظر آتی ہے مگر اس کے باوجود انیسؔ نے ان کی کردار نگاری اس خوبی سے کی ہے کہ وہ ایک مثالی ماں ہی نہیں، مثالی عورت کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہیں جس کے دل میں اتنی وسعت ہے کہ وہ سوتیلے بچوں پر اپنی سگی اولاد کو خوشی سے قربان کر دے اور ایمان و عقیدے کے بل پر دنیا کا سب سے بڑا غم، غمِ اولاد اس پامردی سے جھیل جائے۔

ان سوتیلے رشتوں میں دوسرا اہم اور بڑا ہی دلکش و حسین کردار ان ہی

ام البنین کی بہو حضرت عباس کی بیوی کا ہے، جن کا نام بعض روایات میں ذکیہ بیان کیا جاتا ہے مگر انیسؔ نے ان کا تذکرہ زوجۂ عباس یا عباس کی بیوی کہہ کر کیا ہے۔

عباس واقعہ کربلا کے وہ محبوب ہیرو ہیں جن کی محبت و وفا، بہادری وجانبازی کی داستان تیرہ صدیوں سے دہرائی جارہی ہے۔ انیس کو حضرتِ عباس سے محض عقیدت ہی نہیں بے حد محبت بھی ہے۔ وہ جہاں بھی ان کا ذکر کرتے ہیں (اور کہاں نہیں کرتے) اس طرح کہ پڑھنے والا اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جو مرثیے انھوں نے خاص طور پر ان سے متعلق کہے ہیں وہاں تو قلم توڑ دیا ہے۔ امام حسینؑ کے لاڈلے بھائی عباس ابنِ علی کی سیرت کی ایسی مرقع کشی کرتے ہیں کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ ان کی بیوی کا کردار بھی ان مرثیوں کا ایک اہم جزہے۔ اور ایسے شوہر کی سچی رفیقِ حیات کیسی ہونی چاہیے، یہ کوئی انیس کے یہاں دیکھے۔ اس کی فطری نیکی اور شرافت، اور پھر ایک ایسے شوہر کی رفاقت نے اس میں کچھ ایسے جوہر پیدا کر دیئے ہیں جو انسانیت کی جان اور نسوانیت کی آن ہیں۔ اسے اپنے شوہر اور اس کے خاندان پر فخر ہے حسینؑ سے گہری عقیدت اور ان کے بچوں سے دلی محبت ہے۔ بزرگوں کا احترام کرتی ہے۔ اور ساتھ ہی دل میں اس بلند مقصد کی لگن بھی ہے جس کے لیے قربانی دینے امام حسینؑ کربلا میں آئے۔ اور اس کا ثبوت وہ اپنے محبوب شوہر کو اس مقصد پر جان دینے کی رضا دے کر کرتی ہے۔ اصلیت اور مثالیت کے رنگ اس کردار میں اس حسن وتناسب کے ساتھ بھرے ہیں کہ وہ دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

انیسؔ کے کلام میں پہلی بار زوجۂ عباس کی جھلک اس وقت نظر آتی ہے، جب ۲ محرم کو امام حسینؑ کا قافلہ کربلا کے میدان میں پڑاؤ ڈالنے والا ہے اور عباس اس کا اہتمام کر رہے ہیں۔ یکایک شام کی فوجیں نمودار ہوتی ہیں اور انھیں نہر کے کنارے

خیمے نصب کرنے سے روکتی ہیں۔ بہادر عباس کو جلال آجاتا ہے وہ اوران کے ساتھی مقابلے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں لیکن امام حسینؑ ان کو روک دیتے ہیں اور بڑی مشکل سے انھیں سمجھا بجھاکر ہٹاتے اور صحرائے کربلا میں خیمے نصب کرنے پر آمادہ کرلیتے ہیں۔ بہنیں، بھاوجیں، ان کی سلامتی سے واپسی پر شکرادا کررہی ہیں۔رائے زنی ہورہی ہے کہ:۔

کہنے لگی یہ زوجۂ عباس خوش بیان　　غصے میں ان کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
ہر بات میں ہے شیر الٰہی کی آن بان　　یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان
آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں
یہ تو فقط حسین کے صدقے میں جیتے ہیں

"خوش بیان"، کہہ کر انیس پہلے ہی اس کردار کا تعارف کرادیتے ہیں کہ اور صفات کے ساتھ ساتھ اس میں عرب کی فصاحت بھی موجود ہے۔ اس کے بعد مصرعوں کی اٹھان دیکھیے" غصے میں ان کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان" مگر کیسا غصہ؟ جو حق کی خاطر آتا ہے۔ظلم و ناانصافی کے خلاف آتا ہے۔ اور پھر" ہر بات میں ہے شیر الٰہی کی آن بان" کس خوبی سے خسر اور شوہر پر فخر کا اظہار کرتی ہے اور آخر میں:

"یہ تو فقط حسینؑ کے صدقے میں جیتے ہیں"

اس لافانی محبت کی جو دونوں بھائیوں میں ہے۔ چند لفظوں میں بیان کرجاتی ہے۔

واقعات آگے بڑھتے ہیں۔ دشمن کی فوج کا دریا پر قبضہ ہوجاتا ہے۔حسینی فوج پر کھانا اور پانی لانے کے راستے بند کردیے جاتے ہیں۔عباس فوج کے سردار ہیں۔ اس لیے سب سے زیادہ فکرمند اور مصروف ہیں۔

یہاں تک کہ دس محرم کی قیامت خیز صبح نمودار ہوتی ہے۔ دشمن کی فوج میں طبلِ جنگ بجنے لگتا ہے۔امام حسینؑ کی فوج کے گنتی کے سوار بھی ہتھیار سج کر مقابلے کے

لیے تیار ہیں۔ اب خیمے میں امام حسینؑ کے حکم سے علم نکالا جاتا ہے وہی علم جو محمد مصطفیٰؐ کا علم تھا۔ جس کے پہلے علمبردار جعفر طیار تھے، جو اس علم کی حفاظت کرتے کرتے شہید ہوئے تھے۔ دوسرے علیؑ مرتضیٰ، جس پرچم کو بلند کر کے آپ نے بدر وحنین خندق وخیبر کی لڑائیاں سر کی تھیں۔ اس علم کا ملنا بہت بڑا اعزاز تھا اور ساتھ ہی بہت بڑی ذمہ داری بھی۔ آج حسینؑ یہ ذمہ داری کس کو سونپتے ہیں۔ ہر بہادر کے ذہن میں یہ سوال گردش کر رہا ہے۔ امام حسینؑ کے بھانجے عون اور محمد، علیؑ کے نواسے اور جعفر طیار کے پوتے ہیں اور بقول انیس کے سب سے بڑا حقدار اپنے کو سمجھتے ہیں۔ زوجۂ عباس کو تمنا ہے کہ یہ اعزاز ان کے شوہر کو نصیب ہو۔ علم نکلتا ہے عورتیں علم کو دیکھ کر رونے لگتی ہیں۔ آج اس علم کے زیر سایہ حق و باطل کی جنگ ہوگی کون زندہ رہے گا؟ کون شہادت پائے گا؟ یہ خدا ہی جانے۔ دیکھیے عورتوں کی آپس کی باتیں اور باتوں باتوں میں دل کی بات کہہ جانے کا کتنا خوبصورت اور قدرتی انداز ہے ؎

عباس کی زوجہ یہ بیاں کرتی تھی رو رو — کیوں صاحبو دیکھیں یہ علم ملتا ہے کس کو
زینب کے پسر عمر میں چھوٹے ہیں ابھی تو — ہم شکل نبی کے ہیں علی اکبرِ خوشخو
خادم شہ دیں کے ہیں تو عباس علی ہیں
اس عہدے کے لائق جو اگر ہیں تو وہی ہیں

ذرا دلیلوں پر غور کیجیے، زینب کے بیٹے کم سن ہیں۔ علی اکبر کا رتبہ تو بہت بلند ہے کہ ہمشکل رسول ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کو اتنی خطرے والی ذمہ داری نہیں ملنی چاہیے بس حسینؑ کے خادم عباس ہی تو رہ جاتے ہیں اور انھیں کو اصل ہیں، یہ عہدہ ملنا چاہیے۔

اور جب یہ خوشخبری ملتی ہے کہ علم کا عہدہ انھیں کے ذی مرتبت شوہر کو ملا ہے تو مسرت اور شکر گذاری کا جذبہ دیکھنے کے قابل ہے۔

مژدہ یہ سنا زوجۂ عباس نے جس دم　　منہ سرخ خوشی سے ہوا تشویش ہوئی کم
بولی کہ بڑی فکر تھی پر اب نہیں کچھ غم　　قربان تمھارے میں شہنشاہِ دو عالم
مخدومۂ کونین کے جانی کے تصدق
مولیٰ میں تری تشنہ دہانی کے تصدق

انکسار اور عاجزی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ مگر یہ چھپا ہوا احساس بات بات میں موجود ہے کہ دونوں کے رتبوں اور محبت سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اندازِ گفتگو میں عورتوں کے روزمرہ کا اس طرح خیال رکھا گیا ہے کہ صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ذکر کس کا ہو رہا ہے دیکھیے نمونہ ؎

"کیوں کر نہ ہو اس بھائی کو ہے گود میں پالا　　نعلین اٹھانے لگے جب ہوش سنبھالا
(انداز بتا دیتا ہے کہ نعلین اٹھانے والا چھوٹا بھائی ہے)
نام اپنا ہے خادم کا جو رتبہ ہوا بالا　　سب ملتے ہیں ملتا ہے کہاں چاہنے والا
توقیر جوان کی ہے تو نام شہ دیں ہے
جانیں گے یہی سب کہ غلام شہ دیں ہے"

لہجے کی روانی اور بیان کی فصاحت، دلیلوں کا زور اور پھر اس پر نسوانی اندازِ بیان ؎

کونین میں والی کو مرے کر دیا ممتاز　　عزت وہ نہ دیویں تو کرے کون سرافراز
ہے دلبرِ زہرا کی محبت پہ انھیں ناز　　وہ شمع ہدایت ہے یہ پروانۂ جاں باز
شمشیر کے شعلے سے نہ ٹل جائے گا عباس
آنچ آئے گی آقا پہ تو جل جائے گا عباس

مگر باتیں کرتے کرتے جیسے ایک دم خیال آیا کوئی یہ نہ سمجھے کہ خواہ مخواہ شوہر کی طرفداری یا بڑائی کی جا رہی ہے ؎

عباس سا دنیا میں نہ ہوئے گا وفادار
شوہر کی میں خاطر سے یہ کرتی نہیں گفتار

عباس کی وفاداری کی دلیل میں وہ بات منہ سے نکل جاتی ہے جس کو چھپانے کی شوہر نے تاکید کی تھی۔ روایت ہے کہ ام البنین کے قبیلے کے بعض لوگ یزید کی فوج میں موجود تھے، حضرت عباس کو بہکانے کی بہت کوشش کی۔ ان کو پیش کش کی کہ اگر وہ حسینؑ کا ساتھ چھوڑ دیں تو یزیدی لشکر کا سپہ سالار بنا دیں گے۔ عورت کی یہ کمزوری بھی شاعر کی نظر سے پوشیدہ نہیں کہ شوہر یا محبوب کی قربانی وایثار پر اسے خود تو خیر فخر ہوتا ہی ہے مگر دوسروں کو بھی جتلانا چاہتی ہے ؎

سالارئ لشکر کے پیام آئے کئی بار
بھڑکانے کے درپے ہی رہا شمرِ ستمگار

جھنجھلا کے وہ کہتے تھے کہ مرجانے کی جا ہے
تلوار کے بھی زخم سے یہ زخم سوا ہے

دنیا کے لیے چھوڑ دیں ہم دامنِ شبیر
منصب مرا مرجانا ہے اور خلد کی جاگیر

کیا قہر ہے کیوں کر نہ مجھے رنج وتعب ہو
سن لیویں کہیں قبلۂ عالم تو غضب ہو

اور جوش میں یہ بھول جاتی ہیں کہ جس بات کے چھپانے کی شوہر کو اس قدر فکر ہے وہ ان کے منہ سے سب کے سامنے نکل رہی ہے۔ گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی ؎

صاحب یہ دعا مانگو کہ اے کل کے مددگار
اس رات تلک مجھ سے یہی کہتے تھے ہر بار

عباس کو لشکر کا علم دیں شہِ ابرار
حسرت ہے کہ جب سامنے افواجِ ستم ہو
اس دوش پہ تلوار ہو اور اس پہ علم ہو

پھر خالص نسوانی انداز میں یہ کہنا "میں کہتی تھی کیوں شاہ سے کہتے نہیں مذکور" تو شوہر کے منہ سے عالی مرتبت بھائی کے درجے کا اقرار یوں کراتی ہیں :-

تھرّا کے وہ کہتے تھے یہ میرا نہیں مقدور
میں ذرّہ ہوں وہ مہر ہیں میں خاک ہوں وہ نور

اور پھر خوشی سے بے حال ہو کر کہہ اٹھتی ہیں ؎

ساماں تو خالق نے کیے سارے خوشی کے
پھولے نہ سما دیں گے وہ اب مارے خوشی کے

ایک اور مرثیے میں علم ملنے کے بعد زوجۂ عباس کے جذبات و کیفیت کو یوں بیان کیا ہے ؎

یہ سن کر آئی زوجۂ عباس نامور
شوہر کے سمت پہلے کنکھیوں سے کی نظر

لیں سبطِ مصطفےٰ کی بلائیں بچشمِ تر
زینب کے گرد پھر کے یہ بولی یہ نوحہ گر

فیض آپ کا ہے اور تصدّق امام کا
عزت بڑھی کنیز کی، رتبہ غلام کا

کنکھیوں سے میاں کو دیکھنا بلائیں لینا، گرد پھرنا، کنیز و غلام کہنا خالص شمالی ہند کی پرانی تہذیب کے اجزا ہیں مگر دیکھیے اس سے بیان کا زور کتنا بڑھا اور حالات کی مرقع کشی میں کتنی کشش پیدا ہو گئی ہے۔ بھاوج سے نند کا برتاؤ دیکھیے ؎

سر کو لگا کے چھاتی سے زینب نے یہ کہا
تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا

"مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے" ہندوستانی تہذیب میں اس سے بڑھ کر کوئی دعا ایک عورت دوسری عورت کو نہیں دے سکتی۔

زوجۂ عباس کا جذبۂ تشکر و مسرت سنبھالے نہیں سنبھل رہا۔ نند سے جو باتیں کرتی ہیں اس میں ساس کا ذکر بھی آتا ہے۔ وطن واپس جانے کی دعا بھی ہے اور علی اکبر کے بیاہ کی تمنا اور دعائیں بھی ؎

قسمت وطن میں خیر سے پھر سب کو لے کے جائے
یثرب میں شور ہو کہ سفر سے حسین آئے
ام البنین جاہ و حشم سے پسر کو پائے
جلدی شبِ عروسیِ اکبر خدا دکھائے

مہندی تمہارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلھن بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

"شب عروسی"، "مہندی ملنا" "تاروں کی چھاؤں میں دلھن رخصت کرانا" اسی ہندوستان کی رسمیں ہیں۔ جن کو وہ اس عرب عورت میں سمو کر اس کی دلکشی اور اثر ہندوستانیوں کے دلوں میں اور زیادہ بڑھانا چاہتے ہیں۔

مگر وہ یہ نہیں بھولتے کہ وہ بہر حال عرب کی بہادر عورت ہے جو مقصد اور آن پر مٹنے کیلئے اپنی عزیز ترین ہستیوں کو قربان کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے اور اس کا مظاہر زوجۂ عباس روزِ عاشورہ وقتِ ظہر کرتی ہے۔ حسینؑ کے سب یاور و انصار اور بہت سے عزیز شہادت پا چکے ہیں اور اب فوجِ حسینیؑ کے علم بردار، عباس، علی اکبر اور سردارِ فوج حسینؑ کے سوا اور کوئی باقی نہیں۔ عباس جو صبح سے مرنے پر کمر بستہ ہیں اور اجازت نہیں ملتی اب مزید تاخیر برداشت نہیں کر پاتے اور جب بھائی سے رضا نہیں ملتی تو بہن اور بھاوج سے سفارش کرانے خیمے میں جاتے ہیں۔ شہربانو زوجۂ امام حسینؑ عذر کرتی ہیں بھلا میں کیسے حسینؑ سے یہ کہوں کہ عباس کو رضا دو۔ وہ یہ نہ کہیں گے ؂

بانو نے مرتضیٰ کی کمائی کو کھو دیا		بچوں کے واسطے مرے بھائی کو کھو دیا

عباس بڑی بہن زینب سے مدد کے طالب ہوتے ہیں تو وہ بھی بھاوج کی ہم نوائی کرتی ہیں ؂ پانی بھی مل رہے گا صغیروں کا ہے خدا

موقع نہ سعی کا ہے نہ مشکل کشائی کا		یہ چل بسے تو کون ہے پھر میرے بھائی کا

زینب چھوٹے بھائی کو بھی بہت چاہتی ہیں۔ بڑی قدر کرتی ہیں مگر حسینؑ صرف پیارے بھائی ہی نہیں بلکہ وہ انھیں اسلام کی سلامتی کا ضامن سمجھنے کی وجہ سے ان سے گہری عقیدت بھی رکھتی ہیں۔ اور اسی لیے ان کی جان کی فکر سب سے زیادہ ہے۔ کوئی

عام مزاج کی عورت ہوتی تو کڑھ کے رہ جاتی کہ نند کو سگے بھائی کی فکر ہے۔ میرے شوہر کی نہیں۔ مگر وہ عالی ظرف بی بی ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتی تھی ؎

کہنے لگی یہ زوجۂ عباسِ خوش صفات
واری بھلا یہ کون سے وسواس کی ہے بات
مشکیزہ لے کے گر یہ نہ جائیں سوئے فرات
پھر ننھے ننھے بچوں کی ہو کس طرح حیات

شوہر کی سفارش کرتے کرتے جیسے یہ دھیان آجاتا ہے کہ کہیں وہ حد سے تو نہیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ بہن اور بھاوج کا رشتہ بہرحال زیادہ قریبی ہے ؎

ہر وقت کبریا سے طلب گارِ خیر ہوں
آگے جو کچھ سبھوں کی رضا ہیں تو غیر ہوں

آخری مصرعے کی بلاغت پر غور کیجیے۔ یہ خالص ہندوستانی تہذیب کا لب و لہجہ ہے۔ جو جانتے ہوئے بھی کہ اس سے زیادہ حقدار اس سے زیادہ چاہنے والا نہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔ وہ مروت اور لاج کی وجہ سے یہی کہتی ہے "میں تو غیر ہوں"۔ لیکن جب شوہر کو جنگ پر جانے کی رضا مل جاتی ہے تو ؎

دل ہل گیا سینے میں رنڈاپے کی خبر سے

حالت یہ تھی کہ ؎

چہرا تو فق ہے گود میں ہے چاند سا پسر
مانع ہے شرم روتی ہے منہ پھیر پھیر کر
موقع نہ رونے کا ہے، نہ بول سکتی ہے
حضرت کے منہ کو نرگسی آنکھوں سے تکتی ہے

لیکن دلِ بے قرار کسی طرح چین نہیں لینے دیتا۔ دل کہتا ہے تیرا درد سب سے زیادہ امام حسینؑ کی بیوی ہی سمجھ سکتی ہیں کہ وہی مصیبت انھیں بھی درپیش ہے۔ شوہر کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر چاہنے والی بیوی کی کیا حالت ہوتی ہے ؎

کہتی ہے رو کے بانوئے عالم سے بار بار
ہم کو تباہ کرتے ہیں عباسِ نامدار
ہے لونڈیوں کے باب میں بی بی کو اختیار
کچھ آپ بولتی نہیں میں آپ کے نثار

کہیے جو روکنے کی کوئی ان کے راہ ہو
اب عنقریب ہے کہ مرا گھر تباہ ہو

مگر وہ کیا بولیں کہ صبح سے دیکھ رہی ہیں کہ جو جاں نثار اس راہ پر گیا واپس نہ آیا۔ ان کو خاموش پا کر بے قراری میں پکار اٹھتی ہے ؎

اکبر کا واسطہ کوئی تدبیر کیجیے
امداد بہر حضرت شبیر کیجیے
کچھ دل کو ہو قرار وہ تقریر کیجیے
پٹکا وہ باندھتے ہیں نہ تاخیر کیجیے

کیا غضب کی مصوری ہے۔ دیکھیے وہ تو پٹکا بھی باندھنے لگے اب دیر کی تو غضب ہو جائے گا۔ مگر اس بے قراری میں بھی یہ احساس باقی ہے کہ ایسے وقت میں اس کی یہ تڑپ بے جا ہے۔ معذرت کا انداز دیکھ کر دل لرز جاتا ہے ؎

اب دل ہے میرا اور کئی غم کے تیر ہیں
بی بی میں کیا کروں مرے بچے صغیر ہیں

اپنی الفت و محبت کا تذکرہ مشرقی عورت کی حیا کے خلاف ہے مگر یہ کہہ کر کہ میرے بچے ابھی ننھے ننھے سے ہیں وہ سب کچھ کہہ جاتی ہے جو ایسے وقت عورت کہہ سکتی ہے۔

عباس بہادر ہیں، جاں نثار ہیں، مرنے پر کمر کس چکے ہیں۔ اور اس مقصد پر جان دینا دونوں جہان کی سعادت جانتے ہیں۔ مگر انسان ہیں، دل میں بیوی کی محبت، بچوں کی الفت بھی تو موجزن ہے ؎

عباس دیکھتے ہیں جو زوجہ کا اضطرار
ہوتا ہے تیرِ غم جگرِ ناتواں کے پار
روتے ہیں خود مگر یہ اشارہ ہے بار بار
شوہر کے غم میں یوں کوئی ہوتا ہے بیقرار
آؤ ادب سے دلبرِ زہرا کے سامنے
روتی ہیں لونڈیاں کہیں آقا کے سامنے

بیوی کو بھی سمجھایا جارہا ہے۔ اس اعلیٰ مقصد کو بھی یاد دلا رہے ہیں، جس کی خاطر جامِ شہادت پینا ہے ؎

خیر النساء کے لال پہ ہوتے ہیں ہم فدا　　شادی کا ہے مقام کہ ماتم کی ہے یہ جا

ایذا میں صبر صاحبِ ہمت کا کام ہے

میری بھی آبرو ہے تمھارا بھی نام ہے

"میری آبرو" اور "تمھارا نام" یعنی دنیا تمھیں کو سراہے گی کہ کیسی صاحبِ ہمت بی بی تھی کہ کسی بات کی پروا نہ کی اور شوہر کو نواسۂ رسول پر قربان کر دیا۔ چاہنے والے شوہر کے دل پر اس وقت جو گزر رہی ہے اور جس طرح دلداری کی جا رہی ہے اس کا پُر وقار اور دل گداز انداز دیکھیے ؎

لو پونچھ ڈالو آنسوؤں کو بہرِ ذوالجلال　　دیکھو زیادہ رونے سے ہوگا ہمیں ملال

گھبرا جاتے ہیں کہ کہیں امام بھاوج کو روتے نہ دیکھ لیں ؎

کیا اشکِ خوں بہا کے بگاڑو گی میرا کام　　ہم ہاتھ جوڑتے ہیں یہ ہے صبر کا مقام

پوچھیں حضور گر کہ تمھیں کیا قبول ہے

صاحب یہ کہیو تم کہ رنڈاپا قبول ہے

بھتیجی کی مصیبت اور صبر کی تعریف کرکے بیوی کے سامنے مثال پیش کی جاتی ہے ؎

قاسم کو دیکھو جانبِ کبریٰ کرو نگاہ　　گزری جو شب تو صبح کو گھر ہو گیا تباہ

دشمن کو بھی دکھائے نہ اللہ ایسا بیاہ　　کیا صابرہ ہے دخترِ شبیر واہ واہ

سہتی ہیں یوں جہاں میں جفا رانڈ ہونے کی

آواز بھی بھلا کوئی سنتا ہے رونے کی

اب دلداری اور حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے ؎

ہوتا ہے صابروں کا مصیبت میں امتحاں　　جل جائے دل مگر نہ اٹھے آہ کا دھواں

چرچا رہے کہ وقت پہ کیا کام کر گئی
چھوٹی بہو علی کی بڑا نام کر گئی

آخری مصرعہ سارے بیان کی جان ہے۔ تم علیؑ کی بہو ہو، اس مجاہد کی جس نے اپنا سب کچھ اسلام پر قربان کر دیا تھا۔ تمھیں اس عظیم شخصیت کی بہو ہونے کے قابل بننا ہے کہ دنیا پہچان لے کہ یہ علیؑ کی بہو ہے۔ بڑے عزم اور حوصلے کی عورت۔ چھوٹی بہو ہونے کے باوجود دنیا میں وہ کام کر گئی جو بڑوں بڑوں کے بس کا نہیں ہوتا۔

زوجۂ عباس کی یہ بے قراری بہ تقاضائے بشری تھی۔ ورنہ وہ تو پہلے ہی سے شوہر کو مرنے کی رضا دے چکی تھی ؂

شوہر نے یہ کلام کیے جب بچشم تر
چپ ہو گئی وہ صاحب ہمت جھکا کے سر

ایک اور موقع پر حضرت عباس بیوی کو سمجھاتے وقت اپنی ماں کا ذکر کر کے گویا ان کو یہ جتانا چاہتے ہیں کہ دیکھو میری ماں کیسی صاحبِ عزم ہے کہ اس نے بیٹوں کو اس عظیم مقصد پر قربان کرنے بھیجا ہے ؂

جاؤ جو وطن دیجیو ماں کو یہ پیغام　　جو آپ نے فرمایا تھا وہ میں نے کیا کام
کاندھے پہ اٹھایا علمِ لشکرِ اسلام　　سقّائے حرم آپ کے بیٹے کا ہوا نام

عبّاس میدانِ جنگ کی سمت روانہ ہو جاتے ہیں اور ہزاروں دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ انیس وہ روایت پھر یہاں بیان کرتے ہیں کہ شمر[1] یزیدی فوج کا سپہ سالار عباس ابن علیؑ کو بہکانے اور لالچ دے کر اپنی طرف لانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ سن کر عباس رنج و غصے سے بے حال ہو جاتے ہیں۔

سر تا بہ قدم کانپ گیا عاشقِ شبیر　　فرمایا زباں بند کر او ظالمِ بے پیر

---

[1] امام حسینؑ کا قاتل

میں عاشقِ شبیر ہوں اور اہلِ وفا ہوں
سر تن سے جدا ہو پہ نہ بھائی سے جدا ہوں

اور حقارت سے اس کی پیش کش کو ٹھکرا دیتے ہیں ؎

خلعت ترا کیا چیز ہے او ظالم بے پیر — یا حلۂ فردوس ہے یا دامنِ شبیر
مختار ہیں کوثر کے ہماری ہے یہ توقیر — منصب ہے غلامی شہ اور خلد ہے جاگیر

کچھ حشمتِ ظاہر کی ہمیں چاہ نہیں ہے
واں دولتِ دنیا ہے تو یاں دولتِ دیں ہے

فوجِ کفار یہاں عباس بن علیؑ کو بہکانے میں ناکام رہی تو دوسری چال چلتی ہے اور امام حسینؑ کو غلط فہمی اور بدگمانی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک شخص خیمے کے قریب آکر چلاتا ہے ؎

اس فوج میں عباس امیرِ عرب آیا
عباس علمدار ہماری طرف آیا

امام حسینؑ پر تو اپنے بھائی کی سیرت آئینے کی طرح روشن تھی۔ وہ منافقت کی اس بات پر ایک لمحے کے لیے بھی دھیان نہیں دے سکتے تھے ؎

اکبر سے یہ بولا پسرِ مخبرِ صادق — کافر ہیں، جفاکار ہیں، مفسد ہیں یہ فاسق
یہ بات نہیں رتبۂ عباس کے لائق — وہ ہے مرا شیدا، مرا یاور، مرا عاشق

لیکن اہلِ حرم کے خیمے میں یہ خبر دوسری طرح پہنچتی ہے۔ وہاں بھی حضرت زینب فوراً کہتی ہیں کہ یہ خبر جھوٹی ہے۔ عباس کی بیوی عورتوں کو گھبرایا اور پریشان دیکھ کر سمجھتی ہیں کہ شاید عباس نے شہادت پائی۔ ایک ایک سے گھبرا گھبرا کر ان کی خیریت پوچھتی ہیں۔ سب عورتیں خاموش رہتی ہیں مگر کم سن سکینہ یہ سب کیا جانے ؟

اور کہتے ہیں آپس میں خوشی ہو کے یہ اعدا — عباس ملا ہم سے شہِ دیں ہوئے تنہا

وہ رات ہی شوہر کے منہ سے اعدا کا پیام سن چکی ہیں، مگر انسانی کمزوری اور نسوانی وسواس بھی اس یقین میں ذرا سا شک پیدا نہیں ہونے دیتے۔ بھائی کو بھائی سے جو محبت ہے اس سے وہ خوب واقف ہے۔

عباس پھرے شہ سے نہ مانوں گی غلط ہے

میں روتی تھی شب کو تو یہ سمجھاتے تھے ہر بار
تم لونڈی ہو اور میں ہوں غلام شہِ ابرار
سردار پہ کل ہوگا تصدق یہ علمدار
کچھ اپنے رنڈاپے کا نہ غم کیجیو زنہار

فدیہ ہوں میں اس کا جو محمدؐ کا خلف ہے
میری بھی سعادت ہے تمہارا بھی شرف ہے

مگر دل میں جانے کیسے وسواس اٹھ رہے تھے، کنبے کی نظر میں سبک ہونے کے خیال سے کلیجہ پھٹا جا رہا تھا ۔

اس سوچ میں پھرتی تھی سراسیمہ وہ مضطر
اس کا بھی نہ تھا ہوش کہ کب گر گئی چادر
رخ زرد تھا، دل کانپتا تھا سینے کے اندر
دھڑکا تھا کہ اب کیا کہیں گے آن کے سرور

یہ وسواس اور خوف بالکل فطری بات ہے لاکھ یقین اور بھروسہ ہو مگر انسان کیا کہہ سکتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ عرب کی غیرت دار بیٹی کا یہ جذبہ دیکھیے ۔

یارب نہ سنوں میں کہ جدا ہوگئے عباس
یہ غل ہو کہ بھائی پہ فدا ہوگئے عباس

بھیجوں کسے رن میں جو مفصل خبر آئے
کیا وجہ جو گھر میں نہ شہِ بحر و بر آئے
شمرِ ستم آرا کی نہ امید بر آئے
آپ آئیں و یا مشک و علم خوں میں تر آئے

کھل جائے کہ عاشق تھا شہِ ہر دو سرا کا
شہرہ ہو جہاں میں مرے والی کی وفا کا

اب رنڈاپے کی فکر نہیں، بچوں کی یتیمی کا دھیان نہیں، شوہر کی محبت اور جدائی کا

احساس نہیں، دردِ فراق کی ٹیس نہیں۔ اب تو آن پر آبنی ہے۔ دل کا حال کس سے کہیں؟ بیٹا کم سن سہی مگر ہے تو ان کا اپنا بیٹا بلاکر کہتی ہیں ؎

دیکھ آؤ کہ لڑتے ہیں کہ مارے گئے عباس

غیرت سے موئی جاتی ہوں میں بیکس و ناچار کہتے ہیں عدو بچھڑ گیا بھائی سے علمدار

جانتی ہیں کہ یہ بات جھوٹ ہے مگر غصہ اس پر ہے کہ آخر انھوں نے دشمن سے بات ہی کیوں کی۔ ان دو شعروں کو پڑھیے۔ رفاقت، محبت، اعتماد اور بھروسے، شکوہ شکایت کی کتنی داستانیں اس میں چھپی ہیں ؎

صدقے گئی کہیو مری جانب سے بہ تکرار کیا قہر ہے تم شمر سے کیوں کرتے ہو گفتار

وہ تفرقہ انداز ہے مردودِ خدا ہے
شبیر کے دشمن سے علاقہ تمھیں کیا ہے

بہادر باپ اور صاحبِ غیرت ماں کا بچہ میدانِ جنگ میں جانے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو پھوپھی زینب بیقرار ہو کر بھاوج سے کہتی ہیں ؎

عباس کی ہے خیر عبث روتی ہو بی بی بچے کو بھلا ہاتھ سے کیوں کھوتی ہو بی بی

مگر بچہ کس ماں کا بچہ ہے ؎

کہتا تھا وہ معصوم لیے ہاتھ میں تلوار کیوں روکا ہے جانے دو سوئے لشکرِ کفار

رکھتے ہیں مرے باپ پہ تہمت یہ ستمگر
اس جھوٹ کی دیتا ہوں سزائیں انھیں جاکر

خاندانی محبت کا یہ منظر کتنا پُراثر ہے ؎

آنکھوں میں بھرے اشک وہ کرتا تھا یہ تقریر لیتی تھی بلائیں شہِ دلگیر کی ہمشیر
منہ چوم کے فرماتی تھیں یہ بانوئے دلگیر صدقے تری جرأت کے میں اے صاحبِ شمشیر

تہمت کوئی رکھ سکتا ہے بابا پہ تمھارے
یہ مکر و فریبِ اہلِ شقاوت کے ہیں سارے

ناگاہ میدانِ جنگ میں شور بلند ہوتا ہے ؎

تلوار علمدار نے کھینچی، غضب آیا
لو غیض میں فرزندِ امیرِ عرب آیا

اور یہ سنتے ہی بیوی کا دل، اطمینان، فخر اور مسرت سے سرشار ہو جاتا ہے ؎

سرخی سی ہوئی چاند سے چہرے پہ نمودار
پردے سے لگی دیکھنے رن کو وہ دل افگار

اور پھر بیویوں سے مخاطب ہو کر بولیں ؎

سب سے کہا دیکھو یہ دغا ہے کہ وغا ہے
بھائی کو علمدار نے چھوڑا تو یہ کیا ہے

اب تک کسی سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ نہ ہو رہا تھا۔ اور اب خود امامِ وقت سے بے خوفی و فخر سے کہا جا رہا ہے:

کس شان سے لڑتا ہے غلام آپ کا واری

اور پھر توجہ دلائی جاتی ہے ؎

عباس کے ہاتھوں کی صفائی کو تو دیکھو
لاکھوں سے اکیلے کی لڑائی کو تو دیکھو

کیا آپ کی الفت ہے اس الفت کے میں قربان
بیٹے کا خیال ان کو نہ اس دم ہے مرا دھیان

لڑنے میں بھی جاری ہے زباں سے یہی ہر آن
نقشِ قدمِ شہ پہ تصدق ہے مری جان

اور باتیں کرتے کرتے پھر ایک دم کلیجے میں ہوک اٹھتی ہے اور یہ روح فرسا حقیقت یاد آجاتی ہے کہ اس لڑائی کا انجام کیا ہے تو بے قراری میں کہہ اٹھتی ہیں ؎

لاکھوں میں وہ تنہا ہیں یہ لونڈی ہے قلق میں
صدقے گئی کچھ کیجیے دعا بھائی کے حق میں

امام حسینؑ جو بھائی کی جدائی میں خود بے قرار ہیں مگر اس بے قراری کو دل کی گہرائیوں میں چھپا رکھا ہے۔ بھاوج کے سامنے بھائی کی بہادری اور وفا و محبت کی تعریف کر کے اس کا دل بڑھاتے ہیں مگر اس تسلی میں بھی مایوسی مضمر ہے ؎

شہ بولے دعا کرتا ہے سینے میں مرا دل
آساں کرے اللہ مرے بھائی کی مشکل

صادق ہے محبت میں وفاداری میں کامل
کس شوق سے طے کرتا ہے وہ عشق کی منزل

نذر روز کی اس بھوک کے اور پیاس کے صدقے
شبیر وفاداریِ عباس کے صدقے

بھاوج سے بھائی کی محبت اور احسان کا اعتراف کیا جا رہا ہے ؎

محبوبِ[1] خدا ہیں ترے شوہر کے ثنا خواں   ہیں اس کی شجاعت کے معرّف شہِ مرداں[2]
اور حمزہ[3] و جعفر[4] بھی ہیں شرمندۂ احساں

اور یہ سن کر جاں نثار بھائی کی بیوی اپنی وفاداری کا یقین یہ کہہ کر دلاتی ہے ؎

دنیا میں رہیں آپ سلامت یہ دعا ہے
عباس سے سو ہوئیں تصدق تو بجا ہے

مگر اس جذبۂ صادق کے باوجود عورت پھر عورت ہے۔ جس کے لیے محبوب شوہر کی جدائی سے بڑھ کر عظیم صدمہ اور کوئی نہیں۔ ساری دنیا کی چاہنے والی بیویاں اس جذبے کی شدت میں یکساں ہیں۔ انیسؔ نے حضرتِ عباس کی شہادت کے بعد زوجۂ عباس کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ انھیں جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

عباس نہر پر شانے کٹائے ابدی نیند سو گئے۔ گھر میں شہید کی لاش تک نہ آسکی کہ سارا تن ٹکڑے ٹکڑے تھا، صرف چھدی مشک اور خون آلود علم آیا ہے۔ اس وقت ؎

اللہ رے دل خراش علی کی بہو کے بین   سکّانِ آسمان و زمیں کو بھی تھا نہ چین
چادر پڑی تھی منہ پہ کہ تھے سامنے حسین   تھامے تھی ہاتھ خواہرِ سلطانِ مشرقین
ٹکڑے تھے تیغِ غم سے دلِ سوگوار کے
حکم حیا یہ تھا کہ نہ رونا پکار کے

---

[1] رسول خدا   [2] حضرت علیؑ
[3] رسول اللہؐ کے چچا   [4] امام حسین کے چچا

امام حسینؑ وہاں سے ہٹ جاتے ہیں کہ بدنصیب بیوہ دل کی بھڑاس نکال لے تو زوجۂ عباس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور عالم بیقراری میں شوہر کی روح سے مخاطب ہو کر باتیں کرنے لگتی ہیں۔

چشم تصور سے دیکھیے انہیں تصور کی بھی کیا شرط ہے۔ آپ نے اپنے عزیزوں، دوستوں ہمسایوں کسی نہ کسی کے ایسا سانحہ دیکھا ہوگا۔ کڑیل جوان شوہر مر گیا ہے۔ جوان بیوہ اور ننھے ننھے بچے رہ گئے ہیں۔ اس وقت بیوہ کی جو حالت ہوتی ہے وہ لوگوں سے دیکھی نہیں جاتی۔ بین نے میت پر گریہ و ماتم کو برا اور ناجائز قرار دینے والی عورتوں کو بھی ایسی حالت میں بسمل کی طرح تڑپتے اور ایسے دل خراش بین کرتے دیکھا ہے کہ سننے والے کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ میر انیس نے حضرت عباس کی بیوی کی جو حالت دکھائی ہے جو بین ان کے منہ سے کرائے ہیں اس میں کسی بھی بیوہ عورت کے نازک احساسات و جذبات کی مکمل اور حقیقی ترجمانی ملتی ہے۔ انداز بیان ضرور ہندوستانی عورت کا ہے مگر دل کے زخم سے جو لہو رس رہا ہے وہ ہر درد مند بیوہ کے دل کا ہو سکتا ہے ؎

کل تھی سہاگن آج تو میں سوگوار ہوں	بیوہ ہوں، جاں بلب ہوں، غریب الدیار ہوں
جانِ علی ہیں آپ تو میں جاں نثار ہوں	ہاں ناز ہے تو یہ ہے کہ خدمت گذار ہوں

جنگل میں چھوڑیئے نہ مرا ہاتھ تھام کے
بیٹے ہیں آپ امام کے بھائی امام کے

والی کہاں یہ رانڈ یتیموں کو لے کے جائے	اس کربلا نے لوٹ لیا مجھ کو ہائے ہائے
کیا اس کی زندگی جسے وارث نہ پاس ہو	میری بھی قبر آپ کی تربت کے پاس ہو

رات تو شوہر ان کے پہلو میں تھا۔ پیار و محبت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ چند گھنٹے میں یہ کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے ؎

کہتے تھے شب کو بھر کے دمِ سرد دم بدم
تم ہم کو چاہتی ہو تمھیں چاہتے ہیں ہم
سو سر خدا جو دے تو نثارِ شہِ امم
گر ہے تو بس تمہاری جدائی کا ہے الم

کل ہم ہیں اور خنجر و شمشیر و تیر ہیں
اس کا بھی غم بڑا ہے کہ بچے صغیر ہیں

یہ باتیں یاد آتی ہیں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ ضبط و شرم کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں

کیسی یہ غفلت آج ہے اے شیرِ حق کے لال
بچوں کی اب نہ فکر نہ لونڈی کا ہے خیال
بھائی تھی جس کے بالوں کی بو آپ کو کمال
اس نے تمھارے سوگ میں کھولے ہیں سر کے بال

اب وصل کے نہ دن، نہ شبیں اشتیاق کی
کیوں کر کٹیں گی آہ یہ راتیں فراق کی

صاحب تمھیں تو سونے کو ہاتھ آئی خوب جا
دریا کا قرب، سرد ترائی، خنک فضا
میں اور آپ آج کی شب تک نہ تھے جدا
بستر کو خالی دیکھ کے گذرے گی مجھ پہ کیا

تڑپوں نہ کس طرح کہ نئی واردات ہے
صدقے گئی فراق کی یہ پہلی رات ہے

درد و غم کا دریا ہے جو لہریں مارتا بہا چلا جارہا ہے

کیونکر کہوں کہ آپ میں مہر و وفا نہ تھی
میری ہی خاک قابلِ خاکِ شفا نہ تھی
اتنا گلہ ہے بس کہ یہ غفلت بجا نہ تھی
کیا پائنتی بھی اک مری تربت کی جا نہ تھی

بے وجہ خیر خواہ سے منھ موڑتے نہیں
ساتھی برا بھی ہو تو اسے چھوڑتے نہیں

یہ بَین ہر حساس مرد اور دردمند عورت کے دل کو تڑپا دیتے ہیں کیونکہ اسی سے ملتی جلتی حالت انھوں نے بھی اپنی یا اپنے کسی پیارے کی دیکھی ہے۔ اہل بیت کی مصیبت انھیں اپنی مصیبت محسوس ہونے لگتی ہے۔ جیسے

یہ سب ان پر بھی بیت رہا ہے۔ زمان و مکان کا فرق ذرا دیر کے لیے مٹ جاتا ہے۔ دل درد و غم سے بھر جاتے ہیں، آنکھیں برسنے لگتی ہیں۔
اور یہی انیسؔ کا مقصد ہے اور یہی ان کے کلام کی کامیابی.....

—————— : : ——————

ساس اور بہو
(اُمِّ فروہ اور فاطمہ کبریٰ)

ایک روایت ہے کہ کربلا میں امام حسینؑ کی بیٹی فاطمہ کبریٰ اور امام حسنؑ کے بیٹے قاسم کی شادی شبِ عاشور کو ہوئی تھی۔ اس لیے کہ امام حسنؑ کی یہ وصیت تھی۔ تاریخی حیثیت سے یہ روایت کہاں تک درست ہے اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ اسے حقیقت بتاتا ہے، دوسرا محض افسانہ۔ مگر یہ روایت اتنی مشہور اور مقبول ہے کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بعض اور اسلامی ممالک میں بھی اس حسرتناک شادی کی یادگار اپنے اپنے انداز میں منائی جاتی ہے۔ کربلا کے ان حرماں نصیب دولھا دلھن کی یہ داستانِ الم جو اتنی پراثر دردناک اور دلکش ہے۔ ایک رومانی سی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ عوام اور خواص دونوں اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں صرف شیعہ لوگ ہی نہیں بلکہ تقریباً سبھی مسلمان اور بعض خوش عقیدہ ہندو بھی اس واقعے کی یاد تازہ رکھنے کے لیے، ۷ محرم الحرام کو (کہ یہ تاریخ خاص حضرت قاسم سے مخصوص کر دی گئی ہے)، مہندیوں کے جلوس نکالتے ہیں۔ منت کے کنول چڑھاتے اور جلاتے ہیں۔ ملیدہ بانٹا جاتا ہے۔ کربلا کے اس نامراد دولھا کے نام بچوں کو

منت کے چھلّے، زنجیریں، ہنسکڑے، چوڑیاں وغیرہ پہنائی جاتی ہیں۔ اور نذریں دلائی جاتی ہیں دنیا میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو روایت کی کسوٹی پر پوری اتریں یا نہ اتریں لیکن صدیوں کی روایت ان کو حقیقت سے زیادہ ٹھوس اور دلکش بنیاد بنا دیتی ہے اور وہ عوام کے دل میں گھر کر لیتی ہیں۔ یہ واقعہ بھی ایک ایسی ہی روایت بن چکا ہے۔

اردو کے سب ہی مرثیہ گویوں نے اس روایت کو بڑے پر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ میر انیسؔ نے بھی اس روایت کو صحیح مان کر حضرت قاسم کے حال کے سب مرثیوں میں ان کی شادی کا واقعہ ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کربلا کے کسی اور واقعے میں انھوں نے اس شدت اور غلو کے ساتھ ہندوستانی تہذیب اور رسم و رواج کو نہیں دکھایا جتنا اس روایت کے بیان میں۔ یہ صحیح ہے کہ نئی تعلیم اور نئی تہذیب میں یہ باتیں روز بروز کم ہوتی جا رہی ہیں۔ مگر ابھی تک ہزاروں خاندانوں میں یہ ساری رسمیں پورے اہتمام سے منائی جاتی ہیں۔ بہرحال ہمارا مقصد اس واقعے کی صحت یا عدم صحت سے بحث کرنا نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اس واقعے سے جو دو نسوانی شخصیتیں منسلک ہیں ان کی کردار نگاری انیسؔ نے کیسی کی ہے۔

یہ دو ہستیاں قاسم کی والدہ امّ فروہ اور ایک رات کی بیاہی دلھن فاطمہ کبریٰ کی ہیں۔

بیوہ عورت کو اپنے بیٹے سے جو اتھاہ محبت ہوتی ہے اور اس کی ذات سے وہ جو امیدیں وابستہ کرتی ہے وہ سبھی جانتے ہیں۔ امّ فروہ بھی جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں جب ان کے بچے بہت کمسن تھے اور قدرتی طور پر انھیں اپنے بیٹوں، خاص کر بڑے بیٹے قاسم سے بے پناہ محبت تھی۔ مگر روزِ عاشورہ ایثار اور قربانی کا جو مقابلہ خاندانِ نبوت کی عورتوں میں ہو رہا تھا اس میں امّ فروہ کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ اور اپنے دو بیٹوں کو اپنے دیور پر جو ان کے ہادی و امام بھی تھے قربان کر دیا۔ میر انیسؔ کے یہاں

ان کا کردار کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ مگر جہاں بھی ہے اس میں ایک عاشق زار ماں، چاہنے والی ساس، فرض شناس عورت اور سچی مسلمان بی بی کی شان نظر آتی ہے۔ انیسؔ نے ان کی شخصیت کا یہ پہلو خاص طور پر اجاگر کیا ہے کہ بیٹے کی روح فرسا جدائی کے صدمے کے ساتھ ساتھ ان کو شدت سے اپنی بدنصیب بہو کی مصیبت کا احساس ہے۔ مگر یہ احساس بھی انھیں اس عظیم الشان فیصلے سے ہٹا نہیں سکتا، جو بیٹے کو حق پر قربان کرنے کے لیے وہ کر چکی تھیں۔ انیسؔ دکھاتے ہیں کہ خاندانِ نبوت کی سبھی عورتوں کو اپنی عزت اور وقار کا بڑا پاس تھا۔ وہ ایک دوسری سے بڑھ کر ایثار کرنا چاہتی تھیں۔ عورت کی فطرت میں رشک کا جو مادہ ہوتا ہے اسے انھوں نے شعوری طور پر اُبھار کر دکھایا۔ مگر وہ رشک جو نیکی و حق پرستی کی دوڑ میں آگے بڑھانے میں معاون ہوتا ہے، وہ رشک جس نے اسلام کی راہ میں قربانی کے شوق صدمے اٹھانے کی طاقت اور حق پرستی کے جذبات کو اُبھارا۔

روزِ عاشورہ حق و باطل کا بازار گرم ہو چکا۔ رفیق و انصار شہادت پا چکے عزیزوں میں سے بھی کئی قربان ہو چکے۔ یہاں تک کہ حضرت زینب کے دونوں بچوں نے بھی جام شہادت پی لیا۔ اب فوجِ حسینی میں تین جوان باقی ہیں۔ عباس، علی اکبر، اور قاسم۔ اس وقت انیسؔ امِّ فروہ کی حالت یوں بیان کرتے ہیں ؎

مَل مل کے ہاتھ کہتی تھی دل سے کہ ہے غضب ہم شکلِ مصطفےٰ کہیں مرنے نہ جائیں اب
اولاد اپنی آج کے دن گر بچاؤں گی
منہ فاطمہ کو حشر میں کیا میں دکھاؤں گی

اور پھر ؎

دل میں یہ سوچتی ہوئی اٹھی وہ خوش خصال قاسم کو اپنے پاس بلایا بصد ملال
رو کر کہا کہ اے حسنِ مجتبیٰ کے لال کچھ اس ضعیف ماں کی بھی عزت کا ہے خیال

جاری ہیں اشک خوں مری چشم پر آب سے
زینب کے آگے جا نہیں سکتی حجاب سے

نند کے کمسن بچے شہادت پا چکے اور میرا نوجوان بیٹا ابھی زندہ ہے۔ یہ احساس اس غیرت دار بی بی کے لیے بڑا تکلیف دہ ہے۔

گھر لٹ رہا ہے فاطمہ زہرا کا ہائے ہائے
دشمن وہ دوست ہے جو نہ اس وقت کام آئے
غیروں نے یاں حسین کے قدموں پہ سر کٹائے
کیا قہر ہے کہ بھائی کا جایا نہ مرنے جائے
گھیرا ہے بے وطن کو عدو کی سپاہ نے
منہ دیکھنے کو کیا تمھیں پالا ہے شاہ نے

اپنی ممتا کو کچل ڈالا ہے۔ آرزوؤں اور تمناؤں کو خاک میں ملا دیا ہے۔ بیٹے کو مرنے کی صرف اجازت ہی نہیں دی بلکہ اسے اکسا رہی ہے کہ موت کو لبیک کہو، چچا کا حقِ محبت ادا کرو۔ حق پر جان قربان کر دو۔ جی میں ڈر رہی ہے کہ جوانی کی عمر ہے کل ہی تو بیاہ ہوا ہے کہیں ایسا نہ ہو عزم کمزور پڑ جائے۔ ان کی بے کسی و مصیبت کا نقشہ کھینچتی ہے۔ اکبر سے پہلے شہید ہونے کی ترغیب دیتی ہیں اور آخر میں یہ کہ اگر ایسا نہ ہوا تو قیامت میں ہم تم رسولؐ اکرم کو کیا منہ دکھائیں گے۔

سب مر چکے امامِ دو عالم کے اقربا
باقی ہے کون اکبر و عباس کے سوا
حضرت کے تن کی جان ہیں یہ دونوں مہ لقا
سر ان کے کٹ گئے تو قیامت ہوئی بپا
تم بھی خجل رہو گے سدا جد کے سامنے
شرمائیں گے حسن بھی محمدؐ کے سامنے

جانتی ہیں کہ اس معرکۂ حق و باطل میں بہت سے جا چکے جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی نہ بچیں گے مگر ان کا لختِ جگر ان دونوں سے پہلے قربان ہو تو وہ کنبے میں سربلند اور قیامت میں سرخرو ہوں گی۔ باپ کی وصیت یاد دلائی جاتی ہے۔ بہادری کو للکارا جاتا ہے

جو مرد ہیں وہ دیتے ہیں مردانگی کی داد　　کچھ اپنے باپ کی بھی وصیت ہے تم کو یاد
جلدی دلھن سے مل کے سدھارو پئے جہاد　　قربان ہو چچا پہ یہی ماں کی ہے مراد
بیاہا تمھیں بر آئی ہر اک آرزو مری
اب وہ کرو کہ جس میں رہے آبرو مری

آخری شعر میں حسرت و یاس کن انداز میں سامنے آتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ بیٹے کو اپنی طرف سے بے فکر کیا جا رہا ہے۔

بیٹا تو پہلے ہی سے مرنے پر کمر بستہ ہے۔ مگر اب تک چچا سے میدانِ جنگ جانے کی اجازت نہ پا سکا تھا اس لیے مجبور تھا۔ ماں کی باتیں سن کر آزردہ ہو جاتا ہے

ایسے ہیں ہم کہ بیٹھ رہیں وقتِ کارزار
جانیں ہزار ہوں تو کریں شہ پہ ہم نثار　　رخصت ہی وہ نہ دیں تو ہے کیا اپنا اختیار

ماں بیٹے کو بہو سے رخصت کے لیے بھیجتی ہے مگر بے چین رہتی ہے کہ کہیں وہاں دیر نہ لگ جائے۔ آخر قاسم دلھن کے پاس سے اٹھتے ہیں ؎

رخصت ہوا ما در سے یہ کہہ کر وہ دل افگار　　اس وقت رہیں آپ ذرا ان سے خبردار
جو بات مناسب ہو وہ سمجھائیو ان کو
لاشں آئے جو میری تو نہ دکھلائیو ان کو

قیامت کا وقت ہے۔ نئی دلھن کی جدائی اور بربادی کا شدّت سے احساس ہے۔ چلتے چلتے دلھن کو اپنی ماں کے سپرد کرتا ہے۔ ذرا اس بد نصیب ماں کا تصور کیجیے۔ اس وقت مامتا کی ماری ماں کے کیا جذبات ہو سکتے ہیں۔ انیس نے دو بندوں میں ان کی غضب کی ترجمانی کی ہے ؎

فرما کے الوداع اٹھا دلبرِ حسن　　برہم ہوئی وہ بزم، وہ صحبت، وہ انجمن
غل پڑ گیا کہ لٹ گئی اک رات کی دلھن　　اس وقت سب سے دولھا کی ماں کا یہ تھا سخن

جاتی ہے اب برات مرے نونہال کی
رخصت ہے بیوہ زنِ بیوہ کے لال کی

جاتا ہے سر کٹانے کو رن میں رشکِ ماہ ۔۔۔ لو میں نے دودھ بخش دیا سب رہیں گواہ
دنیا میں یادگار رہا حشر تک یہ بیاہ ۔۔۔ دو رانڈیں ایک جا ہوں یہ تھی مرضیِ الٰہ

سمجھے نہ اب کوئی کہ دلھن کی عزیز ہوں
کل تک تھی ساس آج میں اس کی کنیز ہوں

یہ مبالغہ نہیں، وفورِ محبت اور جذبات کی شدت میں یہ باتیں عین فطرت کے مطابق ہیں۔

معرکۂ کارزار گرم ہے قاسم شام کے مشہور پہلوان ارزق کے بیٹوں کے مارنے کے بعد اب خود اس سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ خیمے میں تلاطم برپا ہے، جان کی سلامتی کی نہیں عزت کی فکر ہے۔ اس وقت قاسم کی والدہ بہو سے کہتی ہیں ؎

خالق کرے گا رحم نہ آہ و بکا کرو ۔۔۔ دولھا پہ آ بنی ہے میں صدقے دعا کرو

بیٹے کی ظفر کی خبر سنتی ہیں تو کہتی ہیں ؎

بیوہ کا لال بچ گیا صدقے حسین پر
اسپند کوئی کر دے مرے نورِ عین پر

بیٹے نے زبردست فتح پائی ہے۔ ماں کو نظر لگنے کا اندیشہ ہے۔ اس وقت یہ کہنا کہ میرے بچے پر سے کوئی نظر تو اُتارو (اسپند کرنا، اسی معنی میں آتا ہے) یہ بھی ہندوستانی ماؤں کا انداز ہے۔

ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ میر انیسؔ دوسری خواتینِ اہلِ بیت کے منہ سے (جن میں حضرت زینب اور شہر بانو جیسی صابر و شاکر ہستیاں بھی شامل ہیں) بیٹوں کی لاشوں پر ایسے دردناک بین کراتے ہیں کہ پتھر کا کلیجہ پانی ہو جائے۔ مگر قاسم کی بیوہ

ماں جس کی دنیا بیٹے کی موت سے تباہ ہو چکی ہے ۔ دو چار فقروں سے زیادہ بیٹے کی لاش پر نہیں کہتی اور اس وقت بھی اپنی مامتا سے زیادہ بدنصیب بہو کی حالت کا احساس ہے ۔ مثلاً :۔

چلائی ماں یہ گر کے تنِ پاش پاش پر　　قاسم بنے اٹھو دلھن آئی ہے لاش پر

اور پھر آگے چل کر خالص ہندوستانی رسموں کا حوالہ دے کر یہ کہنا ہے

صدقے گئی پچی[1] کو نہ ہوئے کہیں ملال　　رکھو دلھن کی پیٹھ پہ ہاتھ اے حسن کے لال

واری بس اب اٹھو کہ پریشاں ہے میرا حال　　کیسا یہ خواب ہے کہ دلھن کا نہیں خیال

کروٹ تو لو کہ ماں کے جگر کو قرار ہو

اس بچپنے کی نیند کے اماں نثار ہو

یہ اشعار ثابت کرتے ہیں کہ انیسؔ ماں کی فطرت کے اس نازک حسین جذبے سے آگاہ ہیں کہ وہ اپنے سے چھوٹوں کے صدمے کی وجہ سے مامتا کی تڑپ تک چھپا لیتی ہے اور ان کی تسلی میں لگ جاتی ہے ! یہ پاک جذبہ ہم اکثر اپنی گرد و پیش کی دنیا میں بھی دیکھ سکتے ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ قاسم کی لاش پر جو دلخراش بین سنائی دیتے ہیں وہ آواز ماں کی نہیں دلہن کی ہے ۔

فاطمہ کبریٰ[1] امام حسینؑ کی نوعمر بیٹی ہیں جو ایک رات کے لیے دلھن بنیں اور صبح کو بیوہ ہو گئیں ۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے ۔ انیسؔ کے یہاں اور مرثیوں کے پس منظر میں بھی ہندوستانی تہذیب و رسم و رواج ملتے ہیں ۔ خواتین کے کردار ، روزمرّہ بول چال وغیرہ میں اس کی جھلک مردانے کرداروں سے زیادہ نظر آتی ہے ۔ لیکن اپنے زمانے کے اور اپنے پیش رَو مرثیہ نگاروں کے مقابلے میں (مثلاً میر ضمیرؔ اور مرزا دبیرؔ وغیرہ) بہت کم ہے ۔

---

[1] امام حسین کی بیوی یعنی قاسم کی ساس ۔

ان لوگوں کے ہاں اس معاملے میں غلو بہت زیادہ ہے۔ انیسؔ کے یہاں بس رنگ نکھارنے اور درد و اثر بڑھانے کے لیے ہندوستانی رنگوں سے مدد لی جاتی ہے۔ ان کی عرب عورت ایک خاص شان اور انداز رکھتی ہے جو باوجود ہندستانی رنگ و روپ کے پہچانی جاسکتی ہے۔ مگر قاسم اور فاطمہ کبریٰ کی شادی بیاہ کے تذکروں میں وہ مبالغہ اور شدت سے اپنے کلام کو نہ بچاسکے۔ فاطمہ زہرا کی شادی کی سادگی کی جو نقشہ کشی انیسؔ نے کی ہے۔ اس کے بجائے یہاں وہ دھوم دھام نظر آتی ہے، جیسے آپ دلّی، لکھنؤ کی کسی محفل میں آگئے ہوں۔

فاطمہ کبریٰ کے کردار میں بھی ہمیں عرب کی حوصلہ مند، بہادر اور سادہ لڑکی نہیں ملتی۔ بلکہ شرم و حیا کی پوٹ، رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑی پرانے زمانے کی کوئی ہندوستانی لڑکی سامنے آتی ہے۔ ریت رسمیں، دولھا دلھن کی بات چیت، دلھن کا حجاب گھونگھٹ، دولھا کی لاش پر اس کے بین سبھی خالص ہندی ہیں۔

یہاں مبالغہ آٹے میں نمک کی طرح زیبِ داستان کے لیے نہیں بلکہ اکثر جگہ حد سے زیادہ ہے۔ اور تاریخی و مذہبی نقطۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالی جائے تو بجا طور پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ جہاں تک شاعرانہ حُسن و فنکاری کا تعلق ہے۔ انیسؔ پوری طرح کامیاب ہیں۔ اور درد و اثر جو اس کہانی کا بنیادی مقصد ہے اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ دو چار جگہ سے مثالیں پیش کروں گی۔ جن سے میرا اعتراض و تعریف دونوں کا ثبوت مل جائے گا۔ قاسم رخصت ہونے کے لیے دلھن کے پاس آتے ہیں

آنکھوں میں اشک، درد کلیجے میں، دل اُداس
یہ کہہ کے آئے سر کو جھکائے دلھن کے پاس
سب مرگئے عزیز شہنشاہِ حق شناس
فرمایا ہم کو ہائے یہ شادی نہ آئی راس
بستی تمام لٹ گئی ویرانہ ہوگیا
شادی کا گھر جو تھا وہ عزاخانہ ہوگیا

سارے واقعات بیان کر کے اپنی رخصت کی راہ ہموار کرتے کرتے کہہ اٹھتے ہیں ؎

صاحب ہیں سپردِ عروسِ اجل کرو مشکل کشا کی پوتی ہو مشکل کو حل کرو
گھونگھٹ اٹھا کے ہم کو دکھاؤ تو رخ کا نور پاس اب نہ آسکیں گے کہ ہوتے ہیں تم سے دور
چپکی یونہی رہو گی تنِ پاش پاش پر
کیا بین بھی کرو گی نہ دولھا کی لاش پر

دلھن کی جو شبیہہ ابھر رہی ہے وہ مشکل کشا کی پوتی کی نہیں، کسی دلی لکھنؤ کی نازوں کی پالی ارمانوں سے بیاہی گئی۔ رئیس زادی کی تصویر معلوم ہوتی ہے ؎

خاموش تھی گھونگھٹ میں دلھن صورتِ تصویر دولھا کا سخن سن کے کلیجے پہ لگا تیر
چاہا کہ کہے کاش ہماری اجل آئے
کچھ منہ سے نہ نکلا مگر آنسو نکل آئے

یہاں تک کی کیفیت تو عام انسانی جذبات کی ہے مگر آگے چل کر ؎

رنگ اڑنے لگا چھا گیا چہرے پہ رنڈاپا
تصویر بنی غم کی دولھن بن کے سراپا پیشانی کا صندل بھی ہوا خاک کا چھاپا
پوشاک سے پیدا تھا کہ رنڈ سالہ ہے تن میں
کنگنے سے یہ ثابت تھا کلائی ہے رسن میں

آنکھوں سے رنڈاپے کا نظر آگیا ساماں سینے پہ چلی وصل میں تیغ غمِ ہجراں
خود ہو گئے سب گوندھے ہوئے بال پریشاں ماتھے سے ستاروں کی جگہ گر گئی افشاں
وہ رشکِ چمن غم سے جو سر گرمِ فغاں تھی
ہر آہ میں سہرے کے بھی پھولوں پہ خزاں تھی

اور یہی نہیں بلکہ ؎

کچھ منہ سے نہ کہہ سکتی تھی وہ ناز کی پالی یہ ہونٹ چبائے کہ اڑی پان کی لالی

آپڑتے تھے اشک آنکھوں سے رخسار پہ ڈھل کے　　رہ جاتی تھی وہ منہدی لگے ہاتھوں کو مل کے

ابھی اور دیکھیے :-

زانو پہ جھکا جاتا تھا سر شرم کے مارے　　سینے سے نکل جاتے تھے آہوں کے شرارے
وہ کہتی تھی اب ناک سے نتھ کوئی اتارے　　رو رو کے سکینہ سے یہ کرتی تھی اشارے
اس تاش کے جوڑے کو بس اب آگ لگا دو
سادے ہوں جو کپڑے وہ مجھے لا کے پنہا دو

ماتھے کے ستارے، سہرے کے پھول، مہندی لگے ہاتھ، پان کی لالی، ناک کی نتھ، تاش کا جوڑا، زانو پہ جھکا ہوا سر، اور اشارے سے بہن سے بات کرنا انیسویں صدی کی ہندی دلھن کی مکمل تصویر سامنے لے آتا ہے۔ میں انیسؔ کے کلام کی دلدادہ سہی مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ یہاں وہ درد و اثر پیدا کرنے میں بھی زیادہ کامیاب نہیں۔ ہاں آگے چل کے جب قاسم اور کبریٰ کی بات چیت دکھاتے ہیں اس میں جذباتی مصوری اور سچے درد و غم کی لہریں موجود ہیں ؎

کچھ بات کرو ہم سے کہ فرصت ہے بہت کم　　راحت ہے خوشی سے جو گزر جائے کوئی دم
اک آن میں صحبت یہ کہاں اور کہاں ہم　　ہو جائے گا شادی کا مکاں خانۂ ماتم
زندانِ مصیبت تمھیں رونے کو ملے گا
اور گوشۂ تربت ہمیں سونے کو ملے گا

پھر دلھن سے یہ کہنا کہ ادھر تمھاری محبت روک رہی ہے ادھر فرض بلا رہا ہے کتنا فطری ہے اور انداز کتنا درد بھرا ؎

یاں پاسِ محبت ہے تو واں جائے ادب ہے　　فرقت بھی قیامت ہے نہ جانا بھی غضب ہے
ہوں کس سے جدا کس پہ تصدق کروں سر کو
الفت تو اِدھر کھینچے ہے اور موت اُدھر کو

آگے چل کر تو انیسؔ نے غضب ہی کر دیا ہے۔ ابن حسن قاسمِ جرّار کو دلھن کے پاؤں پر سر رکھتا ہوا دکھا دیا۔ ماحول کا اثر بعض وقت کس قدر ہوتا ہے۔

فاطمہ کبریٰ کو آخر کار بولنا ہی پڑا۔ آہستہ کہا آہ یہ تقدیر ہماری"

سمجھی ہیں، بہ بس مجھ کو نہ سمجھائیے صاحب
کیا زور مرا خیر چلے جائیے صاحب

ہے آپ کو منظور مرا رانڈ بنانا
راس آیا نہ صاحب کو مجھے بیاہ کے لانا

آنا مرا اور آپ کا سر دینے کو جانا
روکوں تو کہوگے مرے کہنے کو نہ مانا

اتنا تو کہے جاؤ کہ کب ہوگی ملاقات
دولھا نے کہا حشر میں اب ہوگی ملاقات

آخر قاسم میدان جنگ میں جاتے ہیں۔ شجاعت کے جوہر دکھاتے دکھاتے جامِ شہادت پی لیتے ہیں اور امام حسینؑ داماد کا زخموں سے چور چور لاشہ خیمے میں لاتے ہیں۔ سارا خاندان بے قرار ہے سب سے زیادہ ماں پر اثر ہے اور ایک رات کی بیاہی بیوہ کی زبان سے عالمِ بے قراری میں جو فقرے نکل کر شعروں میں ڈھل گئے ہیں۔ وہ بڑے پر اثر اور فطری رنج و غم کے ترجمان ہیں ؎

صاحب بتا تو دو تمھیں رونے میں کیا کہوں
بیکس کہوں کہ فدیۂ راہِ خدا کہوں

پیاسا کہوں، شہید کہوں یا بنا کہوں
دولھا کہوں کہ قاسمِ گلگوں قبا کہوں

ماتم بھی یوں تو ہوتا ہے شادی بھی ہوتی ہے
اک شب کی رانڈ دولھا کو کیا کہہ کے روتی ہے

مگر یہ شادی و بیوگی، یہ وصال و فراق، یہ درد و الم پر اثر سہی مگر یہ کسی داستان کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔ واقعاتِ کربلا سے ان کا پیوند کسی طرح نہیں جڑتا۔ دوسرے موقعوں پر انیسؔ جو جذبات اور احساسات دکھاتے ہیں، ان میں ہمہ گیری ہے، آفاقیت ہے۔ یہاں تصنع اور آورد ہے۔ مقامی رنگ بھی اتنا غالب آگیا ہے کہ اس میں وہ گہرائی اور تاثیر

پیدا نہیں ہوتی جو انیسؔ کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ نہ انیسؔ کا خاص رنگِ سخن ہے اور نہ اس سے ہم ان کے کلام کو ناپ سکتے ہیں ۔ البتہ خاندانِ نبوّت کی عورتوں کی سیرت کا یہ پہلو بڑی خوبی سے اجاگر کیا گیا ہے کہ ساس بہو کے رشتے میں بھی محبت اور خلوص ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہ بیوہ ماں اور ایک رات کی بیاہی دلھن نے کس عزم سے قاسم کو حسینؑ پر قربان کر دیا ۔

———— : : ————

ہجراں نصیب بیٹی
فاطمہ صغریٰ

تاریخِ کربلا میں امام حسینؑ کی تین بیٹیوں کا نام نظر آتا ہے۔ بڑی فاطمہ کبریٰ ہیں جن کا ذکر گذشتہ باب میں آچکا ہے۔ فاطمہ صغرا منجھلی صاحبزادی ہیں۔ اور سب سے چھوٹی بچی سکینہ۔

امام حسینؑ مدینے سے اس کرب و بلا کے سفر پر روانہ ہو رہے تھے تو فاطمہ صغریٰ بہت بیمار تھی۔ اس لیے مجبوراً اسے گھر پر چھوڑنا پڑا۔ بزرگ خواتین میں حضرت عباس کی والدہ امّ البنین اور ام المومنین امّ سلمہ، فاطمہ صغریٰ کے پاس تھیں۔

انیس نے حسینؑ کی ان تینوں بیٹیوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے اور ہر ایک کی شخصیت میں ایک انفرادی شان دکھائی ہے۔ کبریٰ کی بیوگی، سکینہ کی یتیمی، اور صغریٰ کی باپ سے جدائی ہر ایک کی اپنی اپنی جگہ بڑی خوبی سے مرقع کشی کی گئی ہے۔

فاطمہ صغریٰ کی عمر روایات میں کہیں نہیں بتائی گئی۔ انیس نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ مگر بات چیت کا انداز، خفگی اور شکایت کی ادا ہر بات یہ ثابت کرتی ہے

کہ وہ عمر کی اس منزل سے گذر رہی تھی جب بچپن اور جوانی گلے ملتے ہیں۔ بچپن کا بھولا پن رخصت ہو چکا ہے۔ مگر جوانی کی پختگی ابھی نہیں آئی۔ خاندان سے جو گہری محبت ہے اس میں جذباتی کشمکش، شدت پسندی اور نوجوانی کا احساسِ ذات صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی طویل بیماری کے سبب جو نازک مزاجی اور احساسِ بے بسی پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی سے مایوسی اور خود پر رحم کھانے کی عادت ابھر آتی ہے، باریک بین فنکار نے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مگر ان سب احساسات و جذبات کے پس منظر میں جو شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ ایک ایسی الھڑ لڑکی کی ہے جو باپ کی عاشق، بھائیوں کی فدائی، کنبے کی چاہنے والی اور بہر حال بزرگوں کی مرضی پر سر جھکانے والی ہستی ہے۔ باپ، بیٹی کی رخصتی اور خاندان سے جدائی کا سماں جہاں جہاں انھوں نے کھینچا ہے لاجواب ہے۔ یہاں ان کی مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری دونوں اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔

امام حسینؑ کا رختِ سفر بندھ چکا، روانگی کا وقت آگیا مگر یہ سب باتیں بیمار بیٹی سے چھپائی جارہی ہیں (یہ بھی ہندوستانی تہذیب و انداز سمجھنا چاہیے)۔ وہ بیٹی کو ضعیف نانی ام سلمہ اور سوتیلی ماں ام البنین کے سپرد کر کے جارہے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ بیٹی سے چھپ کر روانگی ہو جائے۔ جب اہلِ حرم کے اونٹوں پر سوار ہونے کا وقت آتا ہے تو صغرا کی بدنصیب ماں گھبرا کر کہتی ہے ؎

غش ہو گئی ہے فاطمہ صغریٰ مری پیاری

اور دل کی یہ تڑپ کہ ؎

اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

ماں کی دل کی حالت کا بے ساختہ بیان ہے۔ ادھر حسینؑ کے ساتھ جانے والی بہنیں کبریٰ اور سکینہ بھی بہن کی جدائی اور اس کے تنہا رہ جانے کے خیال ہی سے بے قرار ہیں ؎

چلّاتی تھی کبریٰ کہ بہن آنکھیں تو کھولو کہتی تھی سکینہ کہ بہن منہ سے تو بولو

یہ چھوٹی بچی ہے مصلحت نہیں سمجھتی، جو بات ہے بے دھڑک کہہ اٹھتی ہے ؎

ہم جاتے ہیں تم اٹھ کے بغلگیر تو ہو لو چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو

افسوس اسی طور سے غفلت میں رہو گی

کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی

بیمار بچے سے ماں باپ کو کچھ زیادہ ہی الفت ہوتی ہے۔ امام حسینؑ بھی صغرا کو بہت چاہتے ہیں اور اس کو یوں چھوڑ جانا ان پر بڑا شاق ہے۔ مگر مقصد کی لگن ہر جذبہ محبت پر غالب ہے لیکن بشریت کا یہ تقاضا ہے کہ بچی کا حال سن کر بے قرار ہو جائیں ؎

سن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے

منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ یہ لائے کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس کو بچائے

جس صاحبِ آزار کا یہ حال ہو گھر میں

دانستہ میں کیونکر اسے لے جاؤں سفر میں

معذرت کا انداز بتا رہا ہے کہ بیوی کی مامتا کی جلن کا بھی احساس ہے ؎

کہہ کر یہ سخن بیٹھ گئے سیّد خوشخو اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو

بیمار نے پائی گُلِ زہرا کی جو خوشبو آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو

ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں اماں

کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں اماں

اندازہ ہو چکا ہے کہ باپ مع کنبے کے سفر پر جا رہے ہیں اور بیماری کے سبب میں ساتھ نہیں لے جائے جا رہی ہوں۔ مگر اس عمر میں دل کی بات بے دھڑک کہہ دینے سے جو جھجک اور شرم مانع ہوتی ہے اس نے اب تک خاموش رکھا تھا مگر اب کہ سفر پر روانگی کا وقت آ گیا ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں ؎

وہ کون سا ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
کھل کر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا

چاروں طرف دیکھتی ہے گھر اجاڑ اور ویران نظر آتا ہے تو اپنے سوالوں کا جواب خود ہی دینے لگتی ہے ؎

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیے باہر — نے فرش نہ ہے مسندِ فرزند پیمبر
دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر — اجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر

ٹیپ کا بند پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ سچ مچ مریضہ کا کلیجہ پھٹ جائے گا ؎

کچھ مجھ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبطِ پیمبر سے وطن چھٹتا ہے اماں

اب امام حسینؑ کے لیے اس کے سوا کیا چارہ رہ جاتا ہے کہ بیمار بیٹی کو حال بتا دیں ؎

بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیدِ مظلوم — پردہ رہا کیا اب تمھیں خود ہو گیا معلوم

تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغرا
ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغرا

لڑکی کو ساری بات نہ بتائی جا سکے مگر اشاروں میں کچھ نہ کچھ تو سمجھانا ہی پڑے گا کہ وہ اس صدمۂ عظیم کو سہارنے کی قوت پیدا کرے۔ جانتے ہیں خاندانِ نبوت کی بچی ہے راضی برضا رہنا اس کی گھٹی میں ہے ؎

اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار — میں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحبِ آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں ہو جو بیمار — تکلیف تمھیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار

غربت میں بشر کے لیے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

بچی کو یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ صحرائے عرب کا یہ سفر کیسا کٹھن ہے ؎

لُو چلتی ہے، خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایّام
جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام
دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام

صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گذر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

مگر عاشق بیٹی یہ سب کیا سمجھے۔ اسے تو صرف یہ احساس ہے کہ سارا کنبہ اُسے بیمار سمجھ کر چھوڑے جا رہا ہے اور اس کے لیے یہ جدائی ہے سب سے بڑا آزار ہے۔ یہ بیماری عارضی ہے مگر باپ بھائیوں کی جدائی جان لیوا ثابت ہوگی کیسی کیسی دلیلیں دی جا رہی ہیں۔ کیسی کیسی خوشامدیں کی جا رہی ہیں، کہ بابا ساتھ لے جانے پر تیار ہو جائیں ؎

صغریٰ نے کہا کھانے سے خود ہے مجھے انکار
پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار

گرمی میں بھی راحت سے گذر جائے گی بابا
آئے گا پسینہ تپ اتر جائے گی بابا

کیا تاب اگر منہ سے کہوں، درد ہے سر میں
اف تک نہ کروں، بھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں گی سفر میں
قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں

ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغریٰ
یاں نیند کب آتی ہے جو واں سوئے گی صغریٰ

وہ بات نہ ہووے گی جو بے چین ہوں مادر
ہر صبح میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر

طرح طرح سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ میں کسی پر بار نہ ہوں گی۔ کسی کو میری وجہ سے کوئی تکلیف یا پریشانی نہ اٹھانی پڑے گی۔ اتنا ہی نہیں میں سفر میں مدد اور کام بھی کر سکتی ہوں ؎

دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر
لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر

پھر بے قراری کے عالم میں باپ سے یہ کہنا ؎

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو　　　بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

ہر ہر لفظ باپ کے کلیجے پر نشتر بن کر یہ چبھ رہا ہے ؎

شہ بولے کہ واقف ہے مرے حال سے اللہ　　　میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہے جو راہ
کھل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ　　　ایسا بھی ہے کوئی جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغریٰ
ہے مصلحتِ حق یہی جو کہتا ہوں صغریٰ

پھر بے اختیار محبت کے کلمات منہ سے نکل جاتے ہیں ؎

اے نورِ بصر آنکھوں پہ لے کر تجھے چلتا　　　تو مجھ سے بہلتی، مرا دل تجھ سے بہلتا

مگر کیا کروں ؎

تپ ہے تجھے اور غم سے جگر ہے مرا جلتا　　　یہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا
جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
دانستہ تمہیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا

باپ کی طرف سے مایوسی ہوتی ہے تو صغرا ماں کی خوشامد کرتی ہے مگر ماں یہ کہہ کر ؎

وہ درد ہے جس درد کا چارا نہیں صغرا　　　تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

خاموش ہو جاتی ہے تو بیٹی کے لب پر شکوہ آتا ہے۔ کتنا درد اور مایوسی ہے ان چند لفظوں میں ؎

بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا　　　سچ ہے کوئی مُردے سے محبت نہیں کرتا

مگر پھوپھی زینب کے منہ سے یہ سن کر ؎

مر جانے سے کچھ کم نہیں صغرا کی جدائی

امید کی ذرا سی کرن نظر آتی ہے۔ بابا بھی تو پھوپھی جان کو بہت مانتے ہیں ؎

تم جان بچالو کہ میں لونڈی ہوں پھوپھی جان　　　بیٹی ہو علی کی مری مشکل کرو آسان

سب اشکبار ہیں، بے چین ہیں مگر چپ ہیں۔ بیمار ایک ایک کا منہ دیکھ رہی ہے اور سمجھتی ہے کہ بیماری کی وجہ سے سب مجھ سے کترا رہے ہیں۔ شکایت کا کتنا دردناک مگر کیسا فطری انداز ہے ؎

بابا کو نہ اماں کو نہ بہنوں کو مری چاہ | سب جیتے رہیں، خیر ہمارا بھی ہے اللہ

اور پھر کس حسرت سے کہتی ہے ؎

جب قبر میں ہم ہوں گے تو سب یاد کریں گے

کیا خلق میں لوگوں کو نہیں ہوتا ہے بیمار | ہے کون سی تقصیر جو سب ہو گئے بیزار
زندہ ہوں پہ مرنے کی طرح ہو گئی دشوار | کیوں بھاگتے ہیں سب مجھے ہے کونسا آزار

حیرت میں ہوں باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا
وہ آنکھ چرا لیتا ہے منہ تکتی ہوں جس کا

ساتھ جانے والوں کا دکھ، شرمندگی اور بے بسی کی وجہ سے "آنکھ چرانا"، یہاں نگینے کی طرح سے جڑ گیا ہے۔ جوں جوں مایوسی بڑھتی ہے۔ صغریٰ کی شکایت میں تلخی اور طنز پیدا ہوتا جا رہا ہے ؎

بیماریِ مزمن کی دوا خوب ہوئی ہے | تجویز مرے واسطے کیا خوب ہوئی ہے
تنہائی میں رونے سے اتر جائے گی یہ تپ | ہاں درد بھی سر میں مرے ہوئیگا نہیں اب
تڑپوں گی تو جائے گی یہ اعضا شکنی سب | بہتر یہی ترکیب ہے نسخہ یہی انسب

کم ہو گی حرارت الم و رنج و محن میں
غم کھانے سے آجائے گی طاقت مرے تن میں

تنہائی میں شدت بھی نہ ہو گی خفقاں کی | بیمار کا دل بہلے گا وحشت سے مکاں کی
تڑپوں گی نہ فرقت میں امامِ دوجہاں کی | شفقت مجھے یاد آئے گی بہنوں کی نہ ماں کی

جیسے بے اختیاری میں یہ طنزیہ جملے منہ سے نکلتے ہیں مگر پھر وہی شکایتی اندازِ بیان

آجاتا ہے جس میں محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے ے

بابا کی یہ تقریر ہے بہنوں کی یہ صورت
سب چاہنے والے ہیں کروں کس کی شکایت
بولیں نہ پھوپھی جان بھی کچھ واہ ری قسمت
چھوڑا ہمیں بس دیکھ لی اماں کی محبت

اور پھر آخر میں بے قراری کے ساتھ یہ کہنا

سب اچھے ہیں لوگو مری تقدیر بری ہے

مرقع کشی کی تکمیل کر دیتا ہے۔

صغرا اور علی اکبر اوپر تلے کے بہن بھائی ہیں اور شاعر جانتا ہے کہ ایسے بھائی بہنوں میں بڑی ہی بے تکلفی کی محبت ہوتی ہے جس میں جھگڑا، چھیڑیں، شکایتیں، پیار، روٹھنا، منانا سب ہوتا رہتا ہے۔ اس کا تخیل ان دونوں بہن بھائی کی ایسی ہی محبت کا جلوہ دیکھتا ہے۔ اور اس کا جادو نگار قلم بڑے حسن سے اسے دکھاتا ہے۔

علی اکبر سفر کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور شاید اس لیے بھی گھر میں نہیں آتے ہیں کہ چہیتی بہن کی جدائی کی تاب نہ لا سکیں گے۔ مگر صغرا کو اس میں بے اعتنائی اور بے رخی نظر آتی ہے۔ جس ہستی پر اسے سب سے زیادہ ناز ہے جس پر سب سے زیادہ اپنا حق سمجھتی ہے، جو کنبے میں اس کا سب سے زیادہ چاہنے والا سمجھا جاتا ہے اس نے بھی رخ پھیر لیا۔

اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر
ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر
وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صحن سے باہر

پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نے بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

مگر جب بھائی بہن سے رخصت کے لیے آتا ہے ے

یاں ذکر یہ تھا آئے جو روتے ہوئے اکبر
سرخ آنکھیں تھیں اور زرد تھا غم سے رخِ انور

تو سارے گلے شکوے غائب ہو جاتے ہیں اور وہ گہری پاک اور بے لوث محبت باقی رہ جاتی ہے جو صرف بہن کا حصہ ہے ؎

چلائی بہن بھائی کی چھاتی سے لپٹ کر ۔۔۔ اس سینے کے ان ہاتھوں کے قربان یہ خواہر

فریاد ہے بے موت بہن مرتی ہے بھائی

تقدیر ہمیں تم سے جدا کرتی ہے بھائی

اس نازک فرق کو دیکھیے ۔ باپ سے شکایت ہے اصرار ہے کہ جانتی ہے کہ لے جانے یا چھوڑ جانے کے مختار وہ ہیں ۔ بھائی سے بس تقدیر کا گلہ کر کے رہ جاتی ہے ۔ بھائی کا رونا نہیں دیکھا جاتا الٹی اسے تسلی دی جا رہی ہے ۔

بھیا مری تنہائی پہ آنسو نہ بہاؤ ۔۔۔ وہ دن ہو کہ پھر خیر سے اس شہر میں آؤ

ہر چند یہ مشکل ہے کہ جیتا ہمیں پاؤ ۔۔۔ صدقے گئی پھر آنے کا وعدہ کیے جاؤ

عرصہ ہو تو خط لکھ کے طلب کیجیو بھائی

اب بیاہ میں مجھ کو نہ بھلا دیجیو بھائی

علی اکبر شادی کا ارمان انیسؔ خاندان کے ہر فرد کے دل میں دکھلاتے ہیں ۔ ماں، پھوپھی باپ سبھی اس کے آرزومند ہیں ۔ صغرا کو سب سے زیادہ بھائی کے بیاہ کی تمنا اور بھاوج لانے کی بے قراری ہے ۔ بے چین ہے کہ کہیں پردیس میں بابا اور اماں بھیا کا بیاہ نہ رچا لیں اور میری حسرت دل کی دل میں رہ جائے ۔ کیسے کیسے انداز میں آرزو حسرت کا اظہار ہے ۔

وہ دن ہو کہ بوٹا سی تمہاری دلھن آئے ۔۔۔ جلدی کہیں یا حضرتِ باری دلھن آئے

سب پھولوں کے گہنوں سے سنواری دلھن آئے ۔۔۔ تم جیسے ہو بس ویسی ہی پیاری دلھن آئے

ہمشیر کو تربت میں نہ تڑپائیو بھائی

بھابی کو مری قبر پہ لے آئیو بھائی

باتیں کرتے کرتے پھر یاد آجاتا ہے کہ جدائی کی قیامت خیز گھڑی قریب ہے :-

کیا گذرے گی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی — کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی
تشریف خدا جانیے کب لاؤ گے بھائی — کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی
کیا دم کا بھروسہ کہ چراغِ سحری ہیں
تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں

مرنا تو مقدم ہے غم اس کا نہیں زنہار — دھڑکا ہے کہ جب ہونگے عیاں موت کے آثار
قبلے کی طرف کون کرے گا رُخِ بیمار — یٰسین بھی پڑھنے کو نہ ہوگا کوئی غمخوار
سانس اکھڑے گی جس وقت تو فریاد کرونگی
میں ہچکیاں لے لے کے تمھیں یاد کرونگی

آخری بند میں اپنی حالت کا بیان کرکے بھائی اور باپ کے دل میں اپنی حالت پر رحم دلاکر پھر ایک بار ساتھ لے جانے کی چھپی ہوئی کوشش شامل ہے۔ لیکن گریہ و زاری، شکوہ و شکایت کچھ بھی کارگر نہیں ہوتی۔ باپ مجبور ہیں کہ ایسی بیمار بچی کو سفر میں ساتھ لے جانا مناسب نہیں۔

شبیر نے رو کر کہا لو جاتے ہیں صغرا — جلد آتے ہیں یا خود تمھیں بلواتے ہیں صغرا
ہم سب تری تنہائی کا غم کھاتے ہیں صغرا — جاں اپنی نہ کھونا تمھیں سمجھاتے ہیں صغرا
قربان پدر آب و غذا ترک نہ کرنا
بڑھ جائے گا آزار دوا ترک نہ کرنا

اور پھر ـ

لپٹا کے گلے فاطمہ صغرا کو دوبارہ — اٹھے شہ دیں گھر تہ و بالا ہوا سارا
جس چشم کو دیکھا سو وہ پرنم نظر آئی
اک مجلسِ ماتم تھی کہ برہم نظر آئی

ماں بیٹی کی رخصت بہت مختصر مگر دونوں کی بے بسی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ماں کا دل بے قرار ہے۔ یہ بھی جانتی ہے کہ بیٹی سب سے زیادہ اس سے خفا ہے اور کمسنی کے باعث ماں کی مجبوری سمجھنے سے قاصر ہے۔ بس وہ اتنا کہنے پر اکتفا کرتی ہے۔

بیکس مری بچی ترا اللہ نگہبان
صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آن

ناقوں پہ حرم سوار ہو چکے۔ قافلہ روانہ ہونے والا ہے۔ بیمار و نزار صغرا ماں کی محمل کے قریب جا کھڑی ہوتی ہے تو ماتا کی ماری ماں اپنا غم چھپا کر بیٹی کو تسلی دینے کے لیے بس اتنا کہہ پاتی ہے۔

میں صدقے گئی اب نہ کرو گریہ و زاری
اصغر مرا روتا ہے صدا سن کے تمہاری

صغرا ننھے بھائی کا نام سن کر تڑپ جاتی ہے جسے گود میں کھلاتی تھی جس سے بیماری بہلتی تھی۔ اب اس کی صورت کو ترس جائے گی۔

وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری آ، اے مرے ننھے سے مسافر ترے واری

چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

چھوٹا بچہ اپنے بہن بھائی کی آواز یا صورت پہچاننے لگے تو کتنی خوشی ہوتی ہے۔ یہ بات ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے رہتے ہیں۔ صغرا سوچتی ہے کہ کاش ننھا بھائی ہی پاس رہ سکتا۔ مگر اماں یہ بھی کیوں مانیں گی۔

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی — تپ ہے تمھیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی — رکھ لوں تمھیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی

بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے

اور درد وغم کے اس مجسمے کو کھڑا چھوڑ کر حسینی قافلہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہونے لگتا ہے۔

مدینے سے امام حسینؑ مکے اور وہاں سے کوفے گئے۔ راستے میں یزیدی فوجوں نے روکا۔ کربلا میں معرکۂ حق و باطل برپا ہوا۔ عاشورِ محرم کو حسینؑ اپنے بہتر رفقا کے ساتھ شہید ہو گئے۔ اہلِ حرم قید ہو کر کوفے سے دمشق کی طرف لے جائے گئے۔ مگر بیمار صغرا ان سب واقعات سے بے خبر ہے۔ ہاں دل کی تڑپ نے مرض کی شدت میں اضافہ کر دیا ہے۔ باپ کی یاد، بھائیوں اور بہنوں کی جدائی، ماں کی مفارقت، خالی گھر، درد وغم نے بیکسی اور بے بسی کا زندہ مرقع بنا دیا ہے۔

جینے سے غمِ شاہ میں بیزار تھی صغرا ۔۔۔ تنہائی کی آفت میں گرفتار تھی صغرا
غش رہتا تھا اس طرح کی بیمار تھی صغرا ۔۔۔ ہوش آتا تو کرتی یہی گفتار تھی صغرا

کہتے تو ہیں سب کر رہی ہو کیوں آئینگے بابا
غم یہ ہے کہ جیتا نہ ہمیں پائیں گے بابا

اپنی گرتی ہوئی حالت کا اندازہ ہے ؎

جینے نہیں دینے کا غمِ ہجر کا آزار ۔۔۔ بابا کے بھی آگے سے زیادہ ہوں میں بیمار
بستر پہ پڑی رہتی ہوں میں بیکس و لاچار ۔۔۔ اٹھتی ہوں گر اک بار تو گر پڑتی ہوں سو بار

آنکھیں ہیں کہیں، ہوش کہیں، دھیان کہیں ہے
کچھ دل بھی کئی روز سے کہنے میں نہیں ہے

پیاروں کی جدائی میں انسان جب بہت بیقرار ہو تو بعض وقت دل کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ کسی طرح بس ایک بار وہ صورت نظر آ جائے ؎

جی چاہتا ہے دیکھ لوں بابا کا میں دیدار
اماں کے گلے سے لگوں اصغر کو کروں پیار
بھائی علی اکبر کی بلائیں لوں میں بیمار
پھر مر بھی اگر جاؤں تو کچھ غم نہیں زنہار

جیتے جی موئی جاتی ہوں میں یادِ پدر میں
لے لے کے مرے نام کو سب روئینگے گھر میں

یہ نہیں سوچ سکتی کہ مسافروں پر کوئی مصیبت آئی ہے بلکہ خیال یہ ہوتا ہے کہ ان سے ملے بغیر اپنا دنیا سے سفر ہے اسی لیے دل کی تڑپ بڑھ گئی۔ جب حضرت ام سلمیٰ اسے سمجھاتیں اور صحت و زندگی کی دعا دیتی ہیں۔

میں زیست بسر کر چکی اب دن ہیں سفر کے
تم بچی ہو جیتی رہو سایے میں پدر کے

تو صغرا کے دل کے کسی گوشے میں جو چھپا ہوا خوف جاگزیں ہے وہ بے اختیار زبان پر آجاتا ہے۔

نانی نہیں مرنے کا مجھے خوف و خطر ہے
پردیس میں پردیسیوں کی جان کا ڈر ہے

لیکن بدشگونی کا یہ جملہ منہ سے نکلتے ہی فوراً پیاروں کی سلامتی کی دعائیں منہ سے نکلنے لگتی ہیں۔

دنیا میں رکھے حق علی اکبر کی جوانی

دل کو کیسے کیسے بہلاوے دیے جا رہے ہیں ؎

قاسم کے نہایت مجھے آنے کی خوشی ہے
اصغر کو کلیجے سے لگانے کی خوشی ہے

چچا عباس سے گلہ زیادہ ہے کہ وہ سکینہ کو اتنا چاہتے ہیں مگر اس کی پروا نہیں ؎

جیتے جی مرے آئیں جو عباس علمدار
جو دل میں گلے ہیں وہ کروں ان سے سب اظہار
ہر چند گرفتارِ غم و رنج و محن ہوں
جو آپ کی پیاری ہے اسی کی تو بہن ہوں

یہاں صغرا دیدار کی تمنا میں بے قرار ہے وہاں شہر میں حشر برپا ہے کہ سید سجاد رانڈوں اور یتیموں کو لے کر آئے ہیں اور جس وقت بیوہ ماں بچھڑی بیٹی کو باپ کے مرنے کی خبر سناتی ہے ؎

لے گود میں بانو اسے رو رو کے پکاری　　بابا کہاں میں جس کو دکھاؤں تجھے واری
پردیس میں جنت کو سفر کر گئے شبیر
اے فاطمہ میں رانڈ ہوئی مر گئے شبیر

ایسے اچانک اور سخت صدمے کی خبر کا قدرتی ردِ عمل تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ صغرا ساکت و ششدر رہ جائے یا تابِ ضبط نہ لا کر بے ہوش ہو جائے۔ لیکن یہاں انیس جیسے شاعر بھی رونے رلانے اور بین و گریہ کے مقصد کے پیش نظر ایسے موقع کی صحیح مرقع کشی نہیں کر سکے۔ وہ اسے سر پیٹتے روتے چلاتے دکھاتے ہیں۔ مگر اس گریہ و ماتم میں صغرا کی بے قراری و مایوسی ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی ہے ؎

ایسے گئے بابا کہ نہ جیتے پھرے گھر کو　　مایوس کیا دخترِ مجروح جگر کو
اب آس ہے اتنی کہ جو مر جائے گی صغرا
اے سیدِ بیکس تمھیں تب پائے گی صغرا

زندہ رہنے کی خواہش ختم ہو چکی ہے بس موت کی آرزو ہے جو بچھڑوں سے ملائیگی ؎

بیمار کو اس ہجر کی آفت سے نکالو
مجبور ہے صغرا تمھیں چاہو تو بلالو

معصومۂ کربلا
سکینہ

امام حسینؑ کی سب سے چھوٹی بچی جس کا نام امیمتہ تھا۔ لیکن ماں باپ جوشِ محبت میں سکینہ (تسکین دل کا باعث) کہتے تھے۔ سکینہ کی عمر واقعۂ کربلا کے وقت لگ بھگ چار سال بتائی جاتی ہے۔

امام حسینؑ کا دودھ پیتا بچہ علی اصغر (جو ظالموں کے تیروں سے روزِ عاشورہ شہید کیا گیا) اور معصوم سکینہ واقعۂ کربلا کے دو ایسے کردار ہیں جن میں درد والم مجسم ہو گئے ہیں۔ اور جن کی بارگاہ میں دنیا کے اہلِ دل حضرات صدیوں سے آنسوؤں کے موتی نذر کرتے آئے ہیں۔ صرف مسلمان یا مشرقی ملکوں کے لوگ ہی نہیں بعض مغربی اہلِ دل شاعروں نے بھی ان معصوموں کو خراجِ عقیدت و محبت پیش کیا ہے۔ مشہور فرانسیسی شاعر الیگزینڈر گفل کا نام اس سلسلے میں کافی مشہور ہے جس کی پر اثر، دل گداز، طویل نظم کا ترجمہ انگریزی اور اردو میں بھی ہو چکا ہے۔ اردو میں اس کا نام "معصوموں کا ستارہ" ہے۔ اس صاحبِ دل شاعر نے حسینؑ کے ان دونوں معصوم بچوں، علی اصغر و سکینہ اور ان کی ماں کی بارگاہ میں جس درد و گہری عقیدت کے ساتھ

خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مگر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ ہمارا موضوع وہ نظم نہیں انیس کی شاعری ہے۔

میر انیس نے ننھے بے زبان شہید علی اصغر کا ذکر جہاں کہیں کیا ہے اس انداز سے کہ سننے والے تڑپ اٹھتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ علی اصغر کے ذکر میں نہ کردار نگاری کی گنجائش تھی نہ جذبات نگاری کی۔ (اگرچہ انیس نے کہیں کہیں یہ کمال بھی دکھایا ہے) لیکن سکینہ بنتِ حسینؑ کا کردار انھوں نے ایسے باکمال انداز میں دکھایا ہے جس کا جواب شاید دنیا کی شاعری میں ڈھونڈے سے نہ مل سکے۔

سکینہ گھر کی سب سے چھوٹی بچی، باپ چچا کی چہیتی، بہن بھائیوں کی پیاری، پھوپیوں اور ماں کی دلاری ہے۔ اس نے ورثے میں وہ سب خوبیاں پائی ہیں جو فاطمۂ زہرا کی پوتی اور حسینؑ کی بیٹی کو مل سکتی تھیں۔ اس پر ماں اور پھوپھی، باپ اور چچا کی تربیت سونے پر سہاگہ بن گئی۔ کلامِ انیس میں وہ ایک بے حد لاڈلی مگر انتہائی ذہین اور صالح بچی کے روپ میں ابھرتی ہے۔ اس کی دو تصویریں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ شروع میں وہ ایک ایسی بچی ہے جو باپ چچا پر ناز کرتی اور لاڈ کراتی ہے۔ ماں اور پھوپھی سے ضدیں پوری کراتی اور اس سفر کی مصیبتوں اور مشکلوں پر حیران و پریشان نظر آتی ہے۔ لیکن جوں جوں کربلا کی خونیں داستان کے ورق پلٹتے ہیں بچی پر مصائب اور غم کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں۔ اس میں سنجیدگی، برداشت اور پختگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اور یہ کوئی ان ہونی بات نہیں۔ زندگی کا گہری نظر سے مشاہدہ کرنے والے اور سیرت کی باریکیوں کو سمجھنے والے یہ بات آسانی سے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں کہ جن بچوں کو کٹھنائیوں اور ذمہ داریوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ حساس، ذمہ دار، اور سمجھ دار ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں ان میں پختگی اور حالات کو سمجھنے اور سہارنے کی صلاحیت بھی اپنے ہم عمر بچوں سے زیادہ پیدا

ہو سکتی ہے۔ سکینہ کا کردار جس انداز میں، شروع میں سامنے آتا ہے اور پھر جس طرح دھیرے دھیرے ابھرتا ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ انیسؔ اس حقیقت کے رمز شناس ہیں۔ پھر یہی نہیں، یہ بچی کبھی ننھی معصوم بچیوں کی طرح بھولی بھولی باتیں کرتی ہے کبھی بوڑھوں کی سی، کبھی وہ باپ چچا کی موت پر گریہ و ماتم کرتی نظر آتی ہے اور کبھی سب بھول کر نئے سرے سے ماں اور پھوپھی سے ضد کرتی ہے کہ میرے بابا کہاں ہیں انھیں بلا دو۔

چھوٹے بچوں کی یہ کیفیت عام طور پر اپنے کسی پیارے بزرگ کی موت کے بعد اکثر ایسی ہو جاتی ہے جس کو روزمرہ کی زندگی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بہرحال ایک بات شروع سے آخر تک انیسؔ کے پیش نظر رہتی ہے، کہ یہ بچی خاندانِ رسالت کی بچی ہے۔

جب امام حسینؑ صعوبتیں جھیلتے ہوئے سفر کی منزلیں طے کر رہے ہیں کیسا سفر؟

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہِ سخت
پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت

اور موسم کیسا ہے؟

چلتی ہے لُوں حرارتِ خورشید ہے دو چند
مرجھا گئے ہیں نخل ہوا میں ہے یہ گزند
جھیلوں میں ہیں درند درختوں پہ ہیں پرند
ہے دھوپ میں رسول کا فرزندِ ارجمند
غربت میں بےکسی ہے شہِ دیں پناہ پر
سایہ ہے آفتاب کا زہرا کے ماہ پر

بچے اور عورتیں جو اونٹوں پر رکھی محملوں میں سوار ہیں گرمی اور پیاس سے بےحال ہیں۔ ماؤں کو بچوں کی جان کی فکر مارے ڈال رہی ہے ؎

اہلِ حرم ہیں محمل و ہودج میں بےقرار
معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ یا شاہِ نامدار
گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفلِ شیرخوار
کیوں کر یہ دکھ اٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

اس وقت ننھی سکینہ سب سے زیادہ بے چین نظر آتی ہے۔ چچا کی بے حد لاڈلی ہے اس لیے پریشانی کا اظہار بھی انھیں سے ہو رہا ہے ؎

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا　　محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہدو اب کہیں خیمے کریں بپا　　ٹھنڈی ہوا میں لے کے چلو تم پہ میں فدا

سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ چاہ ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت تباہ ہے

آخری مصرع میں بچوں کا شکایتی انداز کتنی خوبی سے پیش کیا گیا ہے بچی یہ جانتے ہوئے بھی کہ نہ کہیں سایہ ہے نہ کنواں ہے نہ پانی کا چشمہ ہے شکایت کا ایک پہلو نکال ہی لیتی ہے کہ تم تو ہوا میں ہو، میری حالت کیا سمجھو گے؟

۲ محرم کو کربلا میں دریائے فرات کے کنارے امام حسینؑ خیمے نصب کراتے ہیں۔ لیکن دشمن کی فوج مانع ہوتی ہے لشکر حسینی کے سپہ سالار عباس مقابلہ کرنا چاہتے ہیں بہنیں بھاوجیں، بھائی اور بھتیجی سب ان کی طرف سے فکرمند ہیں جب امام انھیں لے کر خیمے میں داخل ہوتے ہیں تو ہر ایک اپنے اپنے انداز میں اظہار شکر و مسرت کرتا ہے۔ سکینہ کی اس وقت کی حالت انیسؔ یوں دکھاتے ہیں ؎

منہ رکھ کے منہ پہ بالی سکینہ نے یہ کہا　　عاشق کو میرے پھیر کے لایا مرا خدا
روتی تھی میں سنی بھی نہ تم نے مری صدا　　بس اب کہیں نہ جائیو اچھے مرے چچا

اس بیکسی میں دلبر زہرا کا کون تھا
آتے نہ تم تو پھر مرے بابا کا کون تھا

شروع کے چار مصرعوں میں بچی کی کیفیت اور الفت کی بڑی خوبی سے ترجمانی کی گئی ہے اگرچہ لفظ "عاشق" ننھی بچی کے منہ سے عجیب لگتا ہے اور ٹیپ کا شعر تو کسی باشعور لڑکی کے منہ ہی سے زیب دے سکتا ہے۔ کہیں کہیں میر انیسؔ کے کلام میں

یہ خامی ہمیں ملتی ہے کہ وہ کردار کی عمر یا رشتے کا خیال کیے بغیر اپنے خیالات اس کے منہ سے ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کے ہزاروں لاکھوں شعروں میں ایسے اشعار بہت کم ہیں۔

واقعات آگے بڑھتے ہیں۔ حسینؑ کی صلح کی کوششیں ناکام ہوتی ہیں۔ دشمنوں کے ستم بڑھ رہے ہیں۔ حسینی قافلے پر کھانا پانی بند ہو جاتا ہے۔ بڑے تو یہ سب حوصلے سے سہار رہے ہیں، مگر بچوں کی حالت تباہ ہے۔ فضہ، کنیزِ زہرا ایک موقع پر کہتی سنائی دیتی ہے ؎

دو جانیں تلف ہوتی ہیں یا حضرتِ شبیر　　پانی اسے ممکن ہے نہ ملتا ہے اسے شیر
پانی کے لیے ماں سے یہ منہ موڑ رہے ہیں
دو بھائی بہن خاک پہ دم توڑ رہے ہیں

۹ محرم کی شب گذری، دس کی صبح نمودار ہوئی۔ اس خونیں دن کی صبح کتنی سہانی، کتنی روح پرور تھی؛ ذرا انیسؔ کی زبان سے اس کی دلکشی اور حسن کا بیان بھی سن لیجیے ؎

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور　　دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور　　وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں سے دم بدم　　مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم　　سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

سطحی نظر سے دیکھیے تو یہ عجیب بات لگتی ہے کہ صحرا کی صبح کو ایسا دلکش اور حسین

دکھایا ہے (اور بھی مرثیوں میں انیسؔ نے صبح عاشور کا جلوہ بڑی خوبی سے دکھایا ہے) لیکن جن لوگوں نے عراق کا یہ (جسے دریائے دجلہ و فرات سیراب کرتا ہے) ہرا بھرا خوبصورت علاقہ دیکھا ہے وہ اسے مبالغہ یا حقیقت سے دور نہیں کہہ سکتے اور انیسؔ تو اس پس منظر میں ریاضِ رسول کے نونہالوں کے حسن و دلکشی کو اور زیادہ نمایاں کرکے دکھانا چاہتے ہیں ؎

اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار — پھولے سماتے تھے نہ محمدؐ کے گلعذار
سب کے رخوں کا نور سپہرِ بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب — پر تھی رخوں پہ خاکِ تیمم سے طرفہ آب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب — ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابو تراب
مہتاب سے رخوں کی ضیا اور ہوگئی
مٹی سے آئینوں کی جلا اور ہوگئی

ابھی صبح صادق نمودار بھی نہ ہوئی تھی کہ امام حسینؑ خیمے میں تشریف لے گئے اور محمدؐ مصطفٰے کا علم نکلوایا کہ علمدار کے انتخاب کے بعد فوج آراستہ ہو۔ علیؑ کے بہادر اور نامور بیٹے عباس پر نظر انتخاب پڑی۔ عباس جانتے ہیں کہ یہ بڑا اعزاز اور بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اس کا حق انھیں اپنے خون کے ہر ہر قطرے سے ادا کرنا ہے۔ خاندان والے آکر مبارک باد دیتے ہیں۔ سکینہ جب یہ سنتی ہیں کہ چچا کو علمدار کا عہدہ ملا ہے تو تنِ نیم جاں میں جان آجاتی ہے ؎

ناگاہ آکے بالی سکینہ نے یہ کہا — کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا
عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا — لوگو! مجھے بلائیں تو لینے دو اک ذرا
شوکت خدا بڑھائے مرے عموجان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان کی

اس بند کے پہلے چار مصرعے معصوم محبت اور اصلیت کے آئینہ دار ہیں لیکن ٹیپ کے بند میں وہ سادگی اور حقیقت نظر نہیں آتی۔ یہ مناسبت لفظی اور شوکتِ الفاظ ایک کم سن بچّی کے منھ سے کسی طرح زیب نہیں دیتی۔

عباس جو بھتیجی کو بہت چاہتے ہیں، دم بھر کے لیے ہر دکھ اور ہر پریشانی بھول جاتے ہیں۔ ؎

عباس مسکرا کے پکارے کہ آؤ آؤ　　　　صدقے نثار پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ

یہاں سکینہ کا جواب ایک کم سن بچّی کی حالت کے عین مطابق ہے۔ ؎

بولی لپٹ کے وہ کہ مری مشک لیتے جاؤ　　　　اب تو علم ملا تمھیں پانی ہمیں پلاؤ

تحفہ نہ کوئی دیجے نہ انعام دیجیے

قربان جاؤں پانی کا اک جام دیجیے

علم لے کر عباس باہر گئے، فوجِ حسینی آراستہ ہوئی، دشمن سے معرکہ گرم ہوا اور جب یہ صبح دوپہر میں بدلی تو حسینی لشکر کے سارے مجاہد راہِ خدا میں قربان ہو چکے تھے۔ دوستوں کا پرا خالی تھا، عزیزوں میں سے بیشتر جانیں نچھاور کر چکے تھے۔ صرف عباس و علی اکبر باقی رہ گئے تھے۔ اب پیارا بھائی حسینؑ سے رخصتِ جنگ مانگ رہا ہے۔

سکینہ جو صبح تک دنیا کے سرد و گرم سے بے خبر ایک معصوم بچّی تھی، دن بھر کے جان لیوا حادثات نے اسے بہت کچھ بدل ڈالا ہے۔ وہ گھر سے عزیزوں کو زندہ جاتے اور مر کر واپس آتے دیکھ کر موت کے معنی اور جدائی کا درد کچھ کچھ سمجھ رہی ہے۔ یہ بھنک کان میں پڑتی ہے کہ عباس بھی میدانِ جنگ میں جا رہے ہیں تو تڑپ کر درِ خیمہ پر آتی ہے ؎　　ناگاہ سکینہ نے پکارا یہ بصد یاس

کیا کرتے ہو عباس چچا آؤ مرے پاس

اور لاڈلی بچی کی آواز سُن کر بے اختیار ہو کر ؎

عباس پکارے میں اس آواز کے قرباں
ہم جاتے ہیں پانی کے لیے آؤ مری جاں

بھتیجی کو سمجھاتے ہیں کہ تم مشک لاکر دو تو میں نہر سے تمھارے لیے پانی لاؤں مگر بچی کشمکش میں ہے کہ کہیں اوروں کی طرح چچا بھی جنگ کے میدان سے واپس نہ آئے تو کیا ہوگا۔ کبھی تو ؎

بولی یہ سکینہ کہ مجھے پیاس نہیں ہے

مگر چچا اصرار کرتے ہیں تو دل کی کیفیت یوں زبان سے ادا ہوتی ہے ؎

پہلے شہِ ابرار کو سمجھاؤ تو جاؤ　　پھر چاند سی صورت مجھے دکھلاؤ تو جاؤ
کچھ دیر نہ ہوگی یہ قسم کھاؤ تو جاؤ　　مانوں گی نہ میں نہر سے جلد آؤ تو جاؤ

بچی کو یہ بھی معلوم ہے کہ باپ چچا ایک دوسرے کو بیحد چاہتے ہیں اس لیے باپ کا واسطہ دیا جا رہا ہے۔

تنہا مرے بابا ہیں کوئی پاس نہیں ہے
کھودوں تمھیں ایسی تو مجھے پیاس نہیں ہے

عباس میدان جنگ میں جاکر دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ پوری کوشش کر رہے ہیں کہ ایک مشک بھر کر کسی طرح خیمے تک پہنچا دیں کہ معصوم پیاسے بچّوں کی پیاس بجھے۔ بچے خیمے کے دروازے پر اپنے بہشتی کے منتظر کھڑے ہیں۔ سکینہ سب سے زیادہ بے قرار و بدحواس ہے۔ چچا واپس کیوں نہیں آتے۔ کیسے ان کو واپس بلائے، شاید اسی کی پیاس کا حال سن کر واپس آجائیں۔

اب کیا سکینہ پیاسی ہی مرجائے اے چچا　　کب تک لڑو گے فوج سے بس ہو چکی وغا

سوکھے ہوئے لبوں پہ مری جان آئی ہے
اے نورِ چشم ساقی کوثر دُہائی ہے

وہ سمجھتی ہے کہ اگر پانی بھرنے دریا پر چلے گئے اور مشک لے کر خیمے میں آ گئے تو ان کی جان بچ جائے گی، وہ معصوم حالات کو کیا سمجھے؟

جلدی خدا کے واسطے دریا پہ جائیے ۔ قربان جاؤں بھر کے مری مشک لائیے
پھنکتا ہے سینۂ آگ جگر کی بجھائیے ۔ اچھا مرے چچا مجھے پانی پلائیے

طرح طرح سے چچا کو واپس آنے کی ترغیب دی جا رہی ہے:

کانٹے مری زبان کے اب آکے دیکھیے

اور آخر میں تڑپ کر یہ کہنا:

رونے کو شاہِ بے کس و تنہا کو دیکھیے

صدمہ فراق کا ہے دلِ دردناک پر ۔ جلد آئیے حسین تڑپتے ہیں خاک پر

سکینہ تڑپ تڑپ کر چچا کو واپس بلا رہی ہیں۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ میدانِ جنگ کے مجاہد کے کان میں اس کی ننھی سی آواز کہاں پہنچ سکتی ہے۔ خیمے کے در پہ یہ حال ہے کہ:

ڈیوڑھی پہ اہلِ بیت ہیں سب کھولے سر کے بال ۔ پردے سے منہ نکالے ہیں اطفالِ خورد سال
لب ان کے اودے اودے ہیں منہ گورے گورے ہیں
آنکھوں میں اشک ہاتھ میں خالی کٹورے ہیں

کس غضب کی مرقع کشی ہے ؎

کہتے ہیں سب لبوں پہ زبانوں کو پھیر کر ۔ اب پانی لے کے آتے ہیں عباسِ نامور
حضرت سے پوچھتی ہے سکینہ بچشمِ تر ۔ میرے چچا کب آئیں گے یا شاہِ بحر و بر

لیکن سکینہ کے سقے کو واپس آنا نصیب نہ ہوا۔ مشک تو بھری مگر دشمن کے تیروں نے نمازی کا سینہ اور مشک دونوں خیمے تک پہنچنے سے پہلے ہی چھلنی کر دیئے عباس کے بازو نہرِ فرات پر قلم ہو گئے، مشک چھد گئی، علم ٹھنڈا ہو گیا اور محبت و وفا کے

اس علمبردار مجاہد نے تین دن کی پیاس میں جامِ شہادت نوش کیا۔

امام حسینؑ بے قراری میں نہر کی سمت روانہ ہوئے تو پیچھے پیچھے چچا کی عاشق سکینہ بھی چلی مگر کس حال میں ؟

زلفیں تو ہیں بکھری ہوئی ٹوپی نہیں سر پر　　جو رو کتا ہے کہتی ہے گھبرا کے وہ مضطر
لوگو ں! تمھیں کچھ میرے بہشتی کی خبر ہے ؟
بتلا دو مجھے بہرِ خدا نہر کدھر ہے ؟

سقّے کا مرے نام ہے عباسِ علمدار　　تصویرِ علی کی ہیں سراپا وہ خوش اطوار
کاندھے پہ تو مشکیزہ ہے اور ہاتھ میں تلوار　　پیاسی ہوں مگر اب مجھے پانی نہیں درکار
پھر آنے کی قسمیں انھیں دینے کو چلی ہوں
میں اپنے چچا جان کو لینے کو چلی ہوں

سکینہ یوں تو سارے خاندان کی لاڈلی ہے مگر سب سے زیادہ اسے باپ چاہتے ہیں۔ یوں بھی کچھ انسانی فطرت ہے کہ باپ بیٹی کو زیادہ چاہتا ہے اور ماں بیٹے کو، پھر چھوٹی بچی ویسے بھی لاڈلی ہوتی ہے اور حسین علیہ السلام کے خاندان کی تو یہ روایت ہے کہ پیغمبرِ اسلام محمد مصطفےٰ اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ سے بے انتہا محبت فرماتے تھے۔ علیؑ مرتضیٰ کو بڑی بیٹی زینب کبرا سے بے حد محبت تھی۔ امام حسین بھی سب بیٹیوں کو بہت چاہتے تھے مگر سب سے چھوٹی بچی پر تو شفقت و محبت کی بارش تھی۔ اس کا نام امیمۃ جس کے معنی ہیں "قلب و روح کا سکون" اس بات کا ثبوت ہے کہ اس بچی سے امام حسینؑ کو کتنی محبت تھی۔ سکینہ بھی باپ کے نام کی عاشق تھی۔ چار سال محبت و راحت کے گہوارے میں جھولتے اس کی زندگی جنّت کا نمونہ بن کر گزرتی ہے کہ یکایک زمین و آسمان بدل جاتے ہیں۔ امام حسینؑ کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وطن چھوٹتا ہے، سفر کی صعوبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔

ان ساری پریشانیوں میں کم سن بچی بھی شریک ہے۔ مگر ابھی تک باپ کی محبت کی چھاؤں نصیب ہے۔ رات کو باپ کا پہلو سونے کو ملتا ہے اور وہ اس میں مگن ہے۔

مگر ۲ محرم کو حسینی قافلہ کربلا کے بلاخیز میدان میں پڑاؤ ڈالتا ہے۔ ڈراؤنی راتیں، صحرا میں جنگلی درندوں کی صدائیں سُن کر بچی سہمی بیٹھی ہے۔ امام حسینؑ اپنی بہن زینب سے باتیں کر رہے ہیں۔ جو پیش آنے والا ہے وہ آپ کی دور بیں نظر دیکھ رہی ہے، بچی دُور سے باپ اور پھوپھی کو باتیں کرتی دیکھتی ہے۔ اس وقت کی کیفیت انیس یوں بیان کرتے ہیں ؎

جا بیٹھی سکینہ بھی قدم جلد بڑھا کر
کہنے لگی منھ شاہ کی چھاتی میں چھپا کر
کس کس سے بلانے کے لیے میں نے کہا تھا
بابا تمھیں کب سے مرا دل ڈھونڈ رہا تھا

بچی دیکھتی ہے کہ باپ کے چہرے پر فکر و پریشانی ہے۔ کیوں؟ یہ وہ نہیں جانتی مگر چاہنے والی بچی کو اس کی کھوج ہے کہ آخر کیوں پریشان ہیں ؎

کس بات کا اندیشہ ہے میں آپ کے قربان
خاطر بھی پریشان ہیں گیسو بھی پریشان
سونے کی نہ کچھ فکر ہے کھانے کا نہ کچھ دھیان
کیا ہو گئے وہ لوگ کہ ہم جنکے ہیں مہمان
ہر مرتبہ کیوں اشکوں سے منھ دھوتے ہو بابا
کیا فاطمہ صغرا کے لیے روتے ہو بابا

بعض مصرعوں میں فکر و پریشانی کا کتنا فطری اور بے ساختہ انداز ہے۔ کھانے اور سونے تک کی آپ کو فکر نہیں۔ بچی ہی تو ہے، بھوک اسے بھی ستا رہی ہے، نیند اسے بھی آرہی ہے مگر اپنا ذکر کرنا غیرت کے منافی ہے۔ مگر مصرع بول رہا ہے کہ خود اسے بھوک لگی ہے تبھی تو کہتی ہے۔

کیا ہو گئے وہ لوگ کہ ہم جن کے ہیں مہمان

کہ عرب کی مہماں نوازی سے وہ بچی بھی بے خبر نہیں۔ مگر باپ سے کوئی جواب نہ پاکر

اور ان کی آنکھوں کے آنسو دیکھ کر خیال آتا ہے ضرور میری بیمار بہن، جسے وطن چھوڑ آئے ہیں بابا کو یاد آرہی ہے۔ بس دوسرا مصرع ایسا ہے جو ایسی کم سن بچّی کے منھ سے نہیں شاعر کے قلم سے نکلا ہے۔

دن گزرتے رہے، منزلِ شہادت نزدیک آرہی ہے۔ حسینؑ اپنے عظیم مقصد کی تکمیل میں ہمہ تن محو ہیں مگر اس وقت بھی سارے انسانی فرائض ادا ہو رہے ہیں۔ عزیزوں، دوستوں، رشتے داروں، بچوں سب کی فکر ہے۔ اور اسی حال میں شبِ عاشور آجاتی ہے، وہ شب جس کی صبح معرکۂ حق و باطل گرم ہونا اور حق کے پرستاروں کو جانیں قربان کرنا ہیں۔ امام حسینؑ اور ان کی بہن زینب آنے والے حالات کا اندازہ کر رہے ہیں اور قدرتی طور پر بہن بے قرار ہیں اور بھائی تسلّی دے رہے ہیں کہ سکینہ پکارتی ہیں ؎

نیند آئی ہے بیٹی کو سلا جائیے بابا
بس ہو چکیں باتیں اب ادھر آئیے بابا

بیٹی کی صدا سنتے ہی ؎

حضرت نے کہا میں تری آواز کے قرباں
اللہ تم اب تک نہیں سوئی ہو مری جاں

تو سکینہ شکوہ کرتی ہیں ؎

سونا تو گیا آپ کے ہمراہ ہمارا
میں جاگتی ہوں اور جہاں سوتا ہے سارا

امام حسینؑ محسوس کرتے ہیں کہ اب وقت آگیا ہے کہ بچّی کو بھی آنے والے وقت کے لیے تیار ہونا چاہیے ؎

اچھی نہیں عادت یہ نہ رویا کرو بی بی   پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی

کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں مجبور ہوں ایسے کہ تمھیں چھوڑ کے جائیں
تم پاؤ نہ ہم کو نہ تمھیں ہم کہیں پائیں بی بی کہو پھر چھاتی پہ کس طرح سلائیں
جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی

اپنی مثال دے کر سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں ؎

جب عمر تھی کم ہم بھی چھٹے تھے یونہی ماں سے سوتے تھے لپٹ کر یونہی خاتونِ جناں سے
کوچ ان کا ہوا سامنے آنکھوں کے جہاں سے ماتم سے ملیں وہ نہ بکا سے نہ فغاں سے
یہ داغ یہ اندوہ والم سب کے لیے ہیں
ماں باپ زمانے میں سدا کس کے جیے ہیں

رات گذرتی ہے۔ صبحِ عاشور نمودار ہونے والی ہے۔ امام حسینؑ پہلی رخصت کے لیے خیمے میں جاتے ہیں اور سکینہ کا حال پوچھتے ہیں تو بہن جواب دیتی ہیں ؎

ماں پاس نہ لیٹی نہ مری گود میں آئی
بے آپ کے اس کو کبھی نیند آئی ہے بھائی

اور پھر ذرا شکوے کے انداز میں یہ کہنا ؎

تھمتا ہے کوئی باپ سے بچہ جو ہلا ہو؟

پھر بھوک سے بے حال سکینہ کو گود میں لے کر بھائی کے پاس آتی ہیں۔ حسینؑ بچی کی طرف ہاتھ پھیلا کر بڑھتے ہیں ؎

بابا تری اس چاند سی صورت پہ فدا ہو
کیوں آکے لپٹتی نہیں کیا ہم سے خفا ہو

بچی روٹھی ہوئی ہے اور باپ کا دل یہ سوچ کر تڑپ جاتا ہے کہ یہ نازوں کی پالی بچی کل بے وارث و والی ہو کر دشمنوں کے ظلم کا نشانہ بنے گی ؎

ہم ہوں گے کہیں تم کہیں جاؤ گی سکینہ
ڈھونڈو گی تو پھر ہم کو نہ پاؤ گی سکینہ

اور پھر جیسے خود اپنے سے باتیں ہونے لگتی ہیں ؎

چھوڑا نہ کبھی چار برس تک مرا پہلو　　منھ چھاتی پہ رکھ کر تمھیں سو جانے کی تھی خو
واں ہوگا کہاں سر کے تلے باپ کا بازو　　اَٹ جائیں گے اب گردِ یتیمی سے یہ گیسو

بچی باپ کی باتیں سن کر ان کی حالت دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔ آنے والی مصیبتوں کا دھندلا سا احساس پیدا ہو جاتا ہے ؎

گودی میں گئی باپ کی گھبرا کے وہ بے آس
رُخ زرد تھا نیلے تھے لبِ لعل یہ تھی پیاس

چاہنے والی بچی کی حالت کتنی حقیقی اور پُر اثر ہے :

منھ پر کبھی منھ ملتی تھی دے دے کے دعائیں　　لیتی تھی کبھی ننھے سے ہاتھوں سے بلائیں
کہتی تھی کبھی گھر سے نہ حضرت کہیں جائیں　　روتی نہیں ہیں آپ نہ اب اشک بہائیں

آنے دو اگر پیاس سے غش آئے گا بابا
تم جیتے رہو پانی بھی مل جائے گا بابا

باپ کی باتیں کچھ سمجھ میں آئی ہیں کچھ نہیں آئیں مگر یہ احساس ہو چلا ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں اور جا رہے ہیں ؎

اس وقت کی باتوں سے مجھے ہوتا ہے وسواس
کیا آج کی شب کو بھی نہ رہیے گا مرے پاس

پھر روٹھ کر کہتی ہے ؎

پھر کل کی طرح نیند مری کھوؤ گے بابا

اور اٹھلا کر یہ کہنا دیکھیے ؎

میں بھی وہیں سوؤں گی جہاں سوؤ گے بابا

دیکھتی ہے کہ بابا ہتھیار لگا رہے ہیں۔ جانے کیا ہونے والا ہے ؎

کیا قصد ہے جانا ہے کہاں یا شہِ ابرار
تشویش کچھ ایسی ہے کہ بھولا ہے مرا پیار

یہ تجربہ زندگی میں پہلی بار ہو رہا ہے کہ بابا کسی ایسے کام میں ہیں کہ میرا پیار بھی بھول گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سفر میں ہم لوگ ساتھ نہ جائیں ؎

صدقے گئی ناقوں پہ حرم ساتھ نہ ہوں گے
کیا یہ سفر ایسا ہے کہ ہم ساتھ نہ ہوں گے

ایک دوسرے مرثئے میں میر انیسؔ نے صبح عاشور باپ بیٹی کی رخصت کا جو منظر دکھایا ہے وہ اور بھی زیادہ درد و اثر میں ڈوبا ہے ؎

دیکھا یہ کہہ کے بالی سکینہ کو یاس سے — لپٹی وہ دوڑ کر شہِ گردوں اساس سے
طاقت نہ تھی کلام کی ہر چند پیاس سے — بولی وہ تشنہ کام شہِ حق شناس سے
کیا اس بلا کے بَن سے تہیہ سفر کا ہے
صدقے گئی بتاؤ ارادہ کدھر کا ہے

امام دیکھتے ہیں کہ بچی سے اب کچھ چھپانا ممکن نہیں ؎

فرمایا شہ نے ہاں سفرِ ناگزیر ہے — آؤ گلے لگو کہ یہ صحبت اخیر ہے
اب آرزوے قرب خدائے قدیر ہے — تنہا ہیں ہم سپاہِ مخالف کثیر ہے
طے ہو یہ مرحلہ جو عنایت خدا کرے
جس کا نہ کوئی دوست ہو بی بی وہ کیا کرے

بچی کو سمجھاتے سمجھاتے جیسے عالمِ بے خودی میں وہ باتیں بھی منہ سے نکل جاتی ہیں جن کو وہ اس وقت نہیں سمجھ پاتی مگر آنے والا وقت سمجھا دیتا ہے۔ بچی اس وقت تو بس اتنا سمجھ پاتی ہے کہ بابا کسی مصیبت میں ہیں۔ سوچتی ہے یہاں سے کہیں اور

لہ امام حسینؑ

چلے جائیں تو مصیبت ٹل جائے گی ؎

سن کر مصیبتِ پدرِ بے کس و حزیں — بولیں بلائیں باپ کی لے کر وہ مہ جبیں
نکلو بلا کے بن سے کہیں یا امامِ دیں — آقا سوا حضور کے میرا کوئی نہیں

صدقے گئی مدینے چلو یا نجف چلو
للہ ساتھ لے لو مجھے جس طرف چلو

بلائیں لینا، خالص شمالی ہند کی تہذیب ہے جہاں عام طور پر لڑکیاں ماں خالہ پھوپھی کو باپ بھائی بیٹوں کی بلائیں لیتے دیکھ کر خود بھی لینے لگتی ہیں۔ سکینہ کا بلائیں لینا، صدقے جانا، یہ کہنا کہ سوا آپ کے اور کوئی میرا نہیں، صاف محسوس ہوتا ہے کہ ماں اور پھوپھی کی سنی باتیں دہرا رہی ہے مگر دل کی اصلی آواز یہ ہے کہ ؎

للہ ساتھ لے لو مجھے جس طرف چلو

امام حسینؑ بیٹی کی باتیں سن کر سوچتے ہیں کہ بچی کو آنے والی مصیبت کا کوئی اندازہ نہیں۔ اشاروں میں پہلے بھی بتانے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اب صاف صاف کہنا پڑتا ہے کہ سمجھ رہے ہیں کہ تھوڑی ہی دیر بعد اسے دنیا کے سخت ظلم اور صدمے جھیلنے ہیں اس لیے پہلے ہی سے اس کے لیے تیار کر دینا ضروری ہے۔ ؎

جانا ہے دور شب کو جو آنا نہ ہو ادھر — ضد کر کے رو ئیو نہ ہمیں چاہتی ہو گر
پہلے پہل ہے آج شبِ فرقتِ پدر — سو رہیو ماں کی چھاتی پہ غربت سے رکھ کے سر

راحت کے دن گزر گئے اب فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

بچی نے آج سے پہلے لفظ یتیمی سنا بھی نہ تھا اس کے معنی تو کیا جانتی!

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام — بتلائیے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام؟

بیٹی باپ سے اس روح فرسا لفظ کے معنی پوچھتی ہے تو چاہنے والے باپ کا دل لرز جاتا ہے ؎

آنکھوں سے خوں بہا کے یہ کہنے لگے امام   کھل جائے گا یہ درد والم تم پہ تا بہ شام

بی بی نہ پوچھو کچھ یہ مصیبت عظیم ہے
مر جائے جس کا باپ وہ بچہ یتیم ہے

جوں جوں صبح دوپہر میں ڈھلتی گئی، سکینہ نئی نئی مصیبتوں، نئے نئے لفظوں کا مطلب سمجھتی گئی۔ باپ میدانِ جنگ کی سمت ہتھیار سج کر، عزیزوں، دوستوں، ساتھیوں کو ساتھ لے کر گئے، پھر بہادروں کی موت کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ اس کے بعد عزیزوں کی لاشیں۔ چچا نے شہادت پائی۔ ابنِ عم نے جان گنوائی۔ پھوپھی کے بیٹے موت کی آغوش میں گئے۔ جوان بھائی کی لاش آئی۔ ماؤں کی گودیں اُجڑتی رہیں۔ سہاگنوں کو رنڈاپے کی خبریں ملتی رہیں۔ بچے یتیم ہوتے رہے۔ بھوک اور پیاس سے نیم جان، صدمے اور وحشت سے بدحواس، بچی سب کچھ دیکھتی رہی، سنتی رہی۔ یہاں تک کہ حسینؑ کے سب یاور وانصار، بھائی بیٹے، بھتیجے بھانجے راہِ حق پر جان قربان کر چکے اور سب سے آخر میں حسینؑ میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت دینے کے لیے روانہ ہوئے۔

درِ خیمہ پر حسینؑ کی بہن زینب اور دوسری عورتیں کھڑی یہ روح فرسا منظر دیکھ رہی ہیں کہ ایک تنہا مجاہد ہزاروں سے جہاد کر رہا ہے اور نیزوں، تیروں، تلواروں کے زخموں سے چور چور ہو چکا ہے۔ پھوپھی کے پاس کھڑی سکینہ بھی یہ سب دیکھ رہی ہے۔ حالت یہ ہے کہ ؎

سر پہ ٹوپی بھی نہ تھی اور گریباں تھا پھٹا
دور سے باپ کی حالت دیکھتی ہے اور بلک بلک کر کہتی ہے ؎

اے پھوپھی نرغۂ اعدا میں ہیں شاہِ مظلوم

یکایک دیکھتی ہے کہ ایک شقی خنجر بہ کف اس کے باپ کی طرف بڑھ رہا ہے تو بے اختیار پھوپھی سے کہتی ہے ؎

جاؤں گی اب میں ٹھہرنے کی نہیں آپ کے پاس
شمر خنجر لیے جاتا ہے مرے باپ کے پاس

باپ کی محبت کا جوش اور کم سنی کی معصومیت یقین دلا رہی ہے کہ میں منت و سماجت کر کے اپنے بابا کی جان بچالوں گی۔ ؎

باپ کے پاس سے جا کر اسے سرکاؤں گی
جوڑ کر ہاتھوں کو منت سے یہ سمجھاؤں گی
اپنے بابا کی میں چھاتی سے لپٹ جاؤں گی
خیمے تک ان کو سنبھالے ہوئے آؤں گی
بھوکے پیاسے مرے بابا کو نہ مارے کوئی
ان کے بدلے مرا سر تن سے اتارے کوئی

بچی میدانِ جنگ کی طرف دوڑ جاتی ہے۔ ماں اور پھوپھی روکتی ہوئی پیچھے دوڑتی ہیں مگر وہ ایک نہیں سنتی اور دشمن کے فوج کے سپہ سالار عمر و بن سعد کے سامنے پہنچ جاتی ہے اور کڑک کر کہتی ہے ؎

او لعیں، حیدرِ کرار کی پوتی ہوں میں

اور پھر فوراً ہی یہ دلگداز حقیقت لب پر آجاتی ہے ؎

رحم کر مجھ پہ کہ بے باپ کی ہوتی ہوں میں

اس بات سے قطعِ نظر کہ ایسا ممکن بھی ہو سکتا ہے کہ چھوٹی سی بچی میدانِ جنگ میں سپہ سالار فوج کے سامنے پہنچ جائے، بچی کی جو اس وقت حالت ہے وہ دیکھنے کی ہے۔ جتنی چیزیں اس کے پاس ہیں وہ سب اپنے باپ کی جان بچانے کے لیے دینے پر تلی ہوئی ہے۔

ہنسلیاں اپنے گلے کی تجھے دیتی ہوں اُتار
لے مرے کان کے دُر، پر مرے بابا کو نہ مار

خوشامد تک کرنے پر اُتر آتی ہے ؎

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں ترے آگے ناچار
منع کر دے کوئی بیکس کو نہ مارے تلوار
گھر میں جو کچھ زر و زیور ہے وہ لا دوں گی میں
جان بابا کی بچے گی تو دُعا دوں گی میں

بے قراری بڑھ رہی ہے ؎

دیکھ غربت کو مری، کر مرے بچپن پہ نظر　　باپ مارا گیا میرا تو جیوں گی کیوں کر
سر پہ آئے گی یتیمی تو میں جاؤں گی کدھر　　میں تو ہوں باپ کی شیدا مرا عاشق ہے پدر

زرا واسطے دینا، اپنی اور باپ کی محبت کا نقشہ کھینچ کر پتھر کو پگھلانے کی کوشش دیکھیے۔ بچپن کا بھولا پن بھی ہے۔ مصائب نے قبل از وقت ذہن کو جو پختگی دے دی ہے، اس کی جھلک بھی ہے، بے قراری اور والہانہ محبت کا انداز بھی۔ اور یہ کہہ کر تو عاشق بیٹی کے دل کی حالت کو شاعر نے جیسے مصوّر کر لیا ہے ؎

باپ بن ایک دن آرام نہ آئے گا مجھے　　کون پھر رات کو چھاتی پہ سلاوے گا مجھے
بھیڑ میں مجھ کو نظر آتے نہیں بابا جاں
اتنا کہہ دے کہ سرک جائیں یہ سب بے ایماں

ننھی بچی کی نالہ و زاری، فریاد و بے قراری سُن کر پتھر ہوتا تو پھٹ جاتا مگر یہ حسینؑ کے دشمن کا دل تھا جس پر معصوم کی التجا اور زاری سب بے اثر تھی!

آگے بڑھی سکینہ تو دیکھا یہ ماجرا　　خنجر گلے پہ پھیرتا ہے شمرِ بے حیا

کہہ کر زمیں پہ گر پڑی وہ وا مصیبتا اُٹھ کر پکاری شمر ٹھہر بہرِ مصطفےٰ!

اب دوسرے شقی سے رحم کی طلب کر رہی ہے ؎

للہ شمر سبطِ پیمبر کو چھوڑ دے سیدؑ کو بے گناہ کو مضطر کو چھوڑ دے
حاجی کو بے وطن کو مسافر کو چھوڑ دے مجھ کو تو ذبح کر مرے سرور کو چھوڑ دے
لپٹوں گلے سے میں پدرِ ناتوان کے
سینے سے تو سرک تو مرے بابا جان کے

باپ کو اس حالت میں دیکھ کر بچی پر مجنونانہ سی کیفیت طاری ہو چکی ہے ؎

او شمر دیکھ زخم بدن شہ کے پھٹ نہ جائیں پانی تو دے کہ پیاس ذرا شاہِ دیں بجھائیں
اک دم ٹھہر کہ خاک تو زخموں سے ہم چھڑائیں للہ حکم دے کہ حرم شہ کے پاس آئیں
وہ ہم کو اور ہم انھیں اک بار دیکھ لیں
کہدے تو آ کے آخری دیدار دیکھ لیں

کہ اب یہ روح فرسا حقیقت بچی سمجھ چکی ہے کہ بابا کی جان تو بچ ہی نہیں سکتی۔ کم سے کم ایک بار ان سے مل تو لے۔

واقعات کی رفتار اتنی تیز اور اتنی قیامت خیز ہے کہ بچی حیران و ششدر ہے۔ عمر کم، ذہن کچّا، مصائب عظیم، خوں فرسا حادثات، جان لیوا جدائیاں تین دن کی بھوک اور پیاس کا احساس تک مٹا دیتی ہیں۔ باپ کو اپنی آنکھوں سے شہید ہوتا دیکھ چکی ہے۔ مگر ذہن کسی بات کی بھی پوری طرح گرفت نہیں کر پاتا۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد دشمن کی فوج کے سوار خاندانِ رسول کی خواتین کو لوٹنے کے لیے درانہ گھوڑے اُڑاتے ہوئے خیموں میں گھس آتے ہیں تو معصوم بچی کے زخمی ذہن پر ایک اور ضرب پڑتی ہے ؎

خوف کے مارے سکینہ کا عجب تھا احوال ماں سے لپٹی ہوئی چلاتی تھی وہ نیک خصال

جاں بلب ہوں شہِ والا کو بلا دے کوئی

ارے لوگو مرے بابا کو بلا دے کوئی

ارے لوگوں امرے بھیّا علی اکبر ہیں کہاں کس سے بلواؤں پھوپھی جان کے دلبر ہیں کہاں

لوٹی جاتی ہے دلہن قاسمِ مضطر ہیں کہاں اُن کے قربان میں عباس دلاور ہیں کہاں

اور کس حسرت وحیرت سے کہتی ہے کہ یہ کیا ہوگیا ہے ؎

کوئی اس وقت بچانے نہیں آتا مجھ کو

اور پھر خاندان کا جو واحد مرد بچ رہا ہے اس کا خیال آتا ہے تو دوڑ کر بیمار بھائی کے پاس جاتی ہے۔

غش میں بستر پہ جو سجّاد پڑے تھے تنہا بے حواسی میں سکینہ گئی دوڑی اس جا

ننھے سے ہاتھوں سے بازو کو ہلا کر یہ کہا پھوپھی اماں کی ردا چھن گئی اُٹھو بھیّا

جی مرا ڈرتا ہے چھاتی سے لگا لو مجھ کو

میرے گوہر نہ کوئی چھینے چھپا لو مجھ کو

سیّد سجاد بیمار و بے ہوش ہیں۔ دشمن خواتین کے سروں سے چادریں چھینتے، بچوں کو طمانچے مارتے اور گھر کا مال واسباب لوٹتے اور خیمے جلاتے نظر آرہے ہیں، اس وقت ؎

کہتی تھی سہم کر یہ سکینہ جگر فگار مجھ کو کہیں چھپا لو پھوپھی تم پہ میں نثار

غافل ہیں ہم نے دیکھ لیا بس سبھوں کا پیار اکبر ہیں یاں نہ حضرتِ عباس نامدار

نامحرم آکے خیمۂ عصمت میں بھر گئے

پوچھو کسی سے تم مرے بابا کدھر گئے

بچی گھبرا رہی تھی، ڈر رہی تھی کہ ؎

دوڑا معصوم سکینہ کی طرف اک ظالم
دونوں کانوں سے گہر چھین لیے وائے ستم

اور مظلوم زخمی بچی ؎

خوں میں کرتے کو بھرا دیکھ کے تھراتی تھی
ہاتھ کانوں پہ دھرے باپ کو چلاتی تھی

ستم پر ستم ٹوٹ رہے ہیں ؎

کانوں سے لہو بہتا تھا اور کاسنی تھے گال

اور

سر ننگا تھا کرتے کا گریبان پھٹا تھا اور چاند سا منھ گردِ یتیمی سے اٹا تھا

مگر دل میں اب بھی وہی لگن ، وہی تڑپ ہے کہ بابا آجائیں ۔ وہ نہیں ہیں اسی لیے تو لوگ اس پر ستم توڑ رہے ہیں ۔ ماں سے تڑپ تڑپ کر یہ کہنا ؎

کیا جانے سدھارے ہیں کدھر سیدِ خوشخو
کیوں آکے لگاتے نہیں وہ چھاتی سے مجھ کو

شاید کسی بات پر وہ اس سے خفا ہو گئے ہیں ۔

دیدار سے اپنے مجھے ترساتے ہیں بابا
بیٹی سے خفا ہیں جو نہیں آتے ہیں بابا

دل ہیں یہ وسوسہ بھی اٹھتا رہتا ہے کہ بابا زندہ ہوتے تو کیسے ممکن تھا کہ بیٹی پر یہ ستم ٹوٹتے اور وہ آکر نہ بچاتے ۔ دل کے اندر سے آواز اٹھتی ہے کہ بابا مر تو نہیں گئے ؎

وہ ہوتے تو گھر کو نہ لعیں لوٹنے آتے وہ ہوتے تو در در نہ لعیں ہم کو پھراتے
وہ ہوتے تو کیوں خوں مرے کانوں سے بہاتے وہ ہوتے تو کیوں ظالموں کی قید میں جاتے

کیونکر نہ کرے نالہ و فریاد سکینہ
مرنے سے ہوئی باپ کے برباد سکینہ

موت کا پورا مفہوم کم سن بچّے کی سمجھ میں مشکل سے آتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہو کہ بچہ ماں یا باپ یا کسی اور عزیز کو مردہ دیکھنے کے بعد بھی اس سے ملنے کی آس رکھتا ہے۔ مرنے کا تذکرہ سُنتا رہتا ہے مگر اس کا دماغ یہ سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ موت ایسی جدائی کا نام ہے، جس کے بعد ملنا نصیب نہیں ہوسکتا۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ یتیم بچوں کو یہ کہہ کر بہلایا جاتا ہے کہ تمھارے ماں یا باپ اسپتال چلے گئے ہیں اور بچہ موت کا نام اور ذکر سننے اور کبھی کبھی موت کی صورت تک دیکھ لینے کے بعد دھوکا کھا جاتا ہے اور سالہاسال اپنے پیارے کا منتظر رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بے رحم وقت سنِ شعور پر پہنچا کر اس پر یہ جان لیوا حقیقت کھول دیتا ہے کہ جانے والے وہاں گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ سکینہ کی انیسؔ ایسی ہی حالت دکھاتے ہیں کہ سب کچھ دیکھ چکی ہے، سہار چکی ہے مگر حقیقتِ حال کو سمجھ نہیں پا رہی ہے۔ اسی لیے بار بار باپ کی واپسی کی دعا اور آرزو بھی کرتی ہے اور ان کی جدائی و موت کا ذکر بھی کر دیتی ہے۔ لیکن زیادہ تر امید ہی کا جذبہ ہے، مایوسی بہت کم اس پر غلبہ پاتی ہے۔ ہاں بے بسی کا احساس ضرور گہرا ہے اور پھر یہ بچّی بھی ماں بہنوں، پھوپھیوں اور چچیوں کے ساتھ ننگے اونٹوں پر گلے اور بازو میں رسی باندھ کر بٹھا دی جاتی ہے اور پہلے کوفے اور پھر وہاں سے دمشق کے بلاخیز سفر پر یہ لٹا قافلہ روانہ ہوتا ہے۔ کوفے کے بازاروں سے جس وقت یہ قافلہ گزر رہا ہے، اس وقت شہر کے بام و در تماشائیوں سے بھرے ہیں۔ سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم ہے جو حاکم وقت کے دشمن کے گھرانے کی بیویوں کو دیکھنے کو گھروں سے نکل پڑے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو سب کچھ جانتے ہیں

اور وہ ناواقف بھی، خاص کر عورتیں جو نہیں جانتیں کہ بندی میں آنے نے الی رسول ادیاں
ہیں ۔

رانڈوں کی چھاتیوں سے پلٹے ہوئے تھے اطفال
ہونٹ گل برگ سے سوکھے ہوئے رُخ دھوپ سے لال

ان بچوں کا یہ حال تھا کہ ۔

چاند سے چہروں پہ اک اک کے یتیمی تھی عیاں
کئی فاقے جو کیے تھے تو نہ تھی تاب و تواں

یہ بھوکے پیاسے بچّے دیکھتے ہیں کہ کوئی لوگ اپنے بچّوں کو کھانے پینے کی چیزیں خرید کر کھلا رہے ہیں تو (بچّے پھر بچّے ہی ہیں) بے چین ہو جاتے ہیں ۔

کوئی لاتے تھے جو ہمراہ وہاں بچّوں کو | میوے لے کے کھلاتے تھے وہ ان کو خوش ہو
اونٹ پر کہتی تھی ماں سے یہ سکینہ رو رو | بیٹی قربان ذرا منھ کو تو اپنے کھولو

لڑکے کھاتے ہیں جو چیزیں وہ کھلا دو ہم کو
میوے بازار میں بکتے ہیں منگا دو ہم کو

یہ اشعار بالکل سپاٹ سے ہیں، کوئی فنی خوبی اس میں نہیں مگر ایسی حالت میں بچّوں کے دل اور ذہن کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس کی کیسی سچّی تصویر ہے۔ پڑھنے والے کا دل دہل اُٹھتا ہے اس پر ماں کا جواب اور قیامت ہے۔ چاہنے والی ماں احساسِ بے بسی اور شدّتِ غم سے پل بھر کے لیے ہوش و حواس کھو بیٹھتی ہے اور جھنجھلا کر بچی کو یہ دل شکن جواب دیتی ہے ۔

اب نہیں جیتے ترے ناز اُٹھانے والے
مر گئے سب ترے میوے کے کھلانے والے

یہ بھی زندگی کی ایک بڑی تلخ مگر اٹل سچائی ہے کہ ماں اکثر بے بسی کی حالت میں

ایسی باتیں اپنے بچوں سے کہہ بیٹھتی ہے جو پوری طرح ہوش و حواس میں ہو تو کبھی نہیں کہہ سکتی۔ یہ جواب حسینؑ کی بیوی کے شایانِ شان نہ ہو مگر عورت کی فطرت کی بڑی اچھی عکاسی کرتا ہے۔ ماں کا دل خون ہو گیا ہو گا جب زبان سے یہ بول نکلے ہوں گے۔

کوفے کے دربار میں اہلِ بیتِ حسینؑ کو لے جایا جاتا ہے۔ حاکمِ کوفہ حسینؑ کی بہن زینب سے تلخ و دل شکن باتیں کرتا ہے جن کا وہ سخت جواب دیتی اور اُسے ملامت کرتی ہیں۔ وہ جل کر رسول کی نواسی کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ عورتیں اور بچے جن کا آخری سہارا انھیں کی ذات تھی، تڑپ جاتے ہیں۔ بچے سہم کر اُن سے لپٹ جاتے ہیں۔ مگر سکینہ ڈرتی نہیں بلکہ پھوپھی سے کہتی ہے ؎

میری بیکس پھوپھی اماں میں تمھارے صدقے　　　آپ کے بدلے ستمگر مری گردن کاٹے

اب کہاں ہیں شہِ والا جو بچائیں تم کو

ہائے جیتے نہیں بابا جو بچائیں تم کو

پھر مہینوں عرب کے صحرا کا رنج و بلا کا سفر طے کر کے یہ لٹا قافلہ دمشق پہنچتا ہے۔ قیدیوں کو دربارِ یزید میں لے جانے کی تیاری ہو رہی ہے کس طرح؟

گردنیں بارہ اسیروں کی ہیں اور ایک رسن

ہے اسی رسی میں ننھا سا سکینہ کا گلو　　　دم گھٹا جاتا ہے آنکھوں سے رواں ہیں آنسو

چاک کُرتے کا گریباں ہے پریشاں گیسو　　　سوجے تو گال ہیں کانوں سے ٹپکتا ہے لہو

آہ ہر گام پہ سینے سے نکل جاتی ہے

جب گھڑکتے ہیں ستمگر تو دہل جاتی ہے

پورا بند جیسے نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ مہینوں سے اس معصوم پر کیا بیت رہی ہے اور کیسے کیسے ظلم و ستم اس پر توڑے جاتے رہے ہیں۔

وہ دیکھتی ہے کہ کسی حاکم کے دربار میں جانے کی تیاری ہو رہی ہے تو اُمید کی ننّھی سی کرن زخمی دل میں روشن ہو جاتی ہے شاید بابا بھی وہاں ہوں! ماں سے پوچھتی ہے ؎

کس کا دربار ہے اس حال میں جاتی ہو کہاں؟
یہ تو کہہ دو کہیں بابا بھی ملیں گے اماں؟

بھول جائے گا یہ سب دکھ جو انھیں پاؤں گی — دوڑ کر چاند سی چھاتی سے لپٹ جاؤں گی

زرا یہ بند دیکھیے گلہ اور شکوہ بھی ہے، خفگی کا اظہار بھی ہے اور سب کی تہ میں بے پناہ محبت اور ملنے کی تمنّا!

کہیں دربار میں اماں وہ اگر مجھ کو ملے — دیکھنا کرتی ہوں کیسے شہِ والا سے گلے
وہ خبر لیویں نہ گردن مری رسی میں بندھے — اس کو یوں بھولتے ہیں باپ، بچہ جو بلے

وجہ کیا! کون سی تقصیر پہ منھ موڑا ہے
سیلیاں کھانے کو اعدا میں مجھے چھوڑا ہے

اہلِ حرم کو یزید ایک تنگ و تاریک زنداں میں جو اس کے محل کے بہت قریب تھا، قید کر دیتا ہے۔ اس زندانِ شام کا نقشہ انیسؔ نے یوں کھینچا ہے ؎

جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی — بچّوں کی مارے خوف کے حالت عجب ہوئی
گھٹ گھٹ کے دخترِ شہِ دیں جاں بلب ہوئی — مضطر کمال بنتِ امیرِ عرب ہوئی

آفت کا سامنا تھا نئی واردات تھی
زہرا کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات تھی

کیجے شکستگی کا خرابے کی کیا بیاں — ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر، ہراس کی جا، خوف کا مکاں — وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں

ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

برزم زمیں سے واں کی نکلتا تھا یوں بخار　　جیسے دھواں تنور سے اُٹھتا ہے بار بار
جھڑتی تھی واں کی سقف سے ہر دم شرق خاک　　بھاگی تھی روشنی بھی یہ حجرے تھے ہولناک
دیواریں بھی شکست تھیں در بھی جھکے ہوئے
جانیں بھی غم سے تنگ تھیں دل بھی رُکے ہوئے

اس وقت بھی زینب بچوں اور بڑوں کو سمجھاتی اور صبر کی تلقین کرتی ہیں ؎

لائق نہ اس مکان کے تھے ہم گناہ گار
سایہ تو ہے سروں پہ کردِ شکرِ کردگار

اور پھر یہ سوچ کر چاہنے والی بہن کے دل سے دھواں اٹھتا سا ہے ؎

ہے جائے گریہ حالِ شہِ مشرقین پر
کیا گذری ہوگی دھوپ میں لاشِ حسین پر

اور پھر اس عالمِ بیقراری میں اس کنبے کی سردار اور محافظ خاتون کے مُنھ سے وہ باتیں نکل جاتی ہیں جو دل میں تڑپ رہی ہیں۔

رسی مرے گلے کی کوئی کھول دے اگر　　مقتل کو ڈھونڈتی ہوئی جاؤں میں نوحہ گر
نکلی ہیں جب تو پھر نہیں درکار راہبر　　رستے میں پوچھ لوں گی کہ ہے کربلا کدھر
ممکن یہ ہے کہ لاش کو زینب نہ پائے گی
بھائی کے خوں کی بو مجھے کوسوں سے آئے گی

سکینہ سمجھتی ہے سچ مچ پھوپھی بابا کے پاس جا رہی ہیں ؎

لیتی چلو مجھے بھی پھوپھی تم پہ میں نثار
چھپ کر چلی گئیں تو میں روؤں گی زار زار　　تم نے بھی کیا بھلا دیا دل سے ہمارا پیار
مر جاؤں گی اگر نہ پدر سے ملاؤ گی
کیا اس اندھیرے گھر میں مجھے چھوڑ جاؤ گی

پھوپھی بچّی کو سمجھاتی ہیں مگر اس کی سمجھ میں بس یہ آتا ہے کہ بابا بھی ہماری طرح مجبور ہیں، شاید وہ بھی قید میں ہیں۔

ہے ہے پھوپھی نہ آئیں گے کیا اب مرے پدر
حاکم کے گھر میں قید ہیں سلطانِ بحر و بر

پھر دوبارہ اصرار سے پوچھتی ہے:

سچ کہتی ہو نہ شاہِ خوش انجام آئیں گے
اماں تو کہتی تھیں کہ سرِ شام آئیں گے

ماں اور چچی نے جتنی باتیں بہلانے کے لیے بچّی سے کی تھیں، وہ سب پھوپھی کے سامنے دہراتی ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصائب کے ان چند مہینوں نے بچّی کے ذہن میں کتنی پختگی پیدا کر دی ہے۔ جن باتوں سے اس کی عمر کے بچے دھوکا کھا جاتے ہیں وہ اب ان پر یقین نہیں کرتی ؎

سن لیتی ہوں میں سب کی پہ دل مانتا نہیں

پھر بڑوں کی طرح یہ کہنا بھی ثابت کرتا ہے کہ وہ اب بہت کچھ سمجھنے لگی ہے۔

معلوم ہو گیا مجھے بہلاتے ہیں یہ سب
تا مر نہ جائے قید میں گھٹ کر یہ تشنہ لب
کیا حاصل اب چھپانے سے شاید جیوں گی اب
میں کس بلا میں پھنس گئی یاں آ کے ہے غضب
یہ لوگ تو کبھی نہ مفصّل بتائیں گے
میں اپنی جان دوں گی جو بابا نہ آئیں گے

سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی سمجھ نہیں پا رہی کہ آخری مصرع بتا رہا ہے۔ ابھی بابا سے ملنے کی اُمید باقی ہے۔ بچّی پھوپھی سے دردِ دل بیان کر رہی ہے کہ درِ زنداں مقفل ہو جاتا ہے اور اس تنگ و تاریک گھر میں شبِ تار کا سا اندھیرا چھا جاتا ہے ؎

بچوں سے مائیں ماؤں سے بچّے بچھڑ گئے

سکینہ اور زیادہ پریشان ہو جاتی ہے وہ لاکھ یہ کہے کہ لوگ مجھے بہلاتے ہیں۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ مگر کم سنی کا یہ تقاضا ہے کہ ان بہلاوے کی باتوں کو ذہن قبول کر لیتا ہے۔ باپ بھائی چچا سب کے واپس آنے کی اُمید بندھی ہوئی ہے۔ اب وہ رو رو کر ہر ایک سے پوچھتی ہے کہ درِ زنداں تو بند ہو گیا۔

کھولے گا قفل کون جو عباس آئیں گے
لو اب پدر کدھر سے مرے پاس آئیں گے

ماں پھوپھی خاموش ہیں، کیا جواب دیں اس فرقت زدہ بچّی کو۔ ان کو خاموش دیکھ کر ؎

دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریبِ در
پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر
دربانو! جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر

پھر منت کے انداز میں یہ کہنا:

بے کس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

اور جب دروازے کے باہر ہی سے دربان پوچھتے ہیں، آخر تو ہے کون؟ تو کہتی ہے ؎

چھوٹے سے سن میں قیدیِ زندانِ شام ہوں
میں دخترِ حسینِ علیہ السّلام ہوں

اس جواب میں عزتِ نفس، فخر اور درد سب کچھ موجود ہے۔ میں اس چھوٹی سی عمر میں دشمن کی قید میں ضرور ہوں مگر میرا درجہ اور مقام بلند ہے کہ حسین علیہ السّلام کی بیٹی ہوں۔ جو التجا ظالم دربانوں سے کی جا رہی ہے اس میں بھی خود داری موجود

ہے۔ ؎

کہتی نہیں میں یہ کہ کرو قید سے رہا ۔ چھٹ جائیں گے کبھی کہ اسیروں کا ہے خدا
کھانے کی کچھ طلب ہے نہ پانی کی التجا ۔ ہاں قفل کھول دو گے تو دوں گی تمھیں دعا

جائیں گے ہم کہاں کہ تمھارے حوالے ہیں
بابا حسینؑ آج کی شب آنے والے ہیں

بھوک اور پیاس سے بے حال ہے، قید خانے میں دم گھٹا جارہا ہے مگر اپنے لیے کچھ نہیں مانگتی، باپ کی جدائی کے صدمے نے ہر دکھ کے احساس کو دبا دیا ہے۔ ہاں ان سے ملنے کی آس جینے کا سہارا ضرور ہے۔ ڈر یہ ہے کہ وہ آئیں، اور دروازہ بند دیکھ کر واپس چلے جائیں ؎

اصغر ہے ان کے پاس یقیں ہے کہ جلد آئیں
دھڑکا مجھے یہ ہے کہ کہیں آکے پھر نہ جائیں

پھر خیال آتا ہے کہ دربان ابھی سے دروازہ شاید نہ کھولیں تو التجا کی جاتی ہے ؎

آکر پکاریں شاہ تو تم کھول دیجیو

نظروں میں باپ بھائیوں کی شکلیں پھر رہی ہیں۔ سوچتی ہے یہ لوگ بابا کو کیسے پہچانیں گے؟ تو انھیں، پتہ نشان بتایا جارہا ہے ؎

باندھے ہے مصطفےٰؐ کا عمامہ وہ تاجدار
اور ہے نشانِ سجدہ ستارا سا آشکار

بھائیوں کا حلیہ بھی بتاتی ہے :

ساتھ اُن کے ہوئے گا علی اکبر سا گلعذار
گیسو لٹکتے ہیں رخِ روشن پہ اس کے چار

خیال آتا ہے بابا سے آگے آگے ہمیشہ چچا جان اُن کے آنے کی خبر لے کر گھر میں

آیا کرتے تھے۔

ہوں گے جلو میں حضرتِ عباس نوجواں
ہوتا ہے جن سے دبدبۂ شیرِ حق عیاں

جیسے ذہن میں آخری رخصت کی شان بجلی کی طرح کوند جاتی ہے :

اک دوش پر تو مشک ہے اک دوش پر نشاں

لیکن شقی القلب دربان بچّی کی ساری التجاؤں، خوشامدوں اور مصیبت سن کر یہ کہتے ہیں :

رونا نہ کم کرے گی تو شبیر کے لیے
بلوائیں شمر کو تری تعزیر کے لیے

یہ بات سن کے سہم گئی وہ جگر فگار دروازے سے سرک کے لگی رونے زار زار

ماں بچّی کو ڈھونڈتی ہوئی دروازے تک پہنچ جاتی ہے

بی بی کدھر گئیں ادھر آؤ یہ ماں نثار

اور حسرت و درد کی ایک دنیا شاعر نے اس شعر میں بھر دی ہے ؎

کھولے گا کون در کسے چلاتی پھرتی ہو
واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو

ماں کو پاس دیکھ کر سہمی ہوئی بچّی پھر سے وہی ضد کرنے لگتی ہے

واں کیا ہے یاں نہ بیٹھ کے آنسو بہاؤں میں
اچھا مجھے پدر سے ملا دو تو آؤں میں

بے بس، مجبور، مصیبت زدہ ماں بچّی کی باتیں سنتی ہے مگر کیا کہے، کیسے کہے کہ ملاؤں کس سے، تیرا باپ تو جنّت کو سدھارا۔ بیٹی ماں کو خاموش پا کر اور زیادہ خفا ہو جاتی ہو؎

اصغر کو اپنی گود میں لو مجھ سے کیا ہے کام پیاری تھی سارے گھر کی میں تھے جب تلک امام

اماں بس اب پکار و نہ لے لے کے میرا نام　　تم اپنے دل میں سمجھو کہ میں ہو گئی تمام

سبطِ رسول سے مجھے پیارا کوئی نہیں
بابا ہی جب نہیں تو ہمارا کوئی نہیں

ماں درد کے ساتھ کہتی ہے۔

ہاں بی بی سچ ہے مری ہی تقصیر ہے یہ سب

اور پھر بیٹی کے قریب پہنچ جاتی ہے:

روتی تھی منہ کو کُرتے سے ڈھانپے وہ مہ جبیں
پاس آکے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں

روٹھے بچے کی کیفیت کی کس غضب کی عکاسی ہے۔ ؎

سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئی
پھر ننھے ہاتھ اُٹھا کے گلے سے لپٹ گئی

سارا کنبہ بچی کے گرد جمع ہو جاتا ہے اور اسے تسلی دلاسا دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے ؎

زخمی ہیں پھر نہ دکھنے لگیں کان سو رہو　　ماں کہتی تھی تھپک کے مری جان سو رہو
کبرا یہ کہتی تھی بہن اک آن سو رہو　　فرماتی تھی پھوپھی کہ میں قربان سو رہو

بڑی بہن سے ننھی سی بہن کا یہ حال دیکھا نہیں جا رہا۔ کتنی چھوٹی سی تمنا مگر کتنی مشکل۔

جی چاہتا ہے چین ملے ایک دم تمہیں

پھر بہلانے کے لیے یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے:

بابا جب آئیں گے تو جگا دیں گے ہم تمہیں

بچی کے دل پر اب یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اس زندگی میں بابا سے ملنے کی امید نہیں۔

"سوؤں گی اب تو قبر میں میں جا کے چین سے"

آیا کرتے تھے۔

ہوں گے جلو میں حضرتِ عباس نوجواں
ہوتا ہے جن سے دبدبۂ شیرِ حق عیاں

جیسے ذہن میں آخری رخصت کی شان بجلی کی طرح کوندجاتی ہے:

اک دوش پر تو مشک ہے اک دوش پر نشاں

لیکن شقی القلب دربان بچّی کی ساری التجاؤں، خوشامدوں اور مصیبت سُن کر یہ کہتے ہیں:

رونا نہ کم کرے گی تو شبیر کے لیے
بلوائیں شمر کو تری تعزیر کے لیے

یہ بات سُن کے سہم گئی وہ جگر فگار دروازے سے سرک کے لگی رونے زار زار

ماں بچّی کو ڈھونڈتی ہوئی دروازے تک پہنچ جاتی ہے

بی بی کدھر گئیں ادھر آؤ یہ ماں نثار

اور حسرت و درد کی ایک دُنیا شاعر نے اس شعر میں بھر دی ہے ؎

کھولے گا کون در کسے چلاتی پھرتی ہو
واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو

ماں کو پاس دیکھ کر سہمی ہوئی بچّی پھر سے وہی ضد کرنے لگتی ہے

واں کیا ہے یاں نہ بیٹھ کے آنسو بہاؤں میں
اچھا مجھے پدر سے ملا دو تو آؤں میں

بے بس، مجبور، مصیبت زدہ ماں بچّی کی باتیں سنتی ہے مگر کیا کہے، کیسے کہے کہ ملاؤں کس سے، تیرا باپ تو جنّت کو سدھارا۔ بیٹی ماں کو خاموش پا کر اور زیادہ خفا ہو جاتی ہو ؎

اصغر کو اپنی گود میں لو مجھ سے کیا ہے کام پیاری تھی سارے گھر کی میں تھے جب تلک امام

تم اپنے دل میں سمجھو کہ میں ہو گئی تمام   اماں بس اب پکارو نہ لے لے کے میرا نام

سبطِ رسول سے مجھے پیارا کوئی نہیں
بابا ہی جب نہیں تو ہمارا کوئی نہیں

ماں درد کے ساتھ کہتی ہے۔

ہاں بی بی سچ ہے مری ہی تقصیر ہے یہ سب

اور پھر بیٹی کے قریب پہنچ جاتی ہے:

روتی تھی منہ کو کرتے سے ڈھانپے وہ مہ جبیں
پاس آکے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں

روٹھے بچے کی کیفیت کی کس غضب کی عکاسی ہے۔ ؎

سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئی
پھر ننھے ہاتھ اُٹھا کے گلے سے لپٹ گئی

سارا کنبہ بچی کے گرد جمع ہو جاتا ہے اور اسے تسلی دلاسا دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے ؎

ماں کہتی تھی تھپک کے مری جان سو رہو   زخمی ہیں پھر نہ دکھنے لگیں کان سو رہو
فرماتی تھی پھوپھی کہ میں قربان سو رہو   کبرا یہ کہتی تھی بہن اک آن سو رہو

بڑی بہن سے ننھی سی بہن کا یہ حال دیکھا نہیں جا رہا۔ کتنی چھوٹی سی تمنا مگر کتنی مشکل۔

جی چاہتا ہے چین ملے ایک دم تمہیں

پھر بہلانے کے لیے یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے:

بابا جب آئیں گے تو جگا دیں گے ہم تمہیں

بچی کے دل پر اب یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اس زندگی میں بابا سے ملنے کی اُمید نہیں۔

"سوؤں گی اب تو قبر میں میں جا کے چین سے"

مگر ہے تو آخر بچی ہی۔ سب کے سمجھانے بجھانے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ پھر سے باپ سے ملنے کی آس بندھ جاتی ہے۔ مگر فکر ہے کہ بابا جب یہ سنیں گے کہ مجھ پر ایسے ایسے ظلم و ستم ہوئے تو انھیں بڑا دکھ ہوگا۔ معصوم محبت کی کیسی روح پرور و دل گداز کیفیت ہے:

میرے طمانچے کھانے کا ان سے نہ کہیو حال
اماں، بہت کڑھیں گے شہنشاہِ خوش خصال

یہ اندیشہ بھی ہے کہ بہادر بھائی اور چچا کو غصہ نہ آجائے ؎

ہوئے گا غیض سے علی اکبر کا رنگ لال
عباس نامدار کو آجائے گا جلال

ایسا ہوا تو کہیں پھر وہی جنگ و خون خرابہ نہ ہو جس کے سبب وہ اپنے پیاروں سے بچھڑ گئی:

منظور ہے کہ قیدِ ستم سے رہائی ہو
ایسا نہ ہو کہ پھر کہیں ان سے لڑائی ہو

ملاقات کی تمنا کا چراغ ایک دم بھڑک اٹھتا ہے تو والہانہ انداز کے ساتھ کہتی ہے ؎

کیوں اماں جان قبلۂ عالم ابھی جو آئیں ۔۔۔ رو کر کس اشتیاق سے مجھ کو گلے لگائیں
جیتا خدا کرے علی اصغر کو ساتھ لائیں ۔۔۔ صدمے جو گذرے ہیں وہ سبھی مجھ کو بھول جائیں

سو جان سے نثار شہِ خوش خصال کے
کیا سوؤں ہاتھ چاند سی گردن میں ڈال کے

بابا آتے ہی اسے گلے لگائیں گے یہ دل کو یقین ہے اور اس کے ساتھ سارے دکھ سارے صدمے بھول جائیں گے۔ یہ بھی جانتی ہے کہ ماں اس کے ننھے بھیا کی جدائی میں بے قرار ہے تو اسے بھی تسلی دی جا رہی ہے:

مصرع بول رہا ہے کہ بچّی کے ذہن کے کسی گوشے میں علی اصغر کی شہادت کی پرچھائیں بھی موجود ہے "خدا کرے" کا یہ ٹکڑا اسی کے تحت منھ سے نکلا ہے مگر یہ ایک لاشعوری کیفیت ہے۔ پھر سب کچھ بھول کر باپ کے سینے سے لپٹ کر سونے کا تصوّر کرتی ہے ؎

کیا سوؤں ہاتھ چاند سی گردن میں ڈال کے

اچانک قید خانے کے دروازے پر ہل چل سی مچتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے یزید کی بیوی زنداں میں قیدیوں کے پاس آرہی ہے۔ بیویاں سنتی ہیں کہ دربان آپس میں کہہ رہے ہیں

بے وجہ نہیں کچھ نہ کچھ اس کا بھی سبب ہے
لڑکا کوئی لے یا کسی لڑکی کی طلب ہے

یہ سن کر سکینہ ڈر کر پھوپھی سے لپٹ جاتی ہے کہ باپ کے بعد سرپرستی اور حفاظت کا احساس اسی آغوش میں ہوتا ہے ؎

جی ڈرتا ہے لے لو مجھے گودی میں پھوپھی جاں
بتلاؤ تو کیا کہتے ہیں زنداں کے نگہباں

پھر حیرت، خوف اور حسرت کے ساتھ یہ کہنا:

بچپن پہ ہمارے نہ ترس کھائے گا کوئی
کیا ہم کو پھوپھی چھین کے لے جائے گا کوئی؟

بچّی نے اتنے ظلم و ستم سہارے ہیں کہ اب کوئی ظلم بھی بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ مگر پھوپھی شیرِ خدا کی بیٹی محمد مصطفےٰؐ کی نواسی جانتی ہے کہ ظلم و ستم کہاں تک جھیلا جا سکتا ہے اور کہاں نہیں۔ کس کی مجال ہے کہ علیؑ کی پوتی کو علیؑ کی بیٹی کی گود سے چھین سکے ؎

زینب نے کہا تم نہ ڈرو تم یہ میں واری   کیا ہوتا ہی کہنے دو جو کچھ کہتے ہیں ناری
جیتی ہے ابھی تو اسد اللہ کی پیاری   وہ کون ہے جو چھینے گا بچی کو ہماری
بگڑوں تو ابھی خاک میں اعدا کو ملا دوں
میں چاہوں ابھی عرشِ الٰہی کو ہلا دوں

بھتیجی پھوپھی کا جلال دیکھ کر مطمئن سی ہوجاتی ہے مگر ظالم حاکم کے ستم گر اہل کار مصیبت زدوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام کر رہے ہیں ؎

دربانوں نے پوچھا یہی بچی ہے سکینہ   عاشق تھے اسی بیٹی کے سلطانِ مدینہ
بیٹا یہی کرتی ہے سحر تک سرِ سینہ   اچھا تو ہے فرزندی میں دینے کا قرینہ
بچہ نہ ہو جس گھر میں وہ آباد نہیں ہے
سچ ہے زنِ حاکم کے بھی اولاد نہیں ہے

اس پر علیؑ کی بیٹی بحث و تکرار نہیں کرتی۔ بس یہ کہہ کر بات ختم کر دیتی ہے ؎

فرزندی میں دوں جو ہے مری گود کی پالی
پوتی اسد اللہ کی بنتِ شہِ عالی

گویا انھیں جتا دیتی ہیں کہ یہ ایسی ناممکن بات ہے جس کو دنیا کے سارے ظلم و ستم اور طاقت کے کُل ہتھیار مل کر بھی ممکن نہیں بنا سکتے۔

یزید کی بیوی ہند کے زندانِ شام میں آنے کا حال انیس نے کئی مرثیوں میں بیان کیا ہے اور اس خبر کا ردِ عمل شہر بانو پر، زینب پر، سکینہ پر کیا ہوا، اسے متعدد جگہ دکھایا ہے۔ ایک مرثیے میں جس کے بہت سے بند ہم گذشتہ صفحات میں دے چکے ہیں، سکینہ کا حال یوں بیان کرتے ہیں کہ جب زوجۂ ہند زنداں میں آئی اور سرِ سیّد الشہدا منگوایا تو تمام بیبیاں عالمِ بے قراری میں نالہ و فریاد کرنے لگتی ہیں اور

اس حشر میں رہی نہ سکینہ کی کچھ خبر

بچّی جو ذرا دیر کو سو گئی تھی، اس شور و غل سے اُٹھ جاتی ہے تو سامنے ہی اِسے امام حسینؑ کا سرِ بریدہ نظر پڑتا ہے ؎

جب سر پہ شاہِ دیں کے سکینہ نے کی نظر
چلائی رو کے ہائے غضب مر گئے پدر

اور پھر دوڑ کر باپ کے سر سے لپٹ جاتی ہے۔

منھ رکھ کے منھ پہ شہ کے جو روئی وہ دلفگار
صدمہ ہوا نکلنے لگی تن سے جانِ زار

ظلم و ستم کے پہاڑ، قید کے مصائب، صدموں کا جان لیوا بوجھ بچّی ابھی تک اس اُمید پر سہار رہی تھی کہ ایک دن بابا سے ملے گی۔ لیکن تارِ جاں جس آرزو سے بندھا تھا وہ اب ٹوٹ گئی۔

جنبش ہوئی لبوں کو بس اور دم نکل گیا

غمِ ہجر کی ماری بیٹی کے لیے موت زندگی کا پیام لائی۔ محبوب باپ کا سر اسے لینے آیا تھا۔ اس سے مل کر سارے دُکھ درد دُور ہو گئے۔ بقول شاعر ؎

دل کو سکون، روح کو آرام آگیا
آپ آئے کیا کہ دوست کا پیغام آگیا

واقعۂ کربلا کی خونیں تاریخ میں امام حسینؑ کی یہ بچّی سکینہ حق پرستوں اور اہلِ دل کی بڑی محبوب اور محترم ہستی ہے۔ المیہ کربلا کے اس کردار میں انیسؔ نے خونِ جگر سے وہ رنگ بھرے ہیں جس نے اس کردار کو نہ صرف اُردو مرثیہ کی تاریخ کا بلکہ پورے اُردو ادب کا ایک بڑا دلکش، دلگداز و لافانی کردار بنا دیا ہے۔

مثالی بیوی
شہر بانو

شہر بانو امام حسینؑ کی پہلی بیوی کا نام ہے جو شاہِ ایران کی بیٹی تھیں۔ حضرت عمر کے زمانے میں ایران فتح ہوا تو بندی میں جو عورتیں اور لڑکیاں آئیں ان میں شہر بانو بھی تھیں۔ شجاعانِ عرب نے اس شریف و نجیب شہزادی کی عزت کا پاس کیا اور کئی لوگ ان سے عقد کے خواہش مند ہوئے۔ حضرت علیؑ نے ان کو آزاد کرا کے اپنے بیٹے حسینؑ سے ان کا عقد کر دیا۔ روایت میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس قید و بند سے بہت پہلے شہر بانو نے خواب میں فاطمہؑ زہرا کو دیکھا تھا اور خواب ہی میں اسلام قبول کیا اور بنتِ رسول نے انھیں اپنی بہو بنایا تھا اور اسی وقت سے وہ نادیدہ، شہزادۂ اسلام کی پرستار بن چکی تھیں۔ بندی میں مدینے آنے کے بعد اس خواب کی تعبیر نکلی۔

انیس نے ایک مرثیے میں میاں بیوی کی گفتگو کے دوران اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ شہر بانو امام حسینؑ سے کہہ رہی ہیں ؎

جب خواب میں آئی تھیں مرے آپ کی مادر
کس پیار سے چھاتی سے لگایا تھا مرا سر
ارشاد کیا تھا یہ دلھن مجھ کو بنا کر
میں فاطمہ ہوں اور ترا دولھا مرا دلبر
لائی ہوں کمائی کو شہ عقدہ کشا کی
لے دیکھ لے صورت تو مرے ماہ لقا کی

لونڈی نے جو گردن سر زانو سے اٹھائی
حضرت کی یہی چاند سی صورت نظر آئی
اس حسن کے نظارے کی میں تاب نہ لائی
پر بیکسی و یاس سی تھی چہرے پہ چھائی
قطرے کئی رخساروں پہ آنکھوں سے ڈھل آئے
حضرت تو ہنسے اور مرے آنسو نکل آئے

یاں آئی میں جب خانۂ کسریٰ ہوا برباد
وہ پہلی اسیری کی اذیت ہے مجھے یاد[1]
کی عقدہ کشائے دوجہاں نے مری امداد
حضرت کے تصدق سے ہوئی قید سے آزاد
لونڈی تھی بہو ہو گئی زہرا و علیؑ کی
قسمت نے بٹھایا مجھے مسند پہ نبیؐ کی

امام حسینؑ اور شہر بانو میں گہری محبت اور سچی رفاقت تھی۔ بانو کو اپنے شوہر کی عظمت کا احساس بھی تھا اور ان سے گہری عقیدت بھی اور اس پر ناز بھی کہ قسمت نے انھیں اس اونچے مرتبے تک پہنچایا۔

شہر بانو کو اپنے شوہر سے کس درجہ الفت تھی، ان کی رضا جوئی اور خوشی کی کس حد تک متلاشی رہتی تھیں، اس کا تذکرہ انیسؔ نے شہر بانو کی کنیز شیریں کے حال کے مرثیے میں کیا ہے کہ جب شادی کے بعد آپ مدینے میں قیام پذیر تھے تو ؎

بانو سے جو مانوس شہنشاہِ زمن تھے
کچھ پیار کی باتیں تھیں محبت کے سخن تھے

---

[1] یہاں اذیت سے ذہنی اذیت مراد ہے۔

شیریں پہ جو حضرت کی نظر جا پڑی اک بار
بانو سے یہ بولے بہ تبسّم شہِ ابرار
خوش چشم ہے کس مرتبہ شیرینِ خوش اطوار
اس طرح کی آنکھیں کہیں دیکھیں نہیں زنہار
فرمائی جو یہ بات شہنشاہِ امم نے
نہوڑا لیا سر دخترِ سلطانِ عجم نے

سوچی وہ کہ میلانِ شہِ جن و بشر ہے
کی آنکھوں کی تعریف تو منظورِ نظر ہے
پھر دل سے کہا عاشقِ صادق تو اگر ہے
معشوق جو راضی ہو تو کیا اس میں ضرر ہے
فرزندِ نبی، ابنِ شہنشاہِ نجف ہے
شیریں کی کنیزی میں مجھے دیں تو شرف ہے

یہاں شاعر کا مبالغہ کچھ حد سے بڑھا ہوا محسوس ہوتا ہے مگر اس کا مقصد شہر بانو کی گہری محبت اور دلی عقیدت دکھانا ہے۔ بہر حال شاعر آگے بیان کرتا ہے۔ ؎

یہ کہتی ہوئی دل سے وہ اک حجرے میں آئی
شیریں کو اشارے سے بلاتی ہوئی لائی
شانہ کیا، سرمہ دیا، پوشاک پہنائی
حیرت ہوئی شیریں کو تو یہ بات سنائی
کھلتا نہیں کچھ مجھ پہ یہ اسرار میں صدقے
کیوں کرتی ہو لونڈی کو گنہ گار میں صدقے

وہ بولیں کہ میں نے تجھے بچپن سے ہے پالا
آزاد کیا سب کو، پہ تجھ کو نہ نکالا
اب تجھ پہ پڑی ہے نظرِ سیدِ والا
رتبہ ترا شہزادیوں سے اب ہے دوبالا

پھر شوہر کے پاس آتی ہیں ؎

کچھ کہنا ہے اُٹھیے تو کروں حال وہ اظہار

امام حسینؑ سوچ رہے ہیں کہ شیریں کی تعریف بیوی کو گراں گزری ہے، کہ ؎

شہ سمجھے گلہ ہوگا دل افسردہ ہے بانو
تعریف پہ شیریں کی کچھ آزردہ ہے بانو

اُٹھ کر گیا زہرا کا پسر بانو کے ہمراہ
پردہ اُٹھا حجرے کا تو کیا دیکھتے ہیں شاہ
ہے موتیوں میں شیریں، تاروں میں ہے جوں ماہ
فرمانے لگے بانو سے ہنس کر شہِ ذیجاہ

جو سمجھی ہو تم اس کا مجھے دھیان نہیں ہے
جب تم سی ہو بی بی تو کچھ ارمان نہیں ہے

پھر بانو کے اصرار پر فرماتے ہیں ؎

تم نے تو دیا ہم کو کہ صادق ہو وفا میں
ہم نے اسے آزاد کیا راہِ خدا میں

اب تک تو وفا کا تقاضا پورا کیا جا رہا تھا مگر یہ سن کر دل مسرت سے جھوم اُٹھتا ہے۔

خوش ہو کے پھری گرد محبت سے کئی بار

اور اس خوشی میں شیریں کو زر و زیور سے مالا مال کر دیا۔

یہ روایت درایت کی کسوٹی پر کہاں تک پوری اُترتی ہے، ہم نہیں جانتے۔ ویسے بھی اس قصے میں ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی بیوی کا انداز اتنا نمایاں ہے کہ کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ دراصل انیسؔ کا مقصد بھی اس پس منظر میں بانو کی گہری محبت کا جلوہ دکھانا تھا کہ یہی محبت تھی جس نے سخت سے سخت وقت میں شوہر کی رضا اور حکم کا نہ صرف پابند رکھا بلکہ ان کی محبت میں بڑے سے بڑا دُکھ دل کی پوری آمادگی کے ساتھ جھیلا۔

واقعۂ کربلا کی تاریخ میں اختلاف ہے کہ اس وقت شہر بانو زندہ تھیں یا نہیں۔ امام کی دو اور بیویوں رباب اور اُمِ لیلیٰ کا تذکرہ زیادہ آتا ہے۔ اُمِ لیلیٰ علی اکبر کی اور رباب، سکینہ و علی اصغر کی والدہ تھیں۔ لیکن انیسؔ نے اس روایت کو اپنایا ہے کہ واقعۂ کربلا کے وقت شہر بانو زندہ تھیں۔ یہی نہیں وہ امام کے سب بچوں کی ماں انھیں کو بتاتے ہیں اور رباب و اُمِ لیلیٰ کسی کا نام نہیں لیتے۔ ہر جگہ بانو، یا

بانوے حسینؑ یا شہر بانو ہی کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا موضوع انیسؔ کی تاریخی غلطیاں نکالنا نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ جن خواتین کی سیرت و اخلاق کی مرقع کشی انیسؔ نے کی ہے۔ ان میں شہر بانو کا کردار ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کردار میں اگرچہ زینب کے کردار جیسی روحانیت اور عظمت نہیں۔ انسانی کمزوریاں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں لیکن ایک عاشقِ زار و فاشعار بیوی، چاہنے والی جاں نثار ماں، حق پرست ایثار پرست مومن عورت کا مکمل کردار سامنے آجاتا ہے۔ میاں بیوی کی محبت اور یک جہتی، ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا پاس، اس پُراثر اور فطری رنگ میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ قدسی صفات ہستیاں ہمارے آپ کے جیسے انسان معلوم ہونے لگتے ہیں اور دل سے اور زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں۔

امام حسینؑ صغرا کو مدینے میں چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس وقت سب سے پہلے شہر بانو کے صبر اور شوہر کی رضا پر راضی رہنے کا منظر نظر آتا ہے۔ بیٹی کو ماں کی خاموشی سے شکایت ہے۔

اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

ماں کے دل پر جو بھی گزر رہی ہے مگر بچّی کو دلاسا دینے کی کوشش کرتی ہے۔

میں صدقے گئی اب نہ کرو گریہ و زاری

کبھی کہتی ہیں۔

بیکس مری بچی ترا اللہ نگہباں
صحت ہو تجھے مری دعا ہے یہی ہر آں

سفر میں ہر وقت بچھڑی بیٹی کا دھیان رہتا ہے۔ راستے میں اپنے دیور ابنِ حنفیہ سے یہ کہتی سنائی دیتی ہیں ؎

کہہ دیجو کہ مادر تمھیں بھولی نہیں واری ۔۔۔ اصغر مری گودی میں کیا کرتا ہے زاری

بہنوں کو بھی ہے آٹھ پہر یاد تمہاری

جانتی ہے کہ صغرا کو یہ سن کر کچھ تسلی ہو گی کہ بھائی بہن اسے یاد کرتے ہیں ۔ دل پریشان ہے کہ کنبے کی جدائی میں جانے بچی کا کیا حال ہو گا۔ کس درد سے کہلوایا جا رہا ہے ؎

ماں صدقے نہ تم آپ کو کُڑھ کُڑھ کے گھلانا　　ہمجولیوں کو پاس ، محلے کی بلانا

ایامِ جدائی بھی گذر جائیں گے بی بی

اللہ جو پھیرے گا تو پھر آئیں گے بی بی

سفر میں گرمی کی شدت ہے ، پانی کی کمی ، بچوں کی حالت پیاس اور گرمی سے تباہ ہے۔ گود کا بچہ علی اصغر نڈھال ہے ۔مصیبت و پریشانی میں عورت ہمیشہ شوہر سے مدد کی طالب ہوتی ہے ۔ اس کیفیت کو انیس کتنے فطری انداز میں دکھاتے ہیں :

اہلِ حرم ہیں ہودج و محمل میں بیقرار　　معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار

بانو پکارتی ہے کہ یا شاہِ نامدار　　گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفلِ شیرخوار

کیوں کر یہ دکھ اُٹھے چھ مہینے کی جان سے

گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

لیکن شہر بانو کا بھرپور کردار روز عاشورہ سامنے آتا ہے۔ جب صبح صادق سے لے کر مغرب تک اس بی بی نے اپنا سب کچھ راہِ خدا میں لٹا دیا۔ انیس نے ان سب واقعات کو جن کا تعلق شہر بانو سے ہے ، بڑی تفصیل اور نئے نئے انداز سے متعدد مرثیوں میں بیان کیا ہے۔ کبھی وہ ہمیں نئی بیاہی بیٹی کبرا کے بیوہ ہو جانے پر اُسے سنبھالتی نظر آتی ہیں اور کبھی سمدھن کو پُرسا دیتی ملتی ہیں۔ کبھی اپنی نند زینب سے محبت اور کبھی عقیدت کا اظہار کرتی ہیں۔ کبھی کڑیل جوان بیٹے کی دلداری کرتی اور

اس کو راہِ خدا میں قربان ہونے کی اجازت دیتی نظر آتی ہیں اور کبھی شوہر کے حکم پر ننھے دودھ پیتے بچے کو میدان جنگ میں بھیجنے پر سرِ تسلیم خم کرتی ہیں۔ ان کی ہر ہر ادا میں عورت کا نازک، حساس، ممتا سے بھرپور دل جھلکتا ہے جو ہر جدائی پر تڑپتا، ہر صدمے سے بے حال ہو جاتا ہے۔ جوان بیٹے کی شہادت پر، ننھے بچے کی موت کی سناونی سن کر، صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے مگر کسی حال میں بھی شکوہ زبان پر نہیں آتا ہے، نہ رضائے شوہر پر راضی رہنے کی عادت میں فرق۔ شوہر کی مفارقت جو سب سے زیادہ روح فرسا ہے اس وقت وہ بہ تقاضائے الفت شکوہ کرتی سنائی دیتی ہے مگر شوہر کی خوشنودی بہر حال مطلوب ہے اور آخر ان کی جدائی بھی سہارنے پر تیار ہو جاتی ہے۔

روزِ عاشورہ کا خونیں آفتاب ڈھل رہا ہے۔ حسینی لشکر کے سب سپاہی جامِ شہادت پی چکے۔ اب صرف حسینؑ کا اٹھارہ سال کا جوان بیٹا رہ گیا ہے جو باپ پر قربان ہونے کے لیے صبح سے بیقرار ہے، بار بار اجازت مانگتا ہے مگر نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ عباس بھی شہید ہو جاتے ہیں اور دشمن حسینؑ سے طنز و طعن کی باتیں کرتے سنائی دیتے ہیں:

بھائی کا داغ اور ہے داغِ پسر ہے اور　　　بازو کا زخم اور ہے قوت جگر کی اور
گر صبر ہے تو گود کے پالے کو بھیجیے
تیغوں میں اپنے گیسوؤں والے کو بھیجیے

یہ سن کر علی اکبر کو غصہ آتا ہے۔

اکبر نے کی غضب کی نظر سوئے فوجِ شام　　　کانپے یہ غیض سے کہ اگلنے لگی حسام
اور امام سے کہا ؎

ہم کو یہ طعن و طنز کی باتیں نہیں پسند

عمو کو قتل کر کے بہت ہو گئے ہیں شیر
ان ظالموں کے زعم میں اب ہم نہیں دلیر
ہنس ہنس کے جسم پر تبر و تیر کھائیں گے
تیغِ زباں کے زخم اُٹھائے نہ جائیں گے

صابر باپ راہِ حق میں لختِ جگر کو بھی قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے مگر وہ صرف اپنی طرف سے اجازت دے سکتا ہے، ماں سے اجازت دلانے کی ہمّت خود میں نہیں پاتا:

تم سے جو سو پسر ہوں تو اس راہ میں نثار
ہاں ماں نہ جانے دے تو مرا کیا ہے اختیار
سینے میں دل ہلے گا، بدن تھرتھرائے گا
رخصت کا نام سنتے ہی غش اس کو آئے گا

پھر پھوپھی کی محبت کا ذکر کر کے فرماتے ہیں:

یہ مرحلہ بھی کم نہیں زنجیر و طوق سے
دونوں رضا جو دیں تو چلے جاؤ شوق سے

علی اکبر خیمے میں ماں اور پھوپھی سے اجازت مانگنے کے لیے آتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ یہ کیسی صاحبِ عزم و مومن بیبیاں ہیں۔ وہ راہِ حق میں اپنے پیارے کو قربان ہونے کی ضرور رضا دے دیں گی اور پھر حسینؑ سے جو دونوں کو اُلفت ہے وہ بھی بیٹے سے چھپی ہوئی نہیں۔ پھر بھی دل ڈر رہا ہے۔ ماں آخر ماں ہے ماتا نہ مانے تو . . . .

روتے ہوئے چلے علی اکبر سوئے خیام
دوڑی پسر کو دیکھ کے بانوئے نیک نام

بیٹے کو روتے دیکھ کر بیقرار ہو کر پوچھتی ہے:

تم صبح سے گئے تھے اب آئے یہ ماں نثار
در پر تڑپ تڑپ کے میں جاتی تھی بار بار

پھر کس لاڈ سے جو صرف ماں کا حصّہ ہے، یہ کہنا :

گرمی یہ اور قحط کئی دن سے آب کا
رُخ تمتما گیا ہے مرے آفتاب کا
تر ہے قبا پسینے میں پنکھا کوئی ہلاؤ
سنولا گئے ہو دھوپ میں واری ہوا میں آؤ
جھاڑوں ردا سے گرد میں نُقوں کی بیٹھ جاؤ
گھٹ جائے گا لہو مرا، آنسو نہ تم بہاؤ
صدمہ جو دل پہ ہو اسے کچھ منھ سے کہتے ہیں
کیا ہے جو اشک نرگسی آنکھوں سے بہتے ہیں

بیٹے کو روتے دیکھ کر ایک دم بچھڑی بیٹی کی طرف دھیان جاتا ہے تو تڑپ کر پوچھتی ہیں ؎

صغرا کی تو وطن سے کچھ آئی نہیں خبر
جلدی کہو کہ منھ سے نکلتا ہے اب جگر
اکبر نے عرض کی کہ ہیں سب خیر سے مگر
لٹتا ہے کوئی آن میں خیر النساء[1] کا گھر
ملتی نہیں رضا ہمیں آنسو بہاتے ہیں
بابا گلا کٹانے کو میداں میں جاتے ہیں

باپ کا حال بتا کر ماں کو آمادہ کیا جا رہا ہے کہ بیٹے کو جنگ پر جانے کی رضا دے دیں ؎

دیتے نہیں رضا جو امامِ فلک اساس
خاطر فقط یہ آپ کی ہے یا پھوپھی کا پاس
اب غیر یاس کوئی نہیں ان کے آس پاس
ناطاقتی ہے، ضعف ہے، فاقہ ہے اور پیاس
کیونکر لڑیں گے وہ کہ سراپا ضعیف ہیں
پیری میں دل ضعیف ہے اعضا ضعیف ہیں

اور پھر روٹھ کر یہ کہنا ؎

---

[1] جناب فاطمہؑ کا لقب

اب زندگی ہے تلخ بہت دق ہیں جان سے
اُلفت نے آپ کی ہمیں کھویا جہان سے

انتہائی لاڈلا بیٹا ہی ماں سے اس انداز میں بات کر سکتا ہے ؎

بابا کا حکم ہے کہ رضا ماں سے جا کے لاؤ — راضی پھوپھی ہوں جب تو لڑو اور زخم کھاؤ
مرضی ہے آپ کی کہ مرے پاس سے نہ جاؤ — یا فاطمہ تمھیں علی اکبر کے کام آؤ
چلنے لگیں نہ تیر شرِ مشرقین پر
زرغہ ہے ظالموں کا تمھارے حسین پر

بیٹا خواہ مخواہ ماں سے روٹھا ہے۔ وہ شاید نہیں جانتا کہ ماں اس بات پر ناراض نہیں ہو گی کہ بیٹا مجھ سے زیادہ باپ کو چاہتا ہے بلکہ اسے تو فخر ہے کہ اکبر جیسے حق پرست مجاہد نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہے ؎

دیکھی گئی نہ ماں سے یہ بیتابیِ پسر — وارث کی بے کسی پہ لگا کانپنے جگر
ہاتھوں سے دل کو تھام کے بولی وہ نوحہ گر — دولت پہ فاطمہ کی تصدق تمام گھر
پہلے نہ کچھ کہا تھا نہ اب روکتی ہوں میں
روتے ہو کس لیے تمھیں کب روکتی ہوں میں

یہ ذرا سا ٹکڑا " دل کو تھام کے " نہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جو بدنصیب ماں پر بیت رہی ہے۔ مگر یہ عزم و حوصلہ: دیکھیے کہ میں نے نہ پہلے روکا تھا نہ اب روک رہی ہوں، پھر یہ خفگی کیسی؟

زہرا کے لال پر مرے مادر پدر نثار — عابد نثار، اصغرِ تشنہ جگر نثار
جانیں ہزار ہوں تو فدا، لاکھ گھر نثار — قربان گھر، کنیز تصدق، پسر نثار
کسرائی گو کہ ہوں پہ بہو میں علی کی ہوں
مانگو گے جو وہ دوں گی کہ لونڈی سخی کی ہوں

وہ یہ بھی تو کہہ سکتی تھی کہ میں بادشاہ کی بیٹی نوشیرواں کی پوتی ہوں مجھ سے جو بھی مانگو مل سکتا ہے۔ مگر انیس اس کے کردار کا یہ پہلو اجاگر کرتے ہیں کہ شہر بانو کو اپنے خاندان پر غرّہ نہیں بلکہ سسرال کی عظمت و بزرگی پر فخر ہے، علی کی بہو، ان کی لونڈی ہونے پر ناز ہے۔ بیٹا مرنے جارہا ہے، دل پر قیامت ٹوٹ رہی ہے مگر ایسے وقت میں بھی خیال آتا ہے تو یہ کہ میرے بیٹے کو پھوپھی نے پالا ہے اس لیے مجھ سے زیادہ حق ان کا ہے۔ اسی لیے بیٹے سے یہ کہتی سنائی دیتی ہیں کہ ؎

رخصت کا صدقے جاؤں پھوپھی سے کرو سوال
اصغر ہو یا کہ تم وہی مختار سب کی ہیں　　ہم سب کنیزیں بنتِ امیرِ عرب کی ہیں

ان کی خدمت اور محبت کا اعتراف بھی ہو رہا ہے ؎

کہنے کو یوں ہیں چاہنے والے تمہارے سب　　لیکن ہے ان کے عشق سے نسبت کسی کو کب
دن کو انھوں نے دن کبھی جانا نہ شب کو شب　　لیجے انھیں سے آپ کو جس شے کی ہو طلب
مجھ سے نہ کچھ نہ سیدِ عالی سے پوچھیے
گر پوچھیے تو پالنے والی سے پوچھیے

اُدھر جب زینب بھتیجے سے اُس کی ماں کی محبت اور خدمت کا تذکرہ کر کے یہ کہتی سُنائی دیتی ہیں ؎

یہ کچھ ماں کا حق بھی کم نہیں ہوتا ہے باپ سے

تو شہر بانو جو زینب کو فاطمہ زہرا کی جانشین سمجھتی اور بے حد احترام کرتی ہیں، انکساری سے نند کو جواب دیتی ہیں ؎

صدقے گئی کنیز کی خدمت کا ذکر کیا
اس قافلے میں آپ ہیں اب فاطمہ کی جا

اور پھر دلِ پُر درد سے یہ کہنا :

میں نے بھی دی جو آپ نے بیٹے کو دی رضا

بیٹے کی نند سے سفارش بھی کی جا رہی ہے تو کس انداز سے :

آپ اس کی ماں ہیں آپ کا فرزند ہے یہ لال ۔ دخل اس معاملے میں کوئی دے یہ کیا مجال
یہ عازمِ جدال ہے اور آپ کا یہ حال ۔ قدموں کو چھوڑتا نہ کبھی یہ نکو خصال

آپ اس کو چاہتی ہیں یہ صدقے ہے آپ پر
پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہے باپ پر

گھر میرا جب سے لٹ گیا اس گھر میں آئی ہوں ۔ شکوے کا کوئی حرف کبھی لب پہ لائی ہوں؟
کسریٰ کی گو کہ پوتی ہوں سلطاں کی جائی ہوں ۔ لونڈی ہوں آپ کی علی اکبر کی دائی ہوں

صدقہ یہ آپ کا ہے جو شہ کی عزیز ہوں
بھاوج نہ جانیے مجھے ' ادنیٰ کنیز ہوں

قسمت بُری ہے اس میں کسی کا قصور کیا ۔ اچھا رہیں کہ جائیں ہمارا بھی ہے خدا
پروا ہماری ہے نہ خیال ان کو آپ کا ۔ تابع ہم آپ کے بھی ہیں ان پہ بھی ہیں فدا

عابد ہوں یا کہ یہ ، سبھی آنکھوں کے تارے ہیں
پر اب تو یہ نہ آپ کے ہیں نے ہمارے ہیں

ہر ہر بات گواہی دیتی معلوم ہو رہی ہے کہ کہنے والی اس تہذیب و شرافت کی امین ہے جو صدیوں کے رچاؤ سے بنتی ہے اور ساتھ ہی صداقت پرستی اور ایمان و یقین کی دولت سے بھی اس کا دامن مالا مال ہے۔

امام حسینؑ جب یہ سنتے ہیں کہ ماں اور پھوپھی دونوں نے اکبر کو جانے کی اجازت دے دی تو حسرت سے کہتے ہیں :

بانو کے منھ کو دیکھ کے حضرت نے یہ کہا ۔ کیوں سچ ہے تم نے بیٹے کو مرنے کی دی رضا؟
وہ چپ رہیں تو بولے بہن سے شہِ ہدیٰ ۔ کہیے پھوپھی بھتیجے میں کیا فیصلہ ہوا؟

راہیں سب ان کے روکنے کی بند ہو گئیں
سنتا ہوں میں کہ تم بھی رضامند ہو گئیں

ماں اور پھوپھی کے بجائے اکبر جواب دیتے ہیں :

اماں نے بھی رضا ہمیں دی اور پھوپھی نے بھی
زہرا کی وہ بہو ہیں تو یہ دختر علیؑ

پھر دونوں کی صفات کا ذکر بڑے فخر سے کرتے ہیں :

عاشق ہیں یہ حضور کی یا شاہِ نامدار — مجھ سے ہوں سو پسر تو کریں آپ پر نثار
دیکھی ہیں کس نے بیبیاں ایسی فلک وقار — وہ ہاجرہ کا فخر، یہ مریم کا افتخار

سب فاطمہ کا صبر ہے خو ہو تو ایسی ہو
بیٹی ہو اس طرح کی بہو ہو تو ایسی ہو

بیٹے کی باتیں سن کر ماں اور پھوپھی بڑے پیار، بڑے ناز سے کہتی ہیں :

ماں نے کہا پسر کی فصاحت تو دیکھیے — نامِ خدا زباں کی طلاقت تو دیکھیے
زینب یہ بولیں ذہن کی جودت تو دیکھیے — ہر بات میں ثبوت اجازت تو دیکھیے

کیا بات بھائی ان کی بھلا بول چال کی
گویا زباں ہے مصحفِ ناطق کے لال کی

شہربانو شوہر سے کہتی ہیں کہ بھلا اکبر کے ہوتے آپ میدان جنگ کیسے جا سکتے ہیں
ے آقا ابھی تو زندہ ہے اکبر سا صف شکن

دکھ درد میں پدر کے پسر کام آتے ہیں
آپ ان کے ہوتے کس لیے میداں میں جاتے ہیں

اصرار کیا جا رہا ہے ے

میں آپ پر نثار بہن آپ پر فدا — میں صدقے جاؤں کیوں انھیں دیتے نہیں رضا

پھر دلیل دیکھیے۔ بیٹے کی باپ سے شدت کی محبت کا اشارہ بھی موجود ہے ؎

حضرت نہ ہوں گے جب تو جیے گا یہ مہ لقا　　　کنبے کو کھو کے گر یہ اکیلے رہے تو کیا

پھر ماں کہاں، چھٹے جو یہ قدموں سے باپ کے
پیارا ہمیں وہی ہے جو کام آئے آپ کے

دلیلیں وہی ہیں جو بیٹے نے اجازت طلب کرتے ہوئے دی تھیں۔ آخری شعر میں دونوں ماں بیٹے کی حالت کو کس خوبی سے سمو دیا ہے۔ اکبر میری وجہ سے آپ پر نہ قربان ہو سکا تو ماں کی کیا محبت اسے رہ جائے گی؟ اور پھر اپنا دل بھی کھول کر رکھ دیتی ہیں کہ مجھے بھی وہی پیارا ہو سکتا ہے جو دکھ مصیبت میں آپ کے کام آئے۔

امام حسینؑ بھی اکبر کو اجازت جنگ دے دیتے ہیں۔ علی اکبر کی خیمہ سے رخصت کا سماں جہاں جہاں انیسؔ نے کھینچا ہے، قیامت کا منظر ہے۔ ماں نے اعلیٰ مقصد پر کلیجے کے ٹکڑے کو قربان ہونے کی اجازت تو دے دی مگر آخر انسان ہے، عورت ہے، ماں ہے، کلیجہ پھٹا جا رہا ہے مگر صبر کا دامن تھامے ہے لیکن جب سارا خاندان ماتم کر رہا ہو تو کہاں تک برداشت ہو سکتا ہے ؎

تسلیم کر کے خیمے سے وہ سیم بر چلا　　　پیچھے حرم کا قافلہ سب ننگے سر چلا
بانو پکارتی تھی کہ پیارا پسر چلا　　　چلاتی تھی پھوپھی مرا لختِ جگر چلا

اک حشر تھا جدا علی اکبر جو ہوتے تھے
جھولے میں پھوٹ پھوٹ کے اصغر بھی روتے تھے

اور اس ایک شعر میں علی اکبر کی رخصت کی کیفیت کی کیسی حقیقی مصوری کی ہے ؎

ماتم تھا یہ حسین کے تازہ جوان کا
جاتا ہے جیسے گھر سے جنازہ جوان کا

علی اکبر میدانِ جنگ میں جاتے، رجز پڑھ کر کچھ دیر دشمن کی فوجوں سے بہادری

کے ساتھ جہاد کرتے ہیں، یہاں تک کہ لڑتے لڑتے زخموں سے چور چور ہو جاتے ہیں۔ ایک نیزہ سینے کو توڑتا ہوا نکل جاتا ہے اور اس حال میں باپ کو پکارتے ہیں۔ بیٹا جہاں سے جاتا ہے اب آئیے شتاب

حسینؑ کے کان میں یہ صدا آتی ہے تو ؎

سید نے آہ کی کہ ہلا عرشِ ذوالجلال

بانو پکاری خیر تو ہے اے علی کے لال

دروازے پر کھڑی بیٹے کی جنگ دور سے دیکھ رہی ہے۔ ہر دم یہ دھڑکا ہے کہ اب سناؤنی آئے گی۔ پھر بھی شوہر کی آہ سُن کر بلک کر یہ کہنا ماں تا کے جذبے کے عین مطابق ہے ؎

ہے ہے پسر سے کون سی ماں بچھڑ گئی؟

نیزے سے کس کے لال کا زخمی ہوا جگر کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہلِ شر

کہتا ہے کون رن میں تڑپ کر پدر پدر

اور پھر جیسے روح فرسا حقیقت ایک دم سامنے آجاتی ہے ؎

اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے مرا پسر

پردہ نہ مجھ سے کیجیے سب جانتی ہوں میں آواز یہ اسی کی ہے پہچانتی ہوں میں

امام حسینؑ کی اس وقت کی حالت کو انیسؔ نے متعدد مرثیوں میں اس کمال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جوان بیٹے کے غم میں نیم جان باپ کی کیفیت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک مرثیے میں امام کی حالت یوں دکھائی ہے ؎

دل تھا اُلٹ پلٹ تو کلیجہ تھا بیقرار اُٹھتے تھے اور زمین پہ گرتے تھے بار بار

چلاتے تھے شبیہ پیمبرؐ ہم آتے ہیں

گھبرائیو نہ اے علی اکبر ہم آتے ہیں

خود اپنی حالتِ زار بیٹے کو بتا رہے ہیں ؂

بیٹا پکار دو پھر کہ بصارت میں فرق ہے — اے نورِ عین جسم کی طاقت میں فرق ہے
تم یہ نہ جانیو کہ محبت میں فرق ہے — زخمی ہے قلب روح کی راحت میں فرق ہے
داغِ جگر ملا ہمیں گودی میں پال کے
کس کو دکھاؤں اپنا کلیجہ نکال کے

میدانِ جنگ میں زخموں سے چور کڑیل جوان زمین پر ایڑیاں رگڑتا ملتا ہے:

دشمن کو بھی نہ بیٹے کا لاشہ خدا دکھائے — حضرت زمین پہ گر کے پکارے کہ ہائے ہائے
زندہ رہے یہ پیر، جواں یوں جہاں سے جائے — اے لال تین روز کے فاقے میں زخم کھائے
شاید جگر کے زخم سے تم بے قرار ہو
زخمی تمھاری چھاتی کے بابا نثار ہو

الفاظ اور انداز ہندوستانی ضرور ہے لیکن جو سچے جذبات اس درد و غم کے پیچھے ہیں وہ ہر زمانے، ہر دور، ہر ملک، ہر قوم کے انسان کے دل کے جذبات ہیں اور ان مصرعوں میں تو حسرت و مایوسی کی ایک دنیا پوشیدہ ہے:

بیٹا تمھاری ماں کو تمھارا ہے انتظار
بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں
بیٹا تمھاری ماں نہ جیئے گی فراق میں

بیٹا ماں کا نام سن کر ہوش میں آجاتا ہے مگر دم بھر کے لیے:

غش میں سنا جو ہیں علی اکبر نے ماں کا نام — کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوئے خیام

زخموں کی تکلیف، جاں کنی کا دکھ، پیاس کی شدت اچھی طرح بولنے بھی نہیں دے رہی ؂

زخمِ جگر دکھا کے کہا یوں بچشمِ تر
اب کوئی دم میں گلشنِ ہستی سے ہے سفر

دل میں حسرت ہے کہ ایک بار ماں سے مل لیں مگر جانتے ہیں کہ وقت نہیں رہا اور کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے

بیٹے کی آرزو سن کر باپ کے دل پر جو گذر رہی ہے وہ شاعر کی زبان سے سنیے :

شہ نے کہا کھڑی ہے وہ ڈیوڑھی پہ کھولے بال
آؤ میں لے چلوں تمھیں اے میرے نونہال

مگر ؎

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر　　اتنی زباں ہلی کہ خدا حافظ اے پدر
آباد گھر لٹا شہِ والا کے سامنے
بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

امام حسینؑ بیٹے کی لاش خیمے میں لاتے ہیں۔ ماں میاں کی گود میں بے جان بیٹے کو دیکھتی ہے تو سکتے کی سی حالت ہو جاتی ہے۔ امام حسینؑ بیوی سے کہتے ہیں ؎

آغوش میں لو لاش جواں بیٹے کی بانو　　پھر پاؤ گی تصویر کہاں بیٹے کی بانو
ہو جائے گی یہ شکل نہاں بیٹے کی بانو　　بس آخری رخصت ہے یہ ماں بیٹے کی بانو
اس پیاس میں تنہا یہ ہزاروں سے لڑے ہیں
کس شان سے چھاتی پہ سناں کھائے پڑے ہیں

بہادر و حق پرست باپ کو جری مجاہد کی اس شاندار موت پر فخر بھی ہے اور درد و غم کا ساگر بھی دل میں لہریں مار رہا ہے۔ بیوی سے یہ کہتے کہتے ؎

منھ رکھ دیا چھاتی پہ پسر کی کئی باری

باپ کی یہ حالت دیکھ کر مدہوش ماں کو ہوش آجاتا ہے اور یہ جاں گداز حقیقت کھل جاتی ہے کہ کڑیل جوان کی یہ لاش اسی کے لختِ جگر کی ہے ؎

فرزند کا منھ کھول کے بانو یہ پکاری — اُٹھتے نہیں تم باپ کے سمجھانے کو واری

سوچتی ہے باپ کی ذرا سی تکلیف پر بیٹا بے چین ہو جاتا تھا۔ اسی کی محبت میں تو اپنی لال سی جان جان آفریں کے سپرد کی ہے پر اب یہ کیسی نیند ہے؟

روتے بھی نہ دیتے تھے سوجی کھوتے ہیں شبّیر
صدقے گئی تم سوتے ہو اور روتے ہیں شبّیر

یہ کہتے کہتے صبر و برداشت کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ آخر وہ ماں ہے جس کے کلیجے کا ٹکڑا زخموں سے چور چور موت کی آغوش میں سویا پڑا ہے۔ وہ بیٹے کے جسدِ بے جان سے لپٹ جاتی ہے، بین کرتی ہے جس کا ایک ایک لفظ نسوانیت اور مادریت میں ڈوبا ہوا ہے مگر اس درد و غم کی شدّت میں بھی قسمت کا گلہ، خدا سے شکوہ یا شوہر سے شکایت نہیں۔ ماں کی ایسے غم میں کیا حالت ہوتی ہے اس کی کیسی سچّی تصویر کشی کی ہے انیسؔ نے کہ سننے والوں کے کلیجے ہل جاتے ہیں۔ کہیں کہیں سے دو چار شعر نقل کروں گی۔

اماں نثار کس کی نظر تجھ کو کھا گئی — اٹھارویں برس میں تجھے موت آ گئی
واری گئے نہ قبر میں اماں کو گاڑ کے — جنت میں جا بسے مری بستی اُجاڑ کے
وہ حُسن کیا ہوا وہ جوانی کدھر گئی — اکبر تمھاری پالنے والی نہ مر گئی

زندگی کا ہر سکھ، ہر خوشی اس لال کے ساتھ چلی گئی۔

چین آئے گا نہ دن کو نہ راتوں کو سوؤں گی — جب تک جیوں گی تیری جوانی کو روؤں گی

بیٹے کے بیاہ کا کتنا ارمان تھا مگر اب تو سب ارمان خاک میں مل گئے۔

ہے ہے نہ تیرا بیاہ رچانا ہوا نصیب — ہے ہے دلھن نہ بیاہ کے لانا ہوا نصیب
پوتے کو گود میں نہ کھلانا ہوا نصیب — شادی کے بدلے خاک اڑانا ہوا نصیب

ندی لہو کی چاند سی چھاتی سے بہہ گئی
بہنوں کو نیگ لینے کی حسرت ہی رہ گئی

اندازِ بیان میں ہندوستانی ماں کی حسرتیں جھلکتی ہیں مگر یہ حسرتیں اور آرزوئیں دنیا کی ہر عورت اور ہر ماں کے دل میں ہوتی ہیں۔ الفاظ ہندوستانی سہی، جذبات عالمگیر ہیں۔ نیچے لکھے بند میں ہندوستانی بلکہ دلّی لکھنؤ کی تہذیب کی چھاپ اور زیادہ ہے ؎

باتیں تمہارے بیاہ کی جب لوگ لاتے تھے — بہنیں بلاتی تھیں تو نہ تم پاس آتے تھے
سن کر دلھن کا ذکر نہ آنکھیں اٹھاتے تھے — کیا مسکرا کے شرم سے گردن جھکاتے تھے

جیسے بیٹے کی ایک ایک ادا یاد آکر کلیجے میں سوراخ کر رہی ہے، دل سے ایک دھواں سا اٹھتا ہے ؎

بن بیاہے اٹھ گئے مرے پیارے جہان سے
ناشاد و نامراد سدھارے جہان سے

ہنس ہنس کے اب یہ ماں کسے دلھا بنائے گی — واری جواب دو دلھن اب کس کی آئے گی
اب سالی کس کے ہاتھ میں مہندی لگائے گی — ماں بیاہنے کو دھوم سے اب کس کے جائے گی

دوسرے شعر میں شاعر نے ہندی تہذیب کا پس منظر ہی نہیں رکھا بلکہ مبالغے کی حد تک مقامی رنگ بھر دیا ہے جس میں عرب کے مجاہد کے ہاتھ میں سالی سے مہندی لگوانے کی حسرت دکھادی ہے۔ ایسی خامیاں کہیں کہیں ہمیں انیس کے یہاں مل جاتی ہیں مگر ٹیپ کے بند میں بڑی غضب کی مرقع کشی ہے جیسے ماں سپنے سے ایک دم جاگ پڑتی ہے۔ دل میں ایک شعلہ سا بھڑکتا ہے ؎

بستی مری اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا
شادی کہاں کی گھر تو عزاخانہ ہو گیا

لیکن بانو کے مصائب اور آزمایش کا خاتمہ یہیں نہیں ہوتا۔ آگے چل کر اس سے بھی بڑا صبر و رضا کا امتحان اسے دینا پڑتا ہے۔ جب علی اکبر کی شہادت

کے بعد امام حسینؑ میدانِ جنگ میں جاتے ہوئے اس کے شیر خوار بچّے کو دشمن کی فوج کے سامنے لے جانا چاہتے ہیں۔ بچہ بھوک و پیاس سے جاں بلب ہے اور باپ کا دل کہتا ہے کہ دشمن کیسا بھی شقی القلب ہو مگر ننھے معصوم پر اتنا ترس تو کھائے گا کہ اُسے چند قطرے پانی پلا دے۔ اگرچہ تجربہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ جنھوں نے رسولؐ کے نواسے کا پاس نہ کیا، علی اکبرؑ کی جوانی پر رحم نہ کھایا ان سے یہ بھی بعید نہیں کہ اس معصوم کو بھی شہید کر دیں مگر انھیں حجّت بھی تو تمام کرنی ہے۔ دنیا کے سامنے خلیل اللہ کے وارث کو یہ مثال پیش کرنی ہے کہ راہِ الٰہی میں حسینؑ کیا کچھ قربان کر سکتے تھے۔ یہ حقیقت بھی سامنے لانی ہے کہ ان کا سابقہ کیسے لوگوں سے تھا جن کی انسانیت ختم ہو چکی تھی اور جو زندگی کے حدود کو پار کر چکے تھے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ امام حسینؑ اپنے شیر خوار بچّے کو ماں کی گود سے اپنی آغوش میں لے کر فوجِ یزید کے سامنے گئے اور بچے کی حالت دشمن کو بتا کر اس کے لیے ایک گھونٹ پانی طلب کیا۔ انیسؔ نے اس سارے واقعے کو ایک شعر میں کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

حسین اور طلبِ آب اے معاذ اللہ
تمام کرتے ہیں حجّت سوالِ آب نہ تھا

اور اس خونیں واقعے کی تاریخ شاہد ہے کہ حسینؑ کے دشمنوں نے سوالِ آب پر تیروں کی بوچھار کی جس سے باپ کا بازو اور بچّے کا گلا چھد گیا اور معصوم علی اصغر باپ کے ہاتھوں پر تڑپ کر جامِ شہادت سے سیراب ہوا۔

اس جاں گداز واقعے کو بھی مرثیہ گو شاعروں نے بڑے پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے اور انیسؔ نے تو جہاں جہاں یہ ذکر کیا ہے تو اس طرح کہ سننے والوں کے کلیجے ہل جاتے ہیں۔ خاص طور پر ماں پر ننھے بچّے کی جدائی کا کیا اثر ہوتا ہے اس کی

مرقع کشی غضب کی ہے۔ دودھ پیتے بچے کی محبت عورت کے دل میں والہانہ عشق کے درجے تک پہنچ جاتی ہے جس کے لیے وہ اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ انسان کیا حیوان میں بھی ننھے بچّے کی محبت کا گہرا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اس حقیقت سے باریک بیں شاعر پوری طرح آگاہ ہے اور ماں کی والہانہ محبت اور بے قرار الفت کی شدّت اور تڑپ کو خود اپنے دل پر محسوس کرتا معلوم ہوتا ہے۔

امام حسینؑ علی اکبر کی شہادت کے بعد اپنے خالق سے مصروفِ مناجات ہیں:

داخل ہوئی ہے خیلِ شہدا میں مری اولاد　　جو نیک کمائی ہے وہ ہوتی نہیں برباد
سب اس پہ فدا ہیں علی اکبر ہوں کہ سجّاد　　بندہ وہ ہے صاحب کی جو بھولے نہ کبھی یاد

صبر و رضا کی یہ وہ منزل ہے جہاں بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں مگر یہ نواسۂ رسول ہے جو فرما رہا ہے:

طاعت تو ہے دشوار اطاعت تو نہ جائے
بیٹا تو گیا صبر کی دولت تو نہ جائے

اور حسین اس وقت اطاعت کی ایک اور کڑی منزل سامنے آجاتی ہے ہے ؎

باتیں تھیں ادھر شکر کی اور صبر و رضا کی　　بندھتی تھیں صفیں رن میں اُدھر اہلِ جفا کی
ناگاہ ہوئی خیمے میں اک دھوم بکا کی　　سمجھے شہِ مظلوم کہ اصغر نے قضا کی

رونے کا شور سن کر امام خیمے میں جاتے ہیں تو بچہ بھوک پیاس سے نیم جان ملتا ہے:

چھائی ہوئی زردی تھی جو دلبند کے مُنھ پر
شبّیر نے منھ رکھ دیا فرزند کے مُنھ پر

قدرتی طور پر شوہر کو دیکھ کر ماں کی بے قراری بڑھ جاتی ہے اور وہ تڑپ کر

کہتی ہے:

فریاد ہے اے لختِ دلِ ساقیِ کوثر دولت مری لٹتی ہے اُجڑتا ہے مرا گھر

کیا ہو گیا اس صاحبِ اقبال کو میرے

ہے ہے لیے جاتی ہے اجل لال کو میرے

امام حسینؑ بچّے کو گود میں اُٹھا کر خیمے سے جانے کا قصد کرتے ہیں تو ماں جو جوانوں کو وہاں زندہ جاتے اور مُردہ واپس آتے دیکھ چکی ہے، بے حال ہو جاتی ہے:

فرزند چلا کیا کہ چلی جان بدن سے

گہوارے پہ سر دھر کے جو غش کر گئی بانو

ہر بی بی پہ ثابت یہ ہوا مر گئی بانو

ماں کی یہ حالت اور بچّے کی میدانِ جنگ میں روانگی دیکھ کر ؎

سب بیبیاں چلّا کے جو کرنے لگیں زاری گھبرا کے اُٹھی اور یہ حضرت کو پکاری

یا سبطِ نبی تن سے چلی جان ہماری اک لحظہ ٹھہر جائیے میں آپ کے واری

صاحب مرے آغوش کے پالے کو دکھا دو

اک بار پھر اس ہنسلیوں والے کو دکھا دو

حسینؑ بڑے درد سے بیوی سے کہتے ہیں ؎

لو آکے پھر اس چاند سی تصویر کو دیکھو کیا صبر کیا ہے دلِ شبیر کو دیکھو

خیال آتا ہے کہ بانو یہ نہ سمجھ رہی ہو کہ اس کی محبت کا ہمیں احساس نہیں ؎

تم ماں ہو تمھیں دکھ ہے ہو تم نے اسے پالا ہے حق بہ طرف گر ہو کلیجہ تہ و بالا

یہ جان ہماری بھی ہے یہ گیسوؤں والا ہر طرح مگر صبر کیا دل کو سنبھالا

خوشنود ہیں وہ عشق ہے اللہ سے جن کو

اصغر کو فدا کرنے لیے جاتا ہوں رن کو

راضی برضا امام پہ بیوی کی بے قراری شاق گزر رہی ہے مگر زبان سے یہ کہتے ہیں:

میں ان کو نہ لے جاؤں اگر ہے تمھیں وسواس   دوری علی اکبر سے ہوئی یہ تو رہیں پاس
اب تو ہے تمھاری یہی اُمید یہی آس   اور اس کے سوا پانی کے ملنے سے بھی ہے یاس
لُو چلتی ہے میداں میں ہوا سرد نہیں ہے
وہ لوگ ہیں واں جمع جنھیں درد نہیں ہے

یعنی ماں کو جتایا جا رہا ہے کہ اگر یہ وہاں گئے تو زندہ واپس آنے کی اُمید نہیں۔ اس پر بھی اگر تم رضائے الٰہی پر راضی ہو کر بھیجو تو بھیجو ورنہ نہیں۔ ساتھ ہی خیال آتا ہے کہ بیوی سے اب یہ آخری رخصت ہے تو حسرت سے کہتے ہیں:

برگشتہ ہے تقدیر مخالف ہے زمانہ   دشوار ہے اب جا کے مرا خیمے میں آنا
سچ کہتی ہو تم ان کا مناسب نہیں جانا   الفت ہے اگر ہم سے تو آنسو نہ بہانا
دکھ درد رنڈاپے کا بھی سہ لیجیو بانو
جو کہنا ہے اللہ سے کہہ لیجیو بانو

لو گود میں فرزند کو اللہ نگہبان   ہر حال میں زینب کی اطاعت کا رہے دھیان

اشارے کنایے سے بھی رنج یا ناراضگی کا اظہار نہیں مگر مزاج شناس بیوی سمجھ جاتی ہے کہ شوہر کو جس کے معیار بہت اونچے ہیں اور اسی معیار پر وہ بیوی کو بھی دیکھنا پسند کرتا ہے، یہ بات ناگوار گزری ہے کہ جب:

"سرکارِ خدا میں علی اصغر کی طلب ہے"

تو ماں نے اسے کیوں روکا؟ بانو عاجزی سے شوہر سے کہتی ہیں:

لونڈی سے خفا کچھ ہوئے میں آپ کے قربان
یوں آپ جسے چاہیے دے جائیے ان کو   کب میں نے کہا تھا کہ نہ لے جائیے ان کو

کیا جگر ہوگا اس ماں کا جو یوں رضائے الٰہی اور رضائے شوہر پر سر

جھکا دے۔ اتنا ہی نہیں اپنے صبر اور رضائے الٰہی پر راضی رہنے کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تو کس انداز سے کہ آپ کی صحبت اور محبت نے مجھے اس قابل بنایا ہے:

میں بھی ہوں کنیز آپ کی یا حضرتِ شبیر ہر دکھ میں رضا جوئے خدا تابعِ تقدیر
بیتاب تھا دل کی ہو جو بے جا کوئی تقریر ہیں آپ خطا پوش، بحل کیجیے تقصیر

فرزند کا غم ماں کے کلیجے کو چھری ہے
واری گئی یہ آنچ بری ہے

یہ باتیں امامِ وقت سے ہو رہی ہیں مگر اندر کی عورت کی بے قرار آواز منھ سے بلند ہوتی ہے اور اطاعت کا مجسمۂ صبر کے پیکر کے منھ سے پہلی بار شکوہ سنائی دیتا ہے۔ تم باپ ہو بے شک تمھیں بے حد محبت ہے مگر ماں کی ماتا کی آگ اور ہی ہوتی ہے۔ جس کی جلن صرف ماں سمجھ سکتی ہے۔

خنجر کے تلے جس کا جگر ہو وہی جانے اس درد کی جس دل کو خبر ہو وہی جانے
دکھ درد سے یوں جس کی بسر ہو وہی جانے آغوش میں جس ماں کی پسر ہو وہی جانے

شب کٹتی ہے کس طرح سے دن ڈھلتا ہے کیونکر
پوچھے کوئی ماں سے کہ پسر پلتا ہے کیونکر

پھر ہوش آجاتا ہے۔ ماتا کا جذبہ دبا کر اپنے کو یہ کہنے پر مجبور کرتی ہے:

خوشنود ہوں لے جائیے ان کو سوئے میداں
کچھ میں نے کہا مر گئے جب اکبرِ ذیشاں

اور پھر ہائے کس بے بسی سے یہ کہنا ؎

ہاں صبر خدا دے یہ دعا کیجیو صاحب
نام ان کا جو اب لوں تو گلہ کیجیو صاحب

امام حسینؑ یہ سن کر فرماتے ہیں :

واللہ بدل تم سے رضا مند ہے شبیر

مگر یہ بھی سمجھایا جا رہا ہے کہ " واجب ہمیں ہر حال میں خوشنودیِ رب ہے " "ہمیں" یعنی رضائے الٰہی پر راضی رہنا صرف میرا امام وقت ہی کا فرض نہیں ، میری شریکِ حیات بھی اس فرض ، اس قربانی ، اس منصب میں برابر کی شریک ہے اور پھر یہ روح فرسا حقیقت بھی آخر کار بیان کر دیتے ہیں :

اکبر گئے جس جا وہیں ان کی بھی طلب ہے

ماں پتھر کا کلیجہ کر کے بچے کو گود میں لے کر سنوارتی ہے :

سرمہ بھی دیا بال بھی سب سر کے سنوارے
کپڑے تھے جو بھاری وہ پہنائے یہ اتارے
رو کر کہا لو جاؤ میں قربان تمھارے

ماں کو روتا دیکھ کر بچہ کو خدا جانے کیا احساس ہوا کرتا ہے کہ وہ بھی بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کو شاعر کس انداز سے بیان کر رہا ہے ؎

جھک جھک کے جو فرزند کا منھ یاس سے دیکھا
ماں کو علی اصغر نے عجب یاس سے دیکھا

میدانِ جنگ میں امام بچّے کو لے جاتے ہیں ۔ اس کے لیے پانی طلب کرتے ہیں ، حالت دکھانے کے لیے عبا کا دامن چہرے سے ہٹا لیتے ہیں مگر سوالِ آب پر اک تیر سہ پہلو آکر معصوم کے گلے میں پیوست ہو جاتا ہے ؎

کتنا بچایا شہ نے اجل سے نہ بس چلا
کڑکی اُدھر کمان اِدھر چھید گیا گلا
آنسو بھر آئے آنکھوں میں منکا جو نہیں ڈھلا
آنکھوں سے شہ نے آنکھیں ملیں منھ سے منھ ملا

اس کے بعد امام حسینؑ نے اپنی تیغ سے ایک ننھی سی قبر کھود دی اور علی اصغر کو دفن کر دیا ۔ بڈھوں ، جوانوں سب کی لاشیں تپتی ریت پر اور سرخ آفتاب

کے نیچے پڑی تھیں مگر دل نے گوارا نہ کیا کہ یہ پھول سا بچہ اس طرح پڑا رہے۔ بچے کو خاک میں چھپا کر کس درد سے بولے ؎

اے خاکِ پاک، حرمتِ مہماں نگاہ دار

اور ماں خیمے کے در پر کھڑی یہ قیامت کا منظر دیکھتی رہی ؎

خیمے سے کئی بار نکل کر یہ پکاری مٹی میں چھپاؤ نہ کمائی کو ہماری

لاشِ علی اصغر ہمیں دے جاؤ میں واری

ماں مردہ بچے کو بھی جہاں تک بس چلتا ہے کلیجہ سے لپٹائے رہتی ہے۔ اسی جذبے کے تحت بانو کا تڑپ تڑپ کر یہ کہنا کتنا فطری معلوم ہوتا ہے ؎

راحت سے مری گود میں آرام کریں گے
تنہا کبھی سوئے نہیں جنگل میں ڈریں گے

امام حسینؑ سے اہلِ خاندان کو محبت بھی ہے اور عقیدت بھی۔ وہ جگر گوشۂ رسول ہیں، محافظِ اسلام و امامِ وقت ہیں، اس لیے اُن کا احترام اور ان کے اعلیٰ مقاصد پر سب کچھ قربان کرنے کا جذبہ بھی ہے۔ ساتھ ہی خاندان بھر کی عورتیں ان کو حد سے زیادہ چاہتی اور بھروسہ کرتی ہیں۔ وہ انسرِ خاندان ہیں۔ ہر ایک سے محبت کرتے ہیں، اس کی فلاح و بہبود اور دین و دنیا کی بھلائی کی فکر رکھتے ہیں۔ شہر بانو تو بیوی ہیں اور کیسی بیوی؟ جو نادیدہ اس شمع کی پروانہ بنی تھیں۔ انھیں شوہر سے سچا عشق بھی ہے اور گہری عقیدت بھی۔ وہ بیٹوں کی موت صبر و شکر کے ساتھ سہار جاتی ہیں بلکہ خود امامِ وقت پر اپنے جگر کے ٹکڑوں کو فدا کرنے کی سعادت حاصل کرتی ہیں۔ مگر جب حسینؑ سے جدائی کا وقت آتا ہے تو اس صابرہ کی قوتِ برداشت جواب دے جاتی ہے۔ اپنے محبوب سے ہمیشہ کی جدائی، رنڈاپے

کی مصیبت اور قید و بند کی ذلّت کے جان لیوا تصوّر انھیں بے قرار کر دیتے ہیں۔

بانو اور حسینؑ کی گہری محبّت کو انیسؔ نے متعدد مرثیوں میں دکھایا ہے۔ یہ نوجوانی کی جذباتی محبّت نہیں بلکہ سن رسیدہ چاہنے والے رفیقِ زندگی، شریکِ رنج و راحت میاں بیوی کی محبّت کی عکّاسی ہے جس کی جڑیں بہت گہرائی تک پہنچتی ہیں۔ اس میں خلوص ہے، اپنایت ہے، ایک دوسرے کے دکھ کا احساس اور جذبات کا پاس ہے۔ ایک دوسرے پہ اعتماد اور بھروسہ ہے۔ مصیبتوں کو ساتھ ساتھ جھیلنے کا جذبہ، اور ایک دوسرے کے لیے قربانی کرنے کا عزم ہے، محبت کا اعتراف ہے اور کبھی کبھی گلہ شکوہ بھی۔

امام حسینؑ آخری رخصت کے لیے خیمے میں آتے ہیں، بہن سے رخصت ہو رہے ہیں، بیوی کو خیال آتا ہے کیا وہ مجھ سے بے ملے ہی چلے جائیں گے؟ تو تڑپ کر کہتی ہے:

اولاد تھی جب تک تو محبّت تھی ہماری بے آس کسی کو نہ کرے حضرتِ باری

اس شعر میں خالص نسوانی کمزوری بول رہی ہے۔ پھر خود شوہر سے پوچھتی ہیں:

قربان گئی باتو سے کیوں ہو گئے بیزار کچھ کی ہے جو تقصیر تو کیجے اسے اظہار

سوچتی ہے بیٹے کو مرنے کے لیے بھیج دیا تھا بس یہی قصور ہو سکتا ہے ؎

ہاں یہ تو ہے تقصیر کہ اکبر کو رضا دی

اس پر شوہر کا یہ عذر کرنا

آگے ترے آتے مجھے شرم آتی ہے بانو

جب آتا تھا میں ساتھ مرے آتے تھے اکبر محجوب تھا تنہا ترے پاس آتا میں کیوں کر

دھڑکا تھا یہ دل کو مرے، اے بیکس و بے پر گر پوچھے گی بانو کہ کہاں ہے مرا دلبر

کس منھ سے کہوں گا کہ سفر کر گئے اکبر

جیتا ہے حسین ابنِ علی، مر گئے اکبر

تو کا لفظ اُردو زبان میں محبت اور بے تکلفی کی انتہا کے وقت بھی بولا جاتا ہے یہاں شاعر حسینؑ کے منھ سے بانو کو "تو" کہلوا کر یہی جذبہ دکھانا چاہتا ہے۔ مگر آگے چل کر جب وہ ان کی قربانیوں کا اعتراف کرتے ہیں تو لہجہ بدل جاتا ہے :

اے بانو میں شرمندۂ احساں ہوں تمھارا　　مجھ پر علی اکبر سے جواں بیٹے کو مارا
کی فاقہ کشی تم نے مرے ساتھ گوارا　　شبیرؔ کی الفت سے کیا پر نہ کنارا
دُکھ درد سہے رنج اُٹھایا مرے گھر میں
تم نے کبھی آرام نہ پایا مرے گھر میں

وہ رہبر اور امام ہی سہی مگر انسان ہیں، مرد ہیں۔ دل میں یہ کھٹک اور درد ہے کہ ناز و نعم کی پلی شہزادی نے ان کے گھر میں کبھی راحت و آرام کی زندگی بسر نہ کی۔

میکے میں تو سب کچھ تھیں دولت تھی مہیا　　رہتا تھا سدا بر میں لباسِ خز و دیبا
گھر فاطمہ کے آکے کیا فاقے پہ فاقہ　　پیوند پہ پیوند ہیں چادر میں ہر اک جا

فاطمہ کے گھر آکے فاقے کیے، پیوند لگے کپڑے پہنے۔ اس کنائے کی بلاغت پر غور کیجیے۔ اس کی تکلیف کا احساس ضرور ہے مگر اسے شرم یا محرومی نہیں سمجھتے یہ فاقہ یہ پیوند لگی ردا یہ عسرت بنتِ رسول کا ورثہ ہے جو کسی بھی مسلمان عورت خاص کر فاطمہ کی بہو کے لیے عزت اور فخر کی بات ہے۔ مگر اس احساس سے دل دردمند ہے کہ اس عالی ظرف نے تو اولاد جیسی دولت بھی، جو عورت کو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہے، ان پر قربان کر دی۔

اک دولتِ اولاد جو خالق نے عطا کی
سو وہ بھی بُرے وقت میں شوہر پہ فدا کی

وفا شعار بیوی اُلٹی ان کی دل داری کرتی ہے :

روکر کہا بانو نے یہ فرمائیے حضرت   کونین کی دولت ملی حضرت کی بدولت
اس فاقہ کشی سے کوئی افضل نہیں نعمت   اقبال تھا میرا کہ ہوئی آپ کی وصلت

کسریٰ کی جو پوتی ہوں تو کچھ فخر نہیں ہے
سرتاج مرا دوشِ محمدؐ کا مکیں ہے

سسرالی خاندان پر فخر اور ان کی عظمت و بزرگی پر کتنا ناز ہے:

سسرا کسے آفاق میں حیدر سا ملا ہے   گھر کس کو بھلا فاطمہ کے گھر سا ملا ہے
کس بیبی کو بیٹا علی اکبر سا ملا ہے   شوہر کسے فرزندِ پیمبر سا ملا ہے

ہاتھ آئی یہ دولت مجھے قدرت سے خدا کی
میں اور بہو بنتِ رسولِ دوسرا کی

طرح طرح سے شوہر کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ دنیا کی ساری مصیبتیں اس فخر و راحت کے مقابلے میں ہیچ ہیں جو آپ کی بیوی بننے سے حاصل ہوئی ہے۔

اور پھر یاد آجاتا ہے کہ آج یہ راج پاٹ لٹ رہا ہے تو دل سے ایک چیخ بلند ہوتی ہے ؎

اب رانڈ بہو ہوتی ہے زہراؑ و علیؑ کی
لٹتا ہے مرا راج دہائی ہے نبیؐ کی

جو پیش آنے والا ہے وہ اب بالکل آشکارا ہو چکا ہے:

میں جانتی ہوں ہو چکا برباد مرا گھر   چھن جائے گی بعد آپ کے سر سے مری چادر
باندھیں رسن ظلم سے باندھیں گے ستمگر   روتی ہوئی میں قید میں جاؤں گی کھلے سر

زنداں میں جو ہو ظلم گوارا مجھے سب ہے
دربار میں حاکم نے بلایا تو غضب ہے

ایک یہ روایت بھی ہے کہ شہر بانو جب بندی میں آئیں تو یزید بھی ان سے

عقد کرنا چاہتا تھا مگر خلیفۂ وقت نے حضرت علی کی خواہش پر امام حسین کا پیام منظور کیا اور ایران کی اس شہزادی نے نواسۂ رسول کی زوجیت میں آنا قبول کیا۔ یہاں ان کا یہ کہنا :

دربار میں حاکم نے بلایا تو غضب ہے

اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ایک اور مرثیے میں انیسؔ نے بانو اور حسینؑ کی رخصت کو ایک دوسرے انداز میں دکھایا ہے۔ یہاں شکوہ بیوی کی طرف سے نہیں، شوہر کر رہے ہیں۔ حسینؑ سب عزیزوں کی شہادت کے بعد آخری بار خیمے میں آتے ہیں کہ بیٹی، بہن اور بیوی سے رخصت ہو لیں۔ وہ سب سے وداع ہوتے ہیں مگر شہربانو کہیں نظر نہیں آئیں تو اپنی کم سن بچی سے مخاطب ہو کر پوچھتے ہیں کہ تمھاری ماں کہاں ہیں؟ ان بندوں میں انیسؔ نے میاں بیوی کی جو بات چیت اور کیفیت دکھائی ہے اس میں اگرچہ ہندوستانی تہذیب بڑی خوبی سے رچی ہوئی ہے مگر جذبات عالمگیر ہیں۔

بی بی کہو کیا حال ہے اماں کا تمھاری
کس گوشے میں بیٹھی ہیں کہاں کرتی ہیں زاری
جب سے سوئے جنت گئی اکبر کی سواری
دیکھا نہ انھیں گھر میں ہم آئے کئی باری
تھی سب کی محبت انھیں بیٹے ہی کے دم تک
کیا آخری رخصت کو بھی آئیں گی نہ ہم تک

کس جا ہیں، طلب ہم کو کریں یا ادھر آئیں
ممکن نہیں اب وہ ہمیں یا ہم انھیں پائیں
کچھ ہم سے سنیں کچھ ہمیں حال اپنا سنائیں
اک دم کے مسافر ہیں ہمیں دیکھ تو جائیں

غش کی سی حالت میں شہربانو کے کان میں شوہر کی آواز پڑتی ہے تو ہوش آ جاتا ہے ؎

غش ہیں جو سُنی بانوئے مضطر نے یہ تقریر — ثابت ہوا مرنے کو چلے حضرتِ شبیرؑ
سر ننگے اُٹھی چھوڑ کے گہوارۂ بے شیر — چلّائی مجھے ہوش نہ تھا اے شہِ دلگیر
جاں تن سے کوئی آن میں اب جاتی ہے آقا
یہ خادمہ رخصت کے لیے آتی ہے آقا

کس غضب کی مرقع کشی ہے۔ چشمِ تصوّر کے سامنے سے ماضی کے پردے جیسے اُٹھتے چلے جا رہے ہیں اور تخیّل کی آنکھیں سارا واقعہ دیکھنے لگتی ہیں ؎

یہ سُن کے بڑھے چند قدم شاہِ خوش اقبال — قدموں پہ گری دوڑ کے وہ کھولے ہوئے بال
تھا قبلۂ عالم کا بھی اس وقت عجب حال — روتے تھے غضب آنکھ پہ رکھے ہوئے رومال
فرماتے تھے جانکاہ جدائی کا الم ہے
اُٹھو تمھیں روحِ علی اکبر کی قسم ہے
وہ کہتی تھی کیونکر میں اٹھوں اے مرے سرتاج — والی انھیں قدموں کی بدولت ہے مرا راج

ماضی کی عشرتیں یاد آرہی ہیں:

چھبیس برس تک نہ چھٹا آپ کا پہلو — اب ہجر ہے تقدیر میں یا سیدِ خوشخو
شب بھر رہے تکیہ سرِ اقدس کا جو بازو — ہے ہے اسے اب رسّی میں باندھیں گے جفا جو
سر پہ نہ ردا ہوگی تو مر جاؤں گی صاحب
چھپنے کو میں جنگل میں کدھر جاؤں گی صاحب

حسینؑ کا عجب حال ہے۔ دردِ جدائی سے دل زخمی، آنے والے واقعات اور بیوی و اہلِ حرم کی مصیبتوں کے احساس سے روح پر تکلیف! مگر اہلبیت کو راضی برضائے الٰہی رہنے کی اور ثابت قدمی سے سب کچھ جھیلنے کی تلقین آپ کا منصب بھی ہے اور فرض بھی۔ بیوی کو کس کس طرح سے سمجھایا جا رہا ہے:

حضرت نے کہا کس کا سدا ساتھ رہا ہے — ہر عاشق و معشوق نے یہ داغ سہا ہے

سو سو برس اس گھر میں محبت سے رہے جو — اس موت نے دم بھر میں جدا کر دیا ان کو
کچھ مرگ سے چارہ نہیں اے بانوئے خوشخو — ہے شاق فلک پر کہ رہیں ایک جگہ دو

سب سے بڑا سہارا خدا کا سہارا ہے مگر جانتے ہیں کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے دنیا کے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے اور خاص کر عورت کی کمزوری یہ ہے کہ مرد کے سہارے کی طالب ہوتی ہے۔ بیوی کی ڈھارس بندھاتے ہیں:

لازم ہے خدا سے طلبِ خیرِ بشر کو — تھامے گا تباہی میں وہی رانڈ کے گھر کو
آنا ہے تمھیں بھی وہیں جاتے ہیں جدھر کو — وارث کی جدائی میں پٹکتے نہیں سر کو
کھولے گا وہ رسی میں بندھے ہاتھ تمہارے
سجّاد[۱] سا بیٹا ہے ابھی ساتھ تمہارے

شوہر کے بعد بیٹا عورت کا سہارا بنتا ہے۔ بانو کے دو بیٹے مر چکے ہیں مگر ابھی ایک جوان بیٹا سلامت ہے۔ اور یہ کہتے کہتے حسینؑ کو اپنی بے کس بہن کا خیال آتا ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔ بیوی کو اپنے صبر و ضبط میں ان سے سبق لینے کا درس دیتے ہیں ؎

زینب کو تو دیکھو کہ ہیں کس دکھ میں گرفتار — ایسا کوئی اس گھر میں نہیں بیکس و ناچار
تنہا ہیں کہ بیجاں ہوئے دو چاند سے دلدار — دنیا سے گیا اکبرِ ناشاد سا دلدار
بیٹے بھی نہیں گود کا پالا بھی نہیں ہے
ان کا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے

سمجھایا جا رہا ہے کہ تم تو بڑی بڑی قربانیاں راہِ الٰہی میں دے چکی ہو پھر اس وقت یہ بے صبری کیسی؟

دو بیٹے فدا کر چکی ہو راہِ خدا میں
شوہر کو بھی قربان کرو راہِ خدا میں

---

[۱] امام زین العابدین۔ امام حسینؑ کے بڑے بیٹے۔

راہِ شہادت کے راہی کو کون روک سکتا ہے۔ بیوی کی التجا، بہن کی بیقراری، بچوں کی آہ وزاری، اہلِ بیت کی بیکسی حسینؑ کا دامن نہ تھام سکی۔ وہ میدانِ جنگ میں آئے، گمراہوں کو راہِ راست پر لانے کی ایک آخری کوشش کی، مگر جواب میں دشمنوں کی طرف سے تیروں کی بوچھار ہوئی۔ علی کے بہادر بیٹے نے ذوالفقار کھینچی۔ کچھ دیر تنِ تنہا مجاہد، دشمنوں کی فوج سے اس طرح جہاد کرتا رہا جس کی تفسیر اقبال نے یوں کی ہے:

چڑھتی ہے جب عشق کی سان پہ تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

مگر آخرکار حسینؑ نیزوں، تلواروں، تیروں اور پتھروں کے زخم کھا کر ریگِ گرم پر گر پڑے۔ عین اس وقت بانیٔ اسلام کے جگر گوشے کے کان میں عصر کی اذان کی آواز آئی اور ہادیٔ برحق کے جانشین نے اپنا سرِ نیاز معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں جھکا دیا اور پھر ؎

شمر آیا جو حضرت کے قریں کھینچ کے خنجر — دیکھا سرِ مجروح ہے سجدے میں زمیں پر
بڑھ کر یہ سواروں کو پکارا وہ ستم گر — نیزوں سے اُلٹ دو سرِ فرزندِ پیمبر

اس وقت بھی آپ کا یہ حال تھا ؎

پر ذکرِ خدا تھا لبِ خشکیدہ پہ ہر بار
حق بندگیٔ حق کا ادا کرتے تھے مولا
تم لوگوں کی بخشش کی دعا کرتے تھے مولا

اور یہ روح فرسا منظر اہلِ بیتِ رسول خیمے کے در پر کھڑے دیکھ رہے تھے کہ خیمے اونچائی پر نصب تھے اور قتل گاہِ حسینؑ دور مگر نشیب میں تھی۔ اس وقت ہر بی بی کی کیا حالت ہوسکتی تھی اس کا منظر انیس نے متعدد مرثیوں میں دکھایا ہے۔ شہر بانو کی یہ حالت

دکھاتے ہیں:

چلاتی تھی بانو مرے سید مرے سرتاج
اُلٹا مرا بخت آپ کے مرنے سے تاراج

اور پھر دشمن کی فوج جب خیموں کو لوٹتی اور اہلِ حرم کو قید کر کے لے جانے لگتی ہیں تو بانو کی یہ فریاد سنائی دیتی ہے:

اب کون ہے یا شاہ مرا پوچھنے والا ۔۔۔ وہ بھی نہیں اٹھارہ برس تک جنھیں پالا
کب تک سہوں یہ رنج و الم اے شہِ والا ۔۔۔ اعدا نے مجھے لوٹ کے پردے سے نکالا

بیماری میں سجّاد گرفتارِ محن ہے
میں قید ہوں لاش آپ کی بے گور و کفن ہے

پھر اہلِ بیتِ رسول کو قیدی بنا کر ننگے سر بے کجاوہ اونٹوں پہ بازوؤں میں رسن باندھ کر کوفے اور وہاں سے دمشق لے جایا جاتا ہے۔ شہر بانو اپنے شوہر کی وصیت کے مطابق

"دیں یہ تمھارا ساتھ تم ان سب کے ساتھ ہو
میرا یہی ہے ساتھ کہ زینب کے ساتھ ہو"

نند کے ساتھ سارے مصائب خاموشی سے جھیل لیتی ہیں۔ ناموسِ حسینؑ کا اتنا پاس ہے کہ ہر جگہ پس منظر میں رہتی ہیں۔ قید خانے میں اپنی یتیم اور غم زدہ بچّی کی تسلّی و تشفّی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔ مگر بچّی جو باپ سے ہلی تھی، ماں سے خفا ہے۔ سمجھتی ہے اماں چاہتیں تو بابا سے ملا دیتیں۔ مگر ماں یہ صدمہ بھی خاموشی سے جھیل لیتی ہے۔ ہند کے قید خانے میں آنے کی خبر ملتی ہے، اس کا زینب اور بانو پر مختلف اثر ہوتا ہے۔ ہند کسی زمانے میں اہلِ بیت کی خانہ زاد کی حیثیت سے رہ چکی تھی اور امام حسینؑ سے اسے بےحد محبت و عقیدت تھی۔ شہر بانو ساری خوبیوں

اور صفات کے باوجود بہر حال عورت ہیں۔ اس کے قید خانے میں آنے کی خبر سُن کر اپنی تباہی و بربادی کا احساس اور شدّت سے ہوتا ہے۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے شوہر نے میرا گھر تباہ کیا ہے۔ مگر اہل بیتِ رسول کے اخلاق کا یہ عالم ہے کہ کسی نے یہ بات ہند سے نہیں کہی۔ بانو کے ذہن میں ماضی کے گزرے واقعات کی یاد تازہ ہو رہی ہے:

ایک دن وہ تھا کہ زہرا نے بتایا تھا وطن   خواب میں دیکھا تھا دیدارِ شہنشاہِ زمن
آج باندھی ہے ستم گاروں نے بازو میں رسن   میں ہوں محتاجِ ردا اور وہ محتاجِ کفن

دیکھوں کیا ذلتیں قسمت مجھے دکھلاتی ہے
خاک میں مل گئی جب، ملنے کو ہند آتی ہے

خود دار اور عزتِ نفس سے مالا مال عورت کی نفسیاتی کیفیت کی کتنی سچی تصویر ہے۔ ایک اس کے عروج کا زمانہ تھا جب خود اس کے پاس لونڈیاں تھیں۔ آج زہراؑ و علیؑ کی بہو، حسینؑ کی شریکِ حیات قید و بند کی ذلت اٹھا رہی ہے:

اک زمانہ تھا کہ پیدا ہوئے تھے جب سجّاد
راہِ خالق میں بہت لونڈیاں کی تھیں آزاد

اور اب یہ حال ہے کہ ؎

گھر مرا لُٹ گیا محتاج ہوں نادار ہوں میں
اب تو خود قیدِ مصیبت میں گرفتار ہوں میں

ایک کمزور روایت یہ بھی ہے کہ ہند کسی زمانے میں امام حسینؑ کے عقد میں تھی۔ اس روایت کے پس منظر میں شاعر عورت کے جذبات کو پڑھتا ہے کہ وہ جو شاہِ ایران کی بیٹی ہے اور حسین جیسے عالی مرتبت انسان کی بیوی ہے، آج قیدِ ستم میں

گرفتار ہے۔ اس حال میں وہ عورت ملنے آ رہی ہے جو اس کے شوہر کے عقد میں رہ چکی ہے۔ اس لیے ہند کے آنے کا شدید دُکھ اور ہلکا سا رقابت کا احساس عین عورت کی فطرت کے مطابق معلوم ہوتا ہے :

سنتی ہوں عقد میں تھی یہ بھی شرِ والا کے
تم بتانا نہیں گر وہ مجھے آ کر پوچھے

ہند قید خانے میں آتی ہے۔ ایک ایک کو دیکھ کر بدحواس و پریشان ہو کر یہ جاننے کی کوشش کرتی ہے کہ کہیں یہ خاندانِ نبوت کی خواتین تو نہیں؟ ان میں اسے ایک نیا چہرہ نظر آتا ہے جس پر ایک خاص جاہ و جلال ہے، وہ بڑی عاجزی سے ان سے پوچھتی ہے :

صدقے گئی بتایئے کیا آپ کا ہے نام　　للہ کچھ کہو میں ہوئی جاتی ہوں تمام
زنداں میں سب اسیروں کی سردار آپ ہیں؟
ان قیدیوں کی قافلہ سالار آپ ہیں؟

شہر بانو کو اپنے چھپانے کی فکر ہے مگر اس سے زیادہ ان کا فطری انکسار بیساختہ یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے :

بی بی یہ جو کہ روتی ہے نہوڑائے اپنا سر
تو دل میں جانتی ہے کہ ان کی عزیز ہوں
مختار یہ مری ہیں میں ان کی کنیز ہوں

اور پھر جب ہند پر یہ روح فرسا حقیقت کھلتی ہے کہ حسینؑ شہید کر ڈالے گئے۔ یہ اہل بیتِ رسول قید ہیں۔ اس کے ظالم شوہر نے امام کا سر اپنے خزانے میں رکھا ہے تو وہ حسینؑ کا سر اقدس وہاں سے زندان میں منگواتی ہے اور سب اہلِ حرم کے ساتھ خود بھی سر و سینہ پیٹنے لگتی ہے۔ سیدِ سجاد باپ کی تعظیم کو اُٹھتے

ہیں۔ سکینہ دوڑ کر باپ کے سر سے لپٹ جاتی ہیں۔ تو بانو کو ایک طرف بچھڑے شوہر کے سر کی زیارت کو بے قراری ہے۔ دوسری طرف ننھی بچی کی جان کی فکر ہے۔ بیٹی سے کہتی ہیں :

بس مل چکیں حسین سے قربان جائے ماں
اے نورِ عین بس نہ کرو نالہ و فغاں
ایسا نہ ہو کہ گھٹ کے نکل جائے تن سے جاں

اور بے قراری کے عالم میں منھ سے یہ بھی نکل جاتا ہے :

بچھڑے ہیں کب سے بادشہِ مشرقین سے
ہم بھی تو مل لیں فاطمہ کے نورِ عین سے

لیکن بچی ماں کو بے جان ملتی ہے تو کس حسرت و یاس سے زینب کا منہ دیکھ کر کہتی ہیں :

بچّی کو میری لے گئے سلطانِ بحر و بر

اکبر و اصغر پہلے ہی داغِ جدائی دے چکے تھے، زخموں کا مرہم یہ بچّی تھی، وہ بھی باپ کے سر پر قربان ہوگئی۔ دنیا کی کون عورت ہوگی ایسی حالت میں جس کے صبر و قرار کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ بانو کے بین میں ہر کوکھ جلی ماں کی فریاد سنائی دے سکتی ہے :

منہ سے اُٹھاؤ کُرتے کا دامن پھر ایک بار — بی بی تمھاری ننھی سی میّت کے میں نثار
اماں کو اپنے پاس بلالو تو ہو قرار — جی بھر کے تجھ کو دیکھ لے مادر جگر فگار

رُخصت کبھی نہ ہوگی ہمیں شور و شین سے
تم یاں سے جاکے قبر میں سوؤگی چین سے

بچی پر توڑے گئے ظلم و ستم یاد آکر ماں کے کلیجے میں برچھیاں چبھا رہے ہیں :

باندھا گلے کو شمر نے رسی سے بے ستم ہے ہے اُٹھائے قید میں کیا کیا نہ رنج و غم
دیتے تھے گھڑکیاں تھیں یہ بانیٔ ستم بابا کو یاد کرکے جو روتی تھیں دم بدم
زخمی ہیں کان پھول سے عارض کبود ہیں
اب تک نشاں طمانچے کے رُخ پر نمود ہیں

اپنی ناداری اور بے چارگی کا احساس کلیجے کے ٹکڑے کیے دے رہا ہے کہ بچی کے کفن دفن کی مقدرت بھی نہیں ہے :

چادر تلک نہیں ہے چھپاؤں جو سر کے بال بی بی خدا یہ خوب ہے روشن ہمارا حال
نادار ہوں میں پاس نہ دولت ہے اور نہ مال کسطرح تجھ کو دوں کفن اے میری خردسال
سنگِ الم سے شیشۂ دل پاش پاش ہے
دو گز کفن کے واسطے محتاج لاش ہے

ہم نے یہ ایک مختصر سا خاکہ شہر بانو کے اس کردار کا پیش کیا جو میر انیس نے دکھایا ہے۔ اس کردار میں ایک الگ شانِ انفرادیت ہے۔ یہ ایسی عورت کا کردار ہے جو اہلِ بیتِ حسینؑ میں ہے مگر رسول زادی یا امام زادی نہیں۔ لیکن سچّی مومنہ ہے۔ اسے بانیٔ اسلام اور ان کے خاندان سے گہری عقیدت ہے۔ نواسۂ رسول سے وہ عشق ہے جس کے ڈانڈے عشقِ الٰہی سے مل جاتے ہیں۔ شوہر اس کا محبوب بھی ہے اور ہادی و رہنما بھی۔ اسے اس کا غم نہیں کہ بادشاہ کی پوتی، بیٹی اور بہن ہوتے ہوئے وہ بندی میں آئی بلکہ اس کی مسرت ہے کہ اس طرح اسے نواسۂ رسول کی شریکِ زندگی بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ کبھی اپنی عالی نسبی پر ناز نہیں کرتی بلکہ حسینؑ کی بیوی اور خاندانِ رسول کی لونڈی ہونا اپنے لیے باعثِ فخر جانتی ہے۔ وہ جاننے والی بھاوج ہے خود افسرِ خاندان کی بیوی ہے مگر خاندان کی سرداری اور افسری کا حق ہمیشہ اپنی

نند زینب کو دیتی ہے۔ عاشق زار، وفا شعار بیوی ہے جس کو شوہر کی خوشنودی اور رضاجوئی کی ہر وقت فکر رہتی ہے۔ مگر ساتھ ہی اپنے شوہر سے گلہ شکوہ کرنے کا حق بھی رکھتی ہے۔ بچوں پر واری نثار ماں ہے جو ہر منزل پر ماں ہونے کا حق ادا کرتی ہے۔ خواہ وہ تعلیم و تربیت کی منزل ہو یا پرورش اور دیکھ بھال کی یا راہِ خدا میں کڑا امتحان دینے کی۔ وہ ہر ایک میں پوری اُترتی ہے۔ یہ حق پرست و مومن عورت اپنا سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر بھی کبھی لب پر شکوہ، دل میں گلہ نہیں لاتی۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے کردار میں، وہ جان، سیرت میں حقیقت کا وہ جلوہ نظر آتا ہے کہ اسی دنیا کی باسی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس طرح شہربانو کے کردار میں انیس نے حقیقی اور مثالی عورت کی ایسی تصویر پیش کی ہے جس کی سیرت اور شخصیت کا حُسن قاری کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے باقی رہتا ہے۔

———— : : ————

کنیزانِ اہلِ بیت

میر انیسؔ کے کلام میں جیسا کہ ہم نے دیباچے میں اشارہ کیا ہے، اہلِ بیتِ رسول کے کرداروں کے ساتھ ساتھ عام عورتوں کی سیرت اور کردار کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ کربلا کے صحیح تاریخی واقعات میں جن عام عورتوں کا تذکرہ ملتا ہے، انیسؔ نے ان میں شاعرانہ حُسن بھر کر ان سیدھی سچی خداپرست عورتوں کی سیرت میں ایسی دلکشی اور اثر پیدا کر دیا ہے کہ فاطمہؑ و علیؑ کی بیٹیوں اور بہوؤں کے ساتھ ان کے اخلاق و ایمان کا اثر بھی دل پر پڑتا ہے۔ انیسؔ بغیر کسی تبلیغ و تمہید کے صرف ان عورتوں کے کردار اُبھار کر بالواسطہ یہ دکھاتے ہیں کہ واقعۂ کربلا میں (الّا ماشاء اللہ) دشمنوں نے ظلم و ستم اور اسلام سے روگردانی کی بدترین مثالیں دنیا کے سامنے پیش کیں، حق سے مُنہ موڑا، باطل کے سامنے سر جھکایا، جہاں حکومت اور اقتدار، مال اور دولت اور عہدے کی ہوس نے انھیں اندھا اور بہرا بنا دیا تھا، وہاں عورتیں (ان سفاک قاتلوں کے گھر کی عورتوں تک) اسلام کی محبت، بانیِ اسلام

اور خاندانِ رسول کا عشق اور حق و ایمان کے لیے فدا ہو جانے کا گہرا جذبہ دل میں رکھتی تھیں۔ واقعۂ کربلا کے متعلق جن عام عورتوں کا تذکرہ ہمیں مرثیوں میں ملتا ہے ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو کسی زمانے میں کسی نہ کسی طرح خاندانِ رسول سے وابستہ رہ چکی تھیں اور قدرتی طور پر ان کے دل میں اس خاندان سے عقیدت و محبت کا جذبہ تھا اور ظاہر ہے ان پر خاندانِ اہلِ بیت کا اثر بھی پڑا تھا۔ فضّہ، ہندہ اور شیریں ان ہی میں سے ہیں۔ کچھ وہ عام عورتیں ہیں جو غائبانہ رسول اور اہلِ بیت رسول سے محبت کرتی اور اسلام کی پرستار ہیں۔ اس باب میں ہم کنیزانِ اہلِ بیت کا تذکرہ کریں گے۔

ان میں سب سے بلند اور پُراثر کردار فاطمہؑ زہرا کی کنیز فضّہ کا ہے۔ جس کی سیرت میں فاطمہؑ زہرا کی صفات کا پرتو جس کے استقلال میں خاندانِ نبوت کے عزم کی جھلک اور جس کے جذبۂ محبّت و ایثار میں سچّی مومنہ کی شان نظر آتی ہے۔

بہت نو عمری میں فضّہ فاطمہؑ زہرا کے پاس آئی تھیں۔ واقعۂ کربلا کے وقت وہ بوڑھی ہو چکی تھیں۔ روایت میں ہے کہ ایک بار بنتِ رسول نے اپنے والد محترم سے درخواست کی کہ بندی میں آنے والی کنیزوں میں سے ایک کنیز انھیں بھی دے دی جائے۔ اس وقت تو آنحضرتؐ نے انکار کر دیا، فرمایا تم سے زیادہ ضرورت مند لوگ میرے سامنے ہیں۔ مگر کچھ عرصے بعد فضّہ کو اپنی بیٹی کو دے کر کہا یہ تمھاری بہن ہے۔ سیدۃ النساء نے فضّہ کو سچ مچ سگی بہنوں سے زیادہ محبت اور شفقت سے رکھا۔ اپنے سے بہتر پہنایا، بہتر کھلایا۔ گھر کا کام ایک دن خود کرتیں، ایک دن فضّہ کرتی۔ بلکہ

"فضّہ سے فزوں کام کیا کرتی تھیں اکثر"

اور مساوات کا یہ عالم تھا:

پاس اپنے سدا فضہ کو بٹھلاتی تھیں زہرا
جب اُس کو کھلا لیتی تھیں تب کھاتی تھیں زہرا

ظاہر ہے ایسی مالکہ پر فضہ جان چھڑکتی تھیں۔ ان کے بچوں پر واری قربان تھیں۔ ان کی زندگی میں بھی بچوں کے پالنے پوسنے میں ہاتھ بٹاتی رہیں اور جب فاطمہ چار چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر خدا کو پیاری ہوئیں تو بے ماں کے بچوں کی خدمت اور دلداری کی ذمہ داری فضہ نے اپنے سر لے لی۔ امام حسنؑ و امام حسینؑ حضرت زینب و کلثوم چاروں بہن بھائی اپنی والدہ کی اس عزیز کنیز کا بڑا ادب اور محبت کرتے تھے۔

یہی فضہ ہے جس کی شخصیت اور سیرت کو انیسؔ نے بڑی خوبی سے اُبھارا ہے اور اس میں ایک خدا پرست اسلام اور بانیٔ اسلام کی عقیدتمند فاطمہؑ ان کے بچوں کی جاں نثار خدمت گزار عورت کی صفات اجاگر کر کے اسے واقعۂ کربلا میں ایک نمایاں اور اہم رول ادا کرتے دکھایا ہے۔

امام حسینؑ مدینے سے عازمِ سفر ہیں۔ خواتینِ اہلِ بیت اونٹوں پر سوار ہونے والی ہیں۔ سب سے پہلے خواہرِ حسین زینب محمل میں سوار ہوتی ہیں تو بھائی، بیٹے، بھتیجے سب اس کے اہتمام میں نظر آتے ہیں اور ؎

فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر

راستے میں محرم کا چاند نظر آتا ہے۔ اندر اہلِ حرم اور باہر امام حسینؑ اور ان کے ساتھی چاند دیکھ رہے ہیں کہ ؎

اتنے میں یہ فضہ علی اکبر کو پکاری ۔۔۔ لو دیکھ چکی چاند یداللہؑ کی پیاری
عادت ہے کہ وہ دیکھتی ہیں شکل تمہاری ۔۔۔ آنکھوں کو کیے بند یہ فرماتی ہیں واری

۱؎ حضرت علی کا لقب

آئے تو رُخِ اکبرِ ذیجاہ کو دیکھوں
شکلِ مہِ نو دیکھ چکی ماہ کو دیکھوں

فضہ کا رتبہ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ عرب میں لونڈیاں پردہ نہیں کرتی تھیں مگر فضہ آزاد خواتین کی طرح پردے کی پابند ہیں۔ چنانچہ حضرتِ عباس ایک جگہ کہتے سُنائی دیتے ہیں :

فضہ کبھی بے مقنع و چادر نہیں نکلی

لیکن جب اہلِ بیت کا کوئی پیام پہنچانا ہوتا ہے تو یہ فرض فضہ ادا کرتی نظر آتی ہیں۔ کبھی خود ہی امام حسینؑ یا عباس کو بچوں کی حالت سے آگاہ کرتی ملتی ہیں۔ صبحِ عاشور نمازِ فجر کے بعد دشمن تیروں کی بوچھار کرتا ہے تو :

اکبر سے مڑ کے کہنے لگے سرورِ زماں
باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکرِ گراں
تم جاکے کہدو خیمے میں یہ اے پدر کی جاں
بچوں کو لے کے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں
غفلت میں تیر سے کوئی بچہ ہدف نہ ہو
ڈر ہے مجھے کہ گردنِ اصغر ہدف نہ ہو

لیکن حسینؑ ابھی بیٹے سے یہ کہہ ہی رہے ہیں کہ وفا شعار فضہ کی آواز آتی ہے :

کہتے تھے یہ پسر سے شہِ آسماں سریر
فضہ پکاری ڈیوڑھی سے اے خلق کے امیر
ہے ہے علیؑ کی بیٹیاں کس جا ہوں گوشہ گیر
اصغر کے گاہوارے تلک آ گرے ہیں تیر
گرمی میں ساری رات تو گھٹ گھٹ کے روئے ہیں
بچے ابھی تو سرد ہوا پا کے سوئے ہیں

بچوں کی دردناک حالت کا پورا نقشہ کھینچ رہی ہے ؎

باقر کہیں پڑا ہے سکینہ کہیں ہے غش
گرمی کی فصل یہ تب و تاب اور یہ عطش
رو رو کے سو گئے ہیں صغیرانِ ماہ وش
بچوں کو لیکے یاں سے کہاں جائیں فاقہ کش

یہ کس خطا پہ تیر پیاپے برستے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے واسطے بچّے ترستے ہیں

یہ جملے کسی ایسی کنیز کے نہیں ہو سکتے جس کے گھر میں کوئی جگہ نہیں بلکہ ایک خاندان کی بڑی بوڑھی بزرگ عورت کے معلوم ہوتے ہیں جو سب کچھ کہنے کا حق رکھتی ہے۔ فضّہ کو بچّوں کی فکر ہر موقع پر رہتی ہے۔ حضرت عباس امام حسینؑ سے رخصت طلب کر رہے ہیں اس وقت بھی ؎

ناگاہ درِ خیمہ سے فضّہ یہ پکاری　　غش ہو گئی ہے پیاس سے پھر آپ کی پیاری
گہوارے میں اصغر بھی سسکتا ہے میں واری　　عباس کو بھیجو کہ حرم کرتے ہیں زاری

ایک اور مرثیے میں وہ خود امام حسینؑ کو بچّوں کی حالتِ زار سے آگاہ کرتی ہیں ؎

دو جانیں تلف ہوتی ہیں یا حضرت شبیر　　پانی اسے ممکن ہے نہ ملتا ہے اسے شیر
سر چوب سے ٹکراتی ہیں یاں بانوئے دلگیر　　للّٰلہ کرو پانی کے منگوانے کی تدبیر
پانی کے لیے ماں سے یہ منہ موڑ رہے ہیں
دو بھائی بہن خاک پہ دم توڑ رہے ہیں

عباس نے میدانِ جنگ میں جان دے دی لیکن ابھی خیمے میں یہ خبر نہیں پہنچی۔ سب سے زیادہ سکینہ بے قرار ہے۔ اس وقت درِ خیمہ سے فضّہ چلاتی ہے ؎

اب دخترِ سلطانِ مدینہ نہیں تھمتی
عباس سے کہہ دو کہ سکینہ نہیں تھمتی

حضرت عباس کی شہادت کی خبر سُن کر جب سکینہ بے قرار ہو کر مقتل کی طرف دوڑتی ہے تو ؎

یوں کہنے لگی دوڑ کے فضّہ جگر افگار　　جاتی ہو کہاں تیر نہ مارے کوئی خونخوار

کسی سخت سانحہ کے بعد قریبی عزیزوں کو صدمے سے ہوش نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں عام طور پر دُور کے رشتہ دار یا خیر خواہ پرانے ملازم بچوں کی دیکھ بھال کا فرض ادا کرتے ہیں اور جو ضروری کام اور انتظام کرنا ہوتا ہے اسے انجام دیتے ہیں۔ امام حسینؑ کے یہاں یہ فرائض فضّہ ادا کرتی ملتی ہیں لیکن سب کو گودوں میں پالا ہے، ان سے دلی محبّت ہے اس لیے بعض وقت بدحواسی کا عالم بھی نظر آتا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر عباس کی شہادت کے بعد خون میں ڈوبا علم لے کر امام حسینؑ خیمے میں آتے دکھائی دیتے ہیں تو فضّہ عالمِ بے قراری میں چلاتی ہیں

سیدانیو ! اٹھو علم آتا ہے خوں میں تر

اکبر علم لیے ہیں علی کا نشاں نہیں ‏ ‏ ‏ کوتل فرس تو آتا ہے وہ نوجواں نہیں

قاسم ابن حسنؑ جامِ شہادت سے سیراب ہوئے۔ ایک دن کی دلھن رانڈ ہو گئی۔ بیوہ ماں کی کوکھ اُجڑ گئی۔ حادثہ اتنا سخت ہے کہ بوڑھی تجربہ کار، سرد و گرم زمانہ سہی فضّہ بھی ضبط نہیں کر سکتی۔ بے ساختہ منھ سے بین نکل رہے ہیں۔ لیکن پُرانی خیر خواہ خادماؤں کا اندازِ بیان صاف نمایاں ہے جو غیر ارادی طور پر نالہ و بین کرنے لگتی ہے تو گھر والوں کی بے قراری اور بڑھ جاتی ہے۔ یہاں فضّہ ہمیں بنتِ رسول کے گھر میں پلی بڑھی کنیز کی جگہ خالص دلی لکھنؤ کے پرانے طرز کے گھرانوں کی خادمہ معلوم ہوتی ہے۔ قاسم و کبرا کے متعلق جتنے مرثیے انیس نے لکھے ہیں، اس میں یہ انداز زیادہ نمایاں ہے۔ حسینؑ بھتیجے کا لاشہ مقتل سے گھر میں لا رہے ہیں:

فضّہ بھی آگے آگے کھلے سر برہنہ پا ‏ ‏ ‏ آئی جو صحن تک تو یہ رانڈوں کو دی صدا
چھپ جائے جس سے دور کا ناتا ہو صاحبو ‏ ‏ ‏ دولھا دلھن کے لینے کو آتا ہے صاحبو
بہنیں کدھر ہیں ڈالنے آنچل بنے پہ آئیں ‏ ‏ ‏ اب دیر کیا ہے حجرے سے باہر دلھن کو لائیں
رخصت ہو جلد تا کہ براتی بھی چین پائیں ‏ ‏ ‏ جاگے ہیں ساری رات کے اپنے گھروں کو جائیں

دل پر ہے فراق کی شمشیرِ تیز کو
ماں سے کہو دلھن کے نکالے جہیز کو

قطع نظر اس کے کہ یہ تہذیبی پس منظر خالص دلّی لکھنؤ کی تہذیب کا ہے۔ ایک ایک جملہ تیر و نشتر کی طرح دل میں اُتر جانے والا ہے۔ اس ایک شب کی بیاہی حسینؑ کی رانڈ بیٹی کی فکر فضّہ کو ہمیشہ رہتی ہے۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جب دشمن خیمے لوٹنے آتے ہیں اُس وقت بھی فضّہ اس کی حفاظت کرتی ہے ؎

کبرا کو جو اک دشمنِ دیں لوٹنے آیا | فضّہ نے اُسے دوڑ کے چادر میں چھپایا
تلوار سے ظالم نے ضعیفہ کو ڈرایا | سر پیٹ کے فضّہ نے اسے تب یہ سُنایا

مظلوم ہے بیکس ہے گرفتارِ محن ہے
چادر نہ اُتار اس کی یہ اک شب کی دلھن ہے

علی اکبر کی رخصت سے پہلے ماں اور پھوپھی بے قرار ہیں کہ باہر کی کچھ خبر نہیں مل رہی، کہیں ان کا پیارا میدانِ جنگ میں سدھار تو نہیں گیا۔ اس وقت زینب فضّہ سے کہتی ہیں ؎

فضّہ نکل کے خیمہ سے باہر خبر تو لا | آنے میں دیر کیوں ہوئی یہ ماجرا ہے کیا
سنتی ہوں میں کہ شاہ سے ہیں طالبِ رضا | پوچھیں تو کہدے نزع میں ہے بنتِ مرتضیٰ

اکبر زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتے ہیں۔ حسینؑ اس وقت ان کے پاس پہنچتے ہیں جب وہ عالمِ نزع میں ہیں۔ درِ خیمہ پر بیبیاں بے تاب و بے قرار کھڑی ہیں۔ زینب کی حالت دیکھ کر ؎

فضّہ پکاری ڈیوڑھی سے بڑھکر یہ ایکبار | اکبر یہ کیا گذر گئی اے شاہِ نامدار

چھریاں غم و الم کی کلیجے پہ چلتی ہیں
جلد آیئے کہ حضرتِ زینب نکلتی ہیں

یہاں زینب کے نام کے ساتھ حضرت کا اضافہ ایک لطیف اشارہ ہے اس بات کا کہ فضّہ کو ان کی عظمت و مقام کا پورا احساس ہے۔ بنتِ زہرا بدحواسی میں کھلے سر خیمے سے باہر نکل جائے یہ خیال اس کے لیے قیامت سے کم نہیں۔

فضّہ کو یوں تو خاندان کے سبھی افراد سے گہرا لگاؤ ہے مگر سب سے زیادہ محبت اسے زینب اور ان کے بچوں عون و محمد سے ہے۔ انھوں نے زینب کو پالا ہے اور ان کے بچوں کی بھی خدمت کی ہے۔ وہ اکثر "میری خوزادی" کہہ کر ان کا ذکر کرتی ہیں۔ گھرانے کی پرانی دائیوں اور خادماؤں کو نواسوں پوتوں سے جو والہانہ محبت ہوتی ہے انیسؔ نے وہی الفت فضّہ کی عون و محمد سے دکھائی ہے۔

زینب روزِ عاشورہ اس فکر میں ہیں کہ حسینؑ کے یاور و انصار اور عزیز شہید ہو رہے ہیں مگر ان کے بچّے اب تک میدانِ جنگ نہیں گئے۔ فضّہ ماں کے جذبات کو بھی محسوس کرتی ہے اور اس سے زیادہ بچوں کی فکر ہے۔ وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے درِ خیمہ پر کھڑی نظر آتی ہے جیسے ہی عون اور محمد امام حسینؑ سے رخصتِ جنگ پاتے ہیں، وہ آ کر ماں کو خبر سناتی ہے:

یہ ذکر تھا فضّہ جو خبر لے کے یہ آئی ۔۔۔ فریاد کہ اب لٹتی ہے زینب کی کمائی
لو میرے خوزادوں نے رضا جنگ کی پائی ۔۔۔ اے بنتِ علی رو رہے ہیں آپ کے بھائی
بچّے بھی شریکِ شہدا ہوتے ہیں لوگو
دو بھانجے ماموں پہ فدا ہوتے ہیں لوگو

"میرے خوزادے" کہہ کر اپنا حق اور محبت جتائی جا رہی ہے اور اس پر چھپا ہوا ناز بھی ہے کہ وہ ماموں پر قربان ہونے جا رہے ہیں۔ مگر تہذیب و آداب کا پاس دیکھیے، یہ نہیں کہتیں کہ ماں سے بیٹے بچھڑ رہے ہیں بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ

ماموں پر بھانجے اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے جہاد پر جا رہے ہیں۔

اور جب بچے میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دے رہے ہیں اور ماں خیمے کے در پر کھڑی بچوں کی جنگ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس وقت انیسؔ ہندوستانی رسم و رواج کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ نہیں دکھاتے کہ وہ خود یہ منظر دیکھ رہی ہے بلکہ فضہ کی آنکھوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس سے ایک ایک بات پوچھ رہی ہیں اب کیا کر رہے ہیں؟ اب کیا ہو رہا ہے؟ جنگ میں دادِ شجاعت دی جا رہی ہے نا؟ نہر کے قریب تو نہیں گئے؟ پیاس کی شدت نے بے حال تو نہیں کر دیا۔ فضہؔ بچوں کی محبت میں بے تاب اور ماں کی حالت کے احساس کے ساتھ:۔

فضہ تھی پریشاں کئے منہ خیمے سے باہر پردے میں لگی کہتی تھیں یہ شاہ کی خواہر

بتلا مجھے بچے مرے کیا کرتے ہیں دونوں
وہ کہتی تھی لاکھوں سے وغا کرتے ہیں دونوں

البتہ اس وقت فضہ جو جنگ کی منظر کشی کرتی ہے وہ کسی ہندوستانی خادمہ کے بس کی بات نہیں۔ اس میں عرب کی عورت کی فصاحت و بلاغت بھی ہے اور بچوں سے گہری محبت بھی نظر آتی ہے:۔

وہ رُخ پہ نظر آتے ہیں اُڑتے ہوئے گیسو وہ تیغے بجلی کی طرح گرتے ہیں ہر سو
ڈھالیں لئے وہ بھاگتے پھرتے ہیں جفا جو وہ ابر میں چھپ چھپ کے نکل آتے ہیں مہ رو

بہتا ہے لہو چھاتیوں سے چور ہیں دونوں
کس طرح پکاروں کہ بہت دور ہیں دونوں

بیان کرنے والی آئینِ جنگ سے بھی بے خبر نہیں ہے

لاکھوں تو بلائیں ہیں وہ بچے کیسے ٹالیں تلواریں اِدھر ہیں تو اُدھر نیزوں کی بھالیں

زرہوں پہ نہ چار آئینے، نے ہاتھوں پہ ڈھالیں　　　مہلت نہیں سینے سے جو تیروں کو نکالیں
تلواروں میں بھائی کی سپر ہوتا ہے بھائی
بہتا ہے جو بھائی کا لہو روتا ہے بھائی

زینب نے کہا دونوں ہیں یکجا کہ جدا ہیں　　　کی عرض یہ رو کر کہ نہیں ایک ہی جا ہیں
لاکھوں ہیں عدو اور وہ دو ماہِ لقا ہیں　　　منہ نہر سے پھیرے ہوئے سرگرمِ وغا ہیں

اور پھر تڑپ کر کہتی ہے ؎

دم خوف سے سینے میں سماتا نہیں اب تو
ہے ہے مجھے چھوٹا نظر آتا نہیں اب تو

اور ان بچوں کے مارے جانے کی خبر سن کر ادھر تو ؎

تھی شکر کے سجدے میں ید اللہ کی جائی

اور ادھر ؎

فضہ نے یکایک یہ خبر آکے سنائی　　　سیدانیو! لوٹی گئی زینب کی کمائی
دم توڑتے ہیں خاک پہ معصوم، دہائی

اور پھر ایک دم ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اب تک کسی کے مرنے پر اس طرح بین نہیں کیے گئے تھے مگر اس وقت پالے کی محبت بیقرار کر دیتی ہے اور بلک کر کہتی ہے ؎

مرتے ہیں زبانوں کو نکالے ہوئے بچے　　　ہے ہے مری آغوش کے پالے ہوئے بچے

امام حسینؑ کی شہادت ہوتی ہے اس وقت بھی فضہ درِ خیمے پر کھڑی تھی اور یہ روح فرسا حادثہ دیکھ کر ؎

دہشت کے مارے جسم لگا کانپنے تمام
ناگاہ نیزے پر نظر آیا سرِ امام　　　روتی پھری وہ اور کیا زینب سے یوں کلام

آئی تباہی بخت تمہارا الٹ گیا
بی بی گلا حسین کا خنجر سے کٹ گیا

دوسری خواتین کے ساتھ فضہ بھی اب تک امید کا تار تھامے ہوئی تھی۔ وہ بھی سمجھتی تھی کہ جب تک حسینؑ زندہ ہیں، کوئی مصیبت، کوئی صدمہ ناقابل برداشت نہیں۔ ان کا سہارا، ان کا سایہ جب تک اہلِ حرم کے سر پر ہے سب کچھ ہے۔ مگر یہ آخری قیامت ٹوٹنے کے بعد بے ساختہ یہ کہنا کہ بس تباہی، بربادی، بدبختی میں کوئی کسر نہیں کہ "گلا حسین کا خنجر سے کٹ گیا"، مایوسی اور مصیبت کی ایک درد بھری چیخ ہے۔

لیکن وہ خاندانِ رسالت کی کنیز ہے اور بڑی مضبوط شخصیت کی مالک۔ جب امام حسینؑ کو شہید کرنے کے بعد دشمن گھوڑوں پر سوار کوڑے ہاتھ میں لیے خیمے لوٹنے، جلانے، سیدانیوں کو ستانے آتے ہیں اور اپنی بربریت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس ضعیفہ کے جسم میں طاقت اور مدافعت کی نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر موقع پر، چاہے وہ کبریٰ کو چادر میں چھپانا ہو یا سکینہ کو درّوں کی مار سے بچانا، زینب کے سر سے چادر چھیننے سے ظالموں کو روکنا ہو، یا خیمے جلانے پر دشمنوں کو ملامت کرنا، وہ انتہائی بے خوفی سے ان کو للکارتی، ملامت کرتی اور بس بھر اپنی خوزادیوں کو ان کے ظلم و ستم سے بچاتی نظر آتی ہے، کبھی خوفِ خدا دلاتی ہے، کبھی سیدانیوں کے مرتبے اور اس گھر کی عظمت بیان کرتی ہے ؎

جل جاؤ گے جو اہلِ حرم پر نگاہ کی
ڈیوڑھی ہے یہ امام فلک بارگاہ کی
اے ناریو! یہ حیدرِ صفدر کا ہے مکاں
اس کا ادب کرو یہ پیمبر کا ہے مکاں
پیچھے ہٹو نبی کی یہ دختر کا ہے مکاں
حق سے ڈرو یہ شافعِ محشر کا ہے مکاں

یاں اِذن جبرئیل کو جب تک ملا نہیں
پاسِ ادب سے وہ کبھی آگے بڑھا نہیں

ظالم زبردستی آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو یہ بہادر ضعیفہ ان کو روکنے کی بھی کوشش کرتی ہے ؎

فضّہ نے کہا خیمے کے پردے کو پکڑ کر
یہ گھر ہے محمدؐ کا یہ ہے فاطمہ کا گھر
یاں ہے کوئی بیٹی تو کوئی پوتی علی کی
زینب تو نواسی ہے رسولِ عربی کی

آخری مصرعہ گویا ملامت کی انتہا ہے۔ جس رسول کا تم کلمہ پڑھتے ہو۔ نام کے مسلمانو! زینب اسی ہادیِ کونین کی نواسی ہے۔ اور پھر بھی تم یہ گستاخی کرنے کی ہمّت رکھتے ہو؟ اس گھر کی عظمت سے کیا تم واقف نہیں؟

کعبہ سے کم نہیں ہے بزرگی میں یہ مکاں
رہتے تھے اس میں سیّدؐ[1] و سردارِ انس و جاں
اس کا ہر ایک در ہے درِ خلد بے گماں
یاں کی زمیں سے پست ہے رتبے میں آسماں
رفعت میں اوجِ عرشِ بریں سے دو چند ہے
کرسی سے اس مکان کا پایہ بلند ہے

جب فضّہ ان کی انسانیت اور شرافت سے مایوس ہو جاتی ہے تو ان کی عقل کو اپیل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ اس گھر میں نہ مال و زر ہے نہ ساز و سامان ہے اسے لوٹ کر تمھیں کیا حاصل ہوگا ؎

ظاہر ہے سب پہ حضرت خیر النسارؐ[2] کا حال
فاقے پہ فاقے کر کے سدھاریں وہ خوش خصال
ہیں ان کی بیٹیاں بھی غریب و شکستہ حال
اس گھر کو لوٹتے ہیں جہاں ہو متاع و مال

---

[1] یعنی جناب رسول خدا
[2] فاطمہ زہرا کا لقب

سیدانیوں کے فقرے سے آگاہ کیا نہیں

ثابت کسی کے سر پہ گزی کی رِدا نہیں

دشمن کا جواب اس کی دیرینہ دشمنی اور سیاہ باطنی کا آئینہ دار ہے ؎

فضہ سے تب یہ کہنے لگا شمرِ بے حیا ۔ ہے ہم کو بغض مال اگر کچھ نہ نکلے گا

تو یہ خیام آگ سے دیویں گے ہم جلا ۔ اور سر سے چھین لیں گے ہر اک رانڈ کے ردا

دانستہ اہلِ بیتِ نبی کو ستائیں گے

مسند محمدؐ عربی کی جلائیں گے

جب فضہ سے کچھ بن نہیں پڑتا تو خالص نسوانی انداز میں ؎

فضہ سر پیٹ کے چلائی یہ با چشم پر آب ۔ ہے یہ بیت الشرفِ خاص شہِ عرش جناب

روح زہرا و نبی سے تجھے لازم ہے حجاب ۔ دخترِ فاطمہ اس گھر میں ہے اے خانہ خراب

اور شاعر نے فضہ کے صدمے اور استعجاب، رنج اور غصے کی ساری کیفیتوں کو اس مصرعے میں سمو دیا ہے ؎

"کیا محمدؐ کی نواسی کی رِدا لیوے گا"

ظالم سے رحم کی درخواست بار بار کی جارہی ہے ؎

رحم کر رحم ستمگار یہ ہے رحم کی جا ۔ سر پہ رانڈوں کے فقط کہنہ ہے اک اک ردا

گھر میں ناداروں کے اسباب کجا، مال کجا ۔ غیرِ تسبیح و مصلا نہیں کچھ یاں بخدا

قافلہ رانڈوں کا بیکس ہوا محتاج ہوا

گھر تو شبیر کے مرجانے سے تاراج ہوا

آخری شعر درد و حسرت کی تصویر ہے کہ اس گھر کی پونجی تو حضرت شبیر کی ذات اقدس تھی جو تم لوگ پہلے ہی لوٹ چکے ہو۔ اب یہاں تسبیح و مصلا کے سوا اور کیا رہ گیا ہے۔

مگر جن کو نواسۂ رسول کو قتل کرکے خوفِ خدا نہ آیا، نواسیِ رسول کو بے رِدا اور خانۂ رسول کو تباہ کرتے ان کے ضمیر پر کیا آنچ آتی؟ انھوں نے بچوں کو درّے مارے، عورتوں کے سروں سے چادریں چھینیں اور سیّد سجاد کو قید کرکے خیموں میں آگ لگادی۔ اس کے بعد رانڈوں کو بے کجاوہ اونٹوں پر سوار کرکے لے جانے لگے۔ اس وقت فضّہ کی بے تابی ناقابلِ اظہار حد تک پہنچ چکی ہے ؎

تم پر سے شاہزادیو، لونڈی نثار ہو　　سو پردوں میں رکھوں جو مرا اختیار ہو
جانِ نبی ہو بنتِ شہِ ذوالفقار ہو　　محمل کہاں، کہوں جو تم ان پر سوار ہو

کون اس بلا کو آن کے اس وقت رد کرے
اللہ بیکسی میں تمھاری مدد کرے

خود بھی سارے مصائب جھیل رہی ہے مگر اپنی ذرّہ بھر فکر نہیں۔ قید ہوتی ہے، ان کے ساتھ کوفہ وشام کے دربار میں جاتی ہے۔ زندانِ شام کی مصیبتیں جھیلتی ہے مگر گلہ شکوہ تو کیا ذرا سا اپنی کسی تکلیف کا ذکر تک نہیں کرتی۔ جب ہند قید خانے میں اہلِ حرم کو دیکھنے آتی ہے اور یہ سن کر کہ یہ قیدی مدینے کے رہنے والے ہیں۔ اہلِ بیتِ رسول کا تذکرہ چھیڑ دیتی ہے اور وہ فاطمہ زہرا کی صفاتِ عالیہ کا تذکرہ کر رہی ہے اس وقت ؎

عسرتِ فاطمہ زہرا کا جو احوال سنا　　دم بخود سب رہیں پر ضبط نہ فضّہ سے ہوا
کوٹ کر چھاتی کو کہنے لگی چلّا چلّا　　ہائے بی بی تری مظلومی پہ لونڈی ہو فدا

ایسے دکھ پائے کہ بچوں سے بھی منہ موڑ گئیں
قید ہونے کو بڑھاپے میں مجھے چھوڑ گئیں

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہند سے اپنی بی بی کا نام سن کر صبر وضبط کے بندھن جو ٹوٹے تو یاد آگیا کہ فاطمہ کس طرح اس سے سگی بہن کا سا سلوک اور عزت ومحبت کا

برتاؤ کرتی تھیں۔ کس شان سے ساری زندگی گذری۔ مگر اس بڑھاپے میں یہ درگت ہوتی رہ گئی تھی۔ اسی لیے نا کہ اس عالی مرتبت مالکہ دنیا میں نہیں، تبھی تو بے اختیار پہلی اور آخری مرتبہ یہ جملہ منہ سے نکل جاتا ہے کہ ہائے تم مجھے بڑھاپے میں قید کی مصیبت جھیلنے کو کیوں چھوڑ گئیں۔

ہند قید خانے میں حضرت زینب کو نہیں پہچان پاتی۔ اور وہ خود کوشش کرتی ہیں کہ اس پر یہ حقیقت نہ کھلے کہ میں حسینؑ کی بہن زینب ہوں مگر ضبط کی انتہائی کوشش میں بے ہوش ہو جاتی ہیں اس وقت فضہ کو ضبط کا یارا نہیں رہتا ؎

فضہ چلائی کہ ہے ہے مری بیکس زینب | کون پہچانے تمھیں ہو گئیں بے بھائی کی اب
قتل شبیر کا احوال سنایا نہ گیا | قید میں نام بھی غیرت سے بتایا نہ گیا

فضہ کا کردار انیسؔ کے بڑے جاندار اور حسین کرداروں میں سے ایک ہے۔ وہ خاندانِ نبوت و امامت کی فرد نہیں، محض اس گھرانے کی کنیز ہے۔ اس میں بلند ترین اخلاقی اقدار اور وہ روحانیت نہیں جو رسولِ خدا کی نواسیوں میں رچی بسی ہے۔ وہ ایک غریب عورت ہے جو کسی جنگ میں بندی میں آئی تھی مگر نصیب نے یاوری کی اور فاطمہؑ زہرا کی کنیزی کا شرف حاصل ہو گیا۔ تاریخ یا کوئی روایت ہمیں نہیں بتاتی کہ اس وقت فضہ کی عمر کیا تھی، مگر قیاس کہتا ہے کہ نوجوانی کا زمانہ ہوگا اس لیے کہ ساٹھ برس بعد واقعۂ کربلا پیش آیا۔ اسی وقت ان کے بڑھاپے اور ضعیفی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس طرح یہ کم عمر لڑکی نوجوانی ہی سے بنتِ رسول کی صحبت اور تربیت سے فیض یاب ہوئی اور ان کی وفات کے بعد لگ بھگ پچاس سال تک ان کے بچوں اور پھر ان کے بچوں کی خدمت میں زندگی بسر کرتی رہی۔ کسی روایت میں یہ ذکر نہیں ملتا کہ فضہ کی شادی ہوئی

تھی۔ ممکن ہے بیاہ ہی نہ ہوا ہو یا بیوہ ہو گئی ہوں۔ بہرحال ان کی ساری محبت کا مرکز اپنی بی بی سیدۃ النسار کی ذات اور ان کی اولاد رہتی ہے۔ واقعۂ کربلا کے وقت قافلے کے ساتھ ان کا جانا اور ہر موقع پر ان کا موجود ہونا اور حصّہ لینا ثابت کرتا ہے کہ سفر میں امام حسینؑ نے جب اپنی والدۂ محترمہ کی اس چہیتی کنیز کو ساتھ لیا ہوگا تو وہ جانتے ہونگے کہ فضّہ کس کردار کی مالک ہے اور فضّہ نے ان کے اعتماد کا حق ادا کر کے دکھا دیا کہ اعلیٰ مقاصد میں ساتھ دینے اور اہلِ بیتِ رسول پر جان وارنے میں وہ کسی سے کم نہیں۔ اس نے دکھ جھیلے، صدمے اٹھائے، مگر صبر و برداشت میں فرق نہیں آیا۔ حق گوئی اور سچائی کا پالن کرنے میں بھی وہ ہمیں اہلِ بیت کے دوش بدوش نظر آتی ہے اور انیسؔ نے یہی دکھایا ہے کہ اہلِ بیتِ رسول کی پروردہ کنیز کا کردار ان کی صحبت کے فیضان نے کتنا بلند کر دیا تھا۔ وہ یہ باتیں تبلیغی انداز سے نہیں کہتے بلکہ ان کی سیرت اور شخصیت کو ابھار کر ثابت کرتے ہیں اور فضّہ ان کا وہ لاثانی کردار ہے جو ہمیں اپنے سے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے اور جس کے آئینے میں ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کوئی بھی مسلمان عورت اس بلند مقام پر پہنچ سکتی ہے۔

شیریں ۔ کنیزِ شہربانو

شیریں بھی ایک کنیز ہے۔ وہ عرب نہیں ایرانی ہے۔ شہربانو کے ساتھ ہی بہت کم سنی میں وہ بھی بندی میں آئی تھی۔ شہربانو نے اسے بچوں کی طرح پالا پوسا پھر آزاد کر کے ایک دمشق کے رئیس سے شادی کر دی۔ شادی کے وقت شیریں سے امام حسینؑ نے وعدہ کیا تھا کہ ہم کبھی تیرے گھر آئیں گے۔ وہ سالہا سال تک

اپنے آقا کے اس وعدہ کے پورا ہونے کا انتظار کرتی رہی ۔ یہاں تک کہ واقعۂ کربلا کے بعد جب اہلِ بیت کا لٹا قافلہ اس کی ریاست کے قریب سے گزرا تو اسے سرِ امام مظلوم اور بدنصیب رانڈوں کی میہمانی کا شرف حاصل ہوا۔ اس واقعے کو سب مرثیہ گو شاعروں نے نظم کیا ہے ۔

مرزا دبیر کے تو اس موضوع پر کئی مرثیے ہیں جن میں انھوں نے اپنے مخصوص مبالغہ آمیز انداز اور پرشوکت و شاندار الفاظ میں اس واقعے کو بیان کیا ہے ۔ ان کا مشہور مرثیہ ؎

جب حرم قلعۂ شیریں کے برابر آئے

بڑا مشہور اور پُر اثر ہے ۔ انیس نے بھی واقعہ شیریں سے متعلق مرثیے کہے ہیں ۔ ان کا ایک مرثیہ ہے ؎

اے مومنو کیا صادق الاقرار تھے شبیر

صرف مطلع کے پہلے مصرعے سے آپ ان دونوں قادرالکلام شاعروں کے طرزِ بیان اور سوچنے کے انداز کا فرق سمجھ سکتے ہیں ۔

میر انیس نے شیریں کا جو کردار دکھایا ہے کسی معمولی لونڈی کا نہیں بلکہ ایک سچی مسلمان اور عاشقِ اہلِ بیت عورت کا کردار ہے ۔ ہم آپ کو کلامِ انیس کے آئینے ہی میں شیریں کا عکس دکھاتے ہیں ۔

شہر بانو کے ذکر میں بیان ہو چکا ہے کہ ایک بار انھیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ امام حسینؑ شیریں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں تو انھوں نے اسے اپنے شوہر کی نذر کیا ۔ مگر جب امام نے ہنس کر ان کی غلط فہمی دور کر دی اور شیریں کو آزاد کر دیا تو اسے بہت سا زر و زیور دیا اور جب امام حسینؑ نے وجہ دریافت کی کہ ؎

اوروں کو نہ اتنا زر و زیور دیا تم نے   شیریں سے یہ الفت کہ غنی کر دیا تم نے

تو وفا شعار بیوی نے جواب دیا ؎

آزاد کیا تھا انھیں میں نے مرے سرور — ہر چند کہ سلطانِ عجم کی ہوں میں دختر
پر فاطمہ زہرا کی کنیزوں سے ہوں کمتر

مگر ؎

خود صدقے ہوں شیریں پہ اگر میں تو بجا ہے — فرزند نبی نے اسے آزاد کیا ہے

اس تمہید سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شہر بانو نے شیریں کو بہت کمسنی سے پالا تھا اور محبت کی وجہ سے اپنے سے دور نہیں کیا تھا۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ شیریں آہو چشم اور غیر معمولی حسین تھی۔ وہ بچپن سے اس گھر کو اپنا گھر اور شہر بانو، امام حسینؑ کو اپنے ماں باپ کی جگہ سمجھتی آئی تھی اور ان کے بڑے بیٹے سیّد سجاد کو اس نے پالا تھا۔ وہ رخصت کے وقت بہت بے قرار ہو جاتی ہے ؎

شیریں کے یہ سن کر ہوئے اشک آنکھوں سے جاری — لیں ہاتھوں سے بالوں کی بلائیں کئی باری
سجاد کو لے گود میں بولی کہ میں واری — اب تم سے جدا ہوتی ہے لونڈی یہ تمھاری
خط بھیج کے اپنا مرا دل شاد کرو گے
اس پالنے والی کو کبھی یاد کرو گے

صدقے گئی خدمت کو مری بھول نہ جانا — جب ہونے لگے بیاہ تو لونڈی کو بلانا
سہرا مجھے اس چاند سی صورت پہ دکھانا — اس سمت سفر ہو تو مرے گھر میں بھی آنا
نزدیک جو آنے کی خبر پاؤں گی واری
چھاتی مری امڈے گی میں آپ آؤں گی واری

بجائے بزرگوں سے کہنے کے ننھے بچے سے دل کا حال کہنا عین فطرت کے مطابق ہے ؎

پھر پاؤں پہ سر حضرتِ زینب کے جھکایا ‏ ‏ شفقت سے گلے شاہ کی خواہر نے لگایا
جب آپ کو اس نے قدمِ شہ پہ گرایا ‏ ‏ سب روتے تھے حضرت کو بھی رونا بہت آیا

بانو کے نہ قدموں سے جدا ہوتی تھی شیریں
نعلین سے منہ ملتی تھی اور روتی تھی شیریں

کسی گھرانے کی پروردہ لاڈلی لڑکی کی رخصتی کا کتنا سچا نقشہ ہے۔ میں نے خود اپنے بچپن میں اپنی والدہ کی بڑے پیار سے پالی ہوئی ایک لڑکی کی (جس کا نام اتفاق سے شیریں ہی ہے) رخصت کے وقت قریب قریب یہی سماں دیکھا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے بجائے یونہی ہمارے گھر کے ایک ایک فرد سے لپٹ لپٹ کر روتی، بچوں سے اپنے دل کا حال بیان کرتی اور خاندان کے بزرگوں سے محبت و عقیدت کا اظہار کرتی تھی۔ آج پینتالیس برس بعد بھی وہ نقشہ میری نظروں میں پھر جاتا ہے۔ شیریں کے رخصتی کے سین میں بھی بالکل اسی شمالی ہند کی تہذیبی معاشرت کا عکس ہے۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اس تہذیبی معاشرت کے پیچھے جو جذبات اور احساسات ہیں وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ اپنے آقا اور سالارِ خاندان سے اسے والہانہ عقیدت ہے ؎

کہتی تھی یہ جانا ہے جہاں سے مرا جانا ‏ ‏ ان قدموں سے چھوٹی تو کہاں میرا ٹھکانا
فرماتے تھے شبیر کہ یہ دھیان نہ لانا ‏ ‏ ہم آئینگے اک ایسا بھی ہووے گا زمانا

کہہ کر نہ کریں اپنا یہ دستور نہیں ہے
نزدیک ہے تو دل سے تو کچھ دور نہیں ہے

شاعر یہ نہیں کہتا کہ شیریں نے آپ کے وعدے پر شبہ کرنے کی گستاخی کی لیکن اس کے چہرے کی ایسی کیفیت ضرور ہوگی جس کی وجہ سے اس کے آقا کو یہ وضاحت کرنا پڑی کہ ہم وہ نہیں جو وعدہ پورا نہیں کرتے اور ساتھ ہی یہ دلداری بھی ؎

"نزدیک ہے تو دل سے تو کچھ دور نہیں ہے"

شیریں اس پر بے حد مسرت کا اظہار کرتی ہے، اور فرمائش کرتی ہے۔

آپ آئیں تو ناموس بھی ہوں آپ کے ہمراہ

ایک کنیز یا خادمہ کے لیے جو کسی بڑے گھرانے میں محبت و عزت سے رکھی جائے اس سے بڑھ کر فخر و مسرت کی کوئی اور بات نہیں ہوتی کہ وہ خود ان کی میزبان بنے، ان کی خاطر تواضع کرے اور اس طرح اس احسان سے سبک دوش ہو جو انھوں نے اس پر کیا ہے اور ساتھ ہی خود اپنی نظروں میں اپنی وقعت بڑھائے۔ یہ واقعات اب سے پچیس تیس سال پہلے تک کی تہذیب میں ہماری آپ کی نظروں سے گذرتے رہتے تھے شیریں کی درخواست سن کر امام حسینؑ کہتے ہیں ؎

فرمایا نہ کر کڑھ پورے سب ارماں ترے ہونگے
ہم ساتھ حرم کو لیے مہماں ترے ہونگے

شاعر کے عقیدے کے مطابق ان پر مستقبل کا حال روشن ہے وہ اپنے نانا سے آنے والے وقت کی خبر سن چکے ہیں اس لیے یہ کہتے کہتے ان پر رقّت طاری ہو جاتی ہے ؎

یہ بات تو فرمائی پہ رونے لگے حضرت ‌ ‌ ‌ آخر مع اسباب کیا شیریں کو رخصت
کچھ لوگ گئے ساتھ کہ پہنچے بہ حفاظت ‌ ‌ ‌ محل میں وہ چڑھ کر گئی باعزت و حرمت

اور یہاں ایک دم شاعر گریز کرتا ہے بامو قع گریز ؎

تھا پاس کنیزوں کا یہ جس شاہِ امم کو ‌ ‌ ‌ ملعونوں نے بے پردہ کیا ان کے حرم کو

اس کے بعد انیسؔ دکھاتے ہیں کہ شیریں آزاد ہونے کے بعد اپنے وطن جاتی ہے اور اس کے حسن و جمال کا چرچا سن کر ایک مالدار یہودی اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے اور شادی کا پیام بھیجتا ہے۔ شیریں اس سے مسلمان ہونے کی شرط رکھتی ہے۔

یہودی مسلمان ہو کر اسے اپنے عقد میں لاتا ہے اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں لیکن اس عیش و آرام میں بھی شیریں کے دل میں اپنے آقا حسینؑ اور اپنی مالکہ شہربانو کی محبت اور یاد باقی رہتی ہے۔ اور وہ اپنے شوہر سے سہیلیوں اور پڑوسیوں سے ان سب کا ذکر کرتی اور ان کے اعلیٰ اخلاق و صفات کے گن گاتی رہتی ہے۔ اس سے ہر دم تعریف و توصیف سنتے سنتے وہ لوگ بھی امام کی زیارت اور اہلِ حرم سے ملاقات کے مشتاق ہو جاتے ہیں ؎

کہتی کبھی ہمسائیوں میں بیٹھ کے باہم | آویں گے مدینے سے یہاں سید الاکرم
خاتونِ قیامت جو ہے مخدومۂ عالم | اب بیٹیوں سے اس کی ملا دینگے تمھیں ہم

احمد کی زیارت شہِ والا کی ملاقات
زینب سے ملاقات ہے زہرا سے ملاقات

انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن سے یہ باتیں ہو رہی ہیں وہ خود مسلمان نہیں ہیں ورنہ یہ وضاحت نہ کرتی کہ "خاتونِ قیامت جو ہے مخدومۂ عالم" پھر بھی وہ شیریں کی آقا زادیوں" سے ملنے کی مشتاق ہیں۔ شیریں سے امام حسینؑ نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ کب آئیں گے یہ وہ نہیں جانتی۔ کیا خبر آج ہی آجائیں۔ ہمیشہ اسے یہ خیال رہتا ہے اور وہ اس کے لیے تیاری کرتی رہتی ہے۔ ایسا نہ ہو بے خبری میں اس کے آقا و مولیٰ آئیں اور وہ دل بھر کر خاطر و مدارات نہ کر سکے ؎

رہتا تھا یہی اس کو تردد سحر و شام | اندوختہ کرتی تھی ضیافت کا سرانجام
جو میوے تھے مرغوب امام ذوالاکرام | ان میووں کو منگواتی تھی دیدے کے وہ انعام

شوہر کوئی تحفہ جو اسے دیتا تھا لاکر
حضرت کے لیے رکھتی تھی کشتی میں لگا کر

یہ ایک دلکش نسوانی کمزوری ہے جس کو انیسؔ خوب سمجھتے ہیں۔

برسوں بیت جاتے ہیں اور امام حسینؑ تشریف نہیں لاتے مگر شیریں کی آس نہیں ٹوٹتی کہ جانتی ہے کہ وہ قول کے سچے وعدے کے پورے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ اس کے آقا ایک نہ ایک دن آئیں گے اور سارے خاندان کے ساتھ آئیں گے۔ اس لمبی مدت میں کیا کیا انقلابات ہو چکے، دور دیس کی رہنے اور گھر میں بیٹھنے والی شیریں اس سے یکسر بے خبر ہے۔ مدینے سے بہت دور دمشق کے کسی اندرونی حصے میں اس کے شوہر کی جاگیر ہے۔ جہاں دور کی خبریں نہیں پہنچتیں اس لیے اس کا شوہر بھی نہیں جانتا کہ مدینے اور کربلا میں کیا ہوا۔ شیریں یہاں حسینؑ کی آمد کی آس میں ہے اور وہاں ان سے مدینہ چھوٹا، کربلا کے بن میں آئے اور سارے خاندان کے مردوں سمیت شہید کر دیئے گئے۔ ہاں شیریں نے ان کے جن بیٹے سید سجاد کو پالا تھا وہ بیماری کے باعث جہاد میں شریک نہ ہو سکے تھے اس لیے زندہ بچ گئے۔ اور ان کو مع اہلِ حرم کے قید کر کے کربلا سے دمشق لے جایا جا رہا ہے۔ شیریں بے خبر ہے کہ حسینؑ کے لاڈلے اس کی گود کے پالے سید سجاد کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں، گلے میں خار دار طوق ہے۔ ہاتھ میں ماں بہنوں کے اونٹوں کی مہار ہے۔ اور وہ جلتی جھلستی ریت پر ننگے پاؤں اس کے گھر کی سمت سفر کی کڑی منزلیں طے کر رہے ہیں۔ وہ بد نصیب تو اپنے امام کا انتظار کر رہی ہے، اہتمام کر رہی ہے۔

ادھر رانڈوں کا لٹا قافلہ دشمنوں کے نیزوں اور تلواروں کے سایے میں شیریں کے گھر سے قریب تر آ رہا ہے۔ ہر بی بی کے اونٹ کے قریب اس کے چہیتے کا سر بریدہ نیزے پر ساتھ ساتھ رکھا جاتا ہے۔ سب کے آگے سر سید الشہدا رہے۔ یکایک ایک دوراہہ سامنے آتا ہے ۔

جب طے اسی صورت میں ہوئیں منزلیں دو چار — اک جا پہ دو راہہ ہوا رستے میں نمودار
اک راہ سوئے دشت تھی اک جانبِ کہسار — صحرا کو چلے لے کے سرِ شاہ ستم گار
پہنچا جو دو راہے کے قریں رک گیا نیزہ
جس سمت کو تھا کوہ ادھر جھک گیا نیزہ

دشمن کی فوج پریشان ہے کہ یہ کیا اسرار ہے مگر امامِ وقت سید سجاد سمجھ جاتے ہیں ؎

گھبرا کے یہ کہنے لگے عابد سے ستمگار — رکنے کا سرِ شاہ کے ظاہر کرو اسرار
فرمانے لگے رو کے یہ تب عابدِ بیمار — ہے مخبرِ صادق کا پسر صادق الاقرار[۱]
اعجاز ہوا یہ جو سرِ سبطِ نبی سے
اس راہ میں مہمانی کا وعدہ ہے کسی سے

شیریں سب حالات سے بے خبر ہے۔ مگر سچے محبت کرنے والوں کو چھٹی حس پہلے ہی سے کچھ اس قسم کا احساس دلا دیا کرتی ہے اور وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔ انیسؔ اس کے قائل ہیں۔ چنانچہ شیریں کئی دن سے بے چین و بے قرار ہے۔ خواب میں وہ امام کی شہادت دیکھ لیتی ہے، یہ وعدہ بھی ان کو دہراتے سُن لیتی ہے کہ ہم تیرے گھر آئیں گے۔ اس کی بے قراری اور بدحواسی کو دیکھ کر اور خواب سن کر شوہر تسلی دلاسا دیتا ہے کہ یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں بھلا کس کی مجال ہے کہ نواسۂ رسول کو مار سکے۔ مگر شیریں کی بے قراری بڑھ رہی ہے وہ شوہر سے کہتی ہے ؎

سنتی ہوں میں یعنی مرے آقا سے ہے یزید — ڈر ہے کیا نہ ہو شہ ذی جاد کو شہید
وہ بنو امیہ کی اہل بیت سے بے خبر نہیں ؎
کوئی نہ پنجتن میں رہے یہ مراد ہے — دشمن سوا یزید سے ابن زیاد ہے

[۱] آں حضرت

اسے یہ خبر ملتی ہے کہ اس کے قلعے سے قریب کوئی بڑا لشکر اترا ہے۔ لوگ قیاس کرتے ہیں کہ امام حسینؑ اپنے لشکر کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ محلے پڑوس والے شیریں کی محبت اور انتظار سے آگاہ ہیں اس لیے فوراً یہ خبر اس تک پہنچائی جاتی ہے ؎

اتنے میں آن کر کسی عورت نے یہ کہا　　شیریں خبر نہیں ہے تجھے اس خوشی کی کیا
ہے شورِ آمد آمدِ فرزندِ مصطفیٰؐ

اور پھر مسرت بھرے لہجے میں یہ کہنا ؎

اب داخلہ ہے فاطمہ کے نورِ عین کا　　یاں سے قریب اترا ہے لشکر حسین کا

شیریں کے سارے اندیشے ہوا ہو جاتے ہیں۔ دل جوشِ مسرت سے سرشار ہو جاتا ہے ؎

آنکھوں سے سیل اشک جو بہتی تھی رک گئی
مارے خوشی کے خاک پہ سجدے میں جھک گئی

کس فخر سے شوہر سے کہتی ہے ؎

کیوں کر خوشی نہ ہو کہ یہ روزِ سعید ہے
آئے حسینؑ، آج مرے گھر میں عید ہے

مسرت کا جوش سنبھالے نہیں سنبھل رہا ؎

فرزندِ فاطمہ کی محبت کے میں فدا　　منظور تھا کنیز کا اعلیٰ ہو مرتبہ
یہ گھر کہاں؟ کہاں قدمِ ابنِ مرتضیٰ　　آنکھوں کو آج فرش کروں گر تو ہے بجا
بالوں سے اپنے گھر کی زمیں کو بہاروں گی
شہزادیوں پہ آپ کو صدقے اتاروں گی

گھر سجاتی ہے کھانے پکواتی ہے۔ طرح طرح کے اہتمام کر رہی ہے ایک والہانہ

کیفیت طاری ہے ؎

کرسی کو لا کے جلد کسی جا بچھاتی تھی
تخفوں کو کشتیوں میں کبھی وہ لگاتی تھی
سجدے میں لیٹ کر کبھی سر کو جھکاتی تھی
گھبرا کے صحن سے کبھی ڈیوڑھی پہ جاتی تھی
کہتی تھی میرے گھر میں ابھی سے جو نور ہے
یہ آمدِ امامِ زمن کا ظہور ہے

انقلاباتِ زمانہ کی خبر نہ ہو مگر حسینؑ کے بچوں اور خاندان والوں کا حال معلوم کرتی رہی ہے ؎

دالان ہے یہ شاہ کی خواہر کے واسطے
یہ نرم فرش ہے علی اکبرؑ کے واسطے
جھولے کی جا ہے یہ علی اصغرؑ کے واسطے
یہ گھر ہے شاہِ دیں کے برادر کے واسطے
راحت سے شہ نشین پہ امامِ زمن رہیں
حجرہ یہ اس لیے ہے کہ دولھا دلھن رہیں

تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔ ہمسائیوں سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کی جا رہی ہیں ؎

شمشادِ بوستانِ پیمبر کو دیکھیو
سروِ ریاضِ حضرتِ شبّر کو دیکھیو
کیا نوجواں ہے شہ کے برادر کو دیکھیو
سب ایک سمت تم علی اکبر کو دیکھیو

مگر دن ڈھلتا گیا اور امام حسینؑ اور ان کا قافلہ نہ پہنچا تو شیریں کو پریشانی پیدا ہوئی ؎

جب ڈھل گئی اسے انھیں باتوں میں دوپہر
شوہر سے تب یہ کہنے لگی وہ نکو سیر
اب تک نہ آئے گھر میں شہنشاہِ بحر و بر
اترے کہاں؟ کسی سے مفصل سنی خبر
بستی سے ساتھ لے کے ہر اک اپنے بھائی کو
جا پیشوائے خلق کی تو پیشوائی کو

لہ یہاں میر انیسؔ سے بڑی سخت چوک ہو گئی کہ شیریں جو برسوں پہلے کے واقعات سے ناواقف ہے، میدان کربلا میں ہوئی کبریٰ اور قاسم کی شادی سے کیسے آگاہ ہو گئی۔

ساتھ ہی یہ التجا بھی ہے کہ میری طرف سے عرض کرنا ہے

کہنا حضور راہِ ہدایت کی شمع ہیں
پروانے یاں سحر سے زیارت کو جمع ہیں

عزیزو، شوہرِ شیریں جسے خود امام حسینؑ سے عقیدت ہے بستی کے عمائدین کو ساتھ لے کر شام کے لشکر کے سمت جاتا ہے اور وہاں سے شہادت امام حسینؑ اور بربادیِ اہلِ بیت کی خبر سنکر دیوانہ وار سر پیٹتا ہوا گھر واپس آتا ہے تو ہے

شیریں کھڑی تھی آس لگائے قریب در
دھیان اس کو تھا کہ آتے ہیں سلطانِ بحر و بر
شوہر کو روتے دیکھ کر اس کو نہ کل پڑی
ڈیوڑھی سے پیٹتی ہوئی باہر نکل پڑی
چلّا کے دی صدا کہ ارے کیا غضب ہوا
اس نے کہا کہ سانحہ بی بی غضب ہوا

زینب ہوئی اسیر حسین اس سے چھٹ گئے
یثرب سے آکے راہ میں سجاد لٹ گئے

یزیدی لشکر کو دیکھ کر جو غلط فہمی پھیل گئی تھی کہ امام حسینؑ کا لشکر اترا ہے یوں دور کر دیتا ہے ہے

اترا ہے یاں جو آکے وہ لشکر ہے شام کا
لائے ہیں یاں سر حسین علیہ السّلام کا

سالہا سال کی پالی امیدیں لمحہ بھر میں خاک میں مل گئیں۔ شیریں پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ انتہائی مایوسی، شدتِ غم نے شیریں کا کیا حال کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قادر الکلام شاعر کو بھی اس کی حالت کی صحیح عکاسی کرتے دشواری محسوس ہو رہی ہے ہے

شیریں نے کہا پیٹ کے سر کوٹ کے چھاتی
ہے ہے مرے سیدؑ مرے آقا، مرے والی

لٹوا کے گھر اور تیغ سے کٹوا کے سر آئے
فرمایا تھا آؤں گا سو یوں میرے گھر آئے

یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ کیا ہی سخت حادثہ ہو سننے والے کو سب سے پہلے یہ خیال آتا ہے کہ اس کو اس سے کیا صدمہ یا نقصان پہنچا، ہم اپنے آس پاس دن رات اس کی مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ لوگ زیادہ تر یہ کہتے ہیں کہ مرنے والا ہمیں کتنا عزیز تھا، یا ہم سے کتنا پیار کرتا تھا یا اس کے جانے سے ہم پر کیا مصیبت پڑی۔ شیریں کو بھی پہلا احساس محرومی یہی ہوتا ہے " فرمایا تھا آؤں گا سو یوں میرے گھر آئے "۔

مگر پھر فوراً ہی اپنی خوزادیوں کی مصیبت کا احساس ہوتا ہے۔ سر سے چادر پھینک دیتی ہے، زیور نوچ ڈالتی ہے اور روتی پیٹتی اس حال میں لٹے ہوئے قافلے کے پاس جاتی ہے تو اس وقت سے

ماتم کا اہلِ بیتِ محمدؐ میں جوش تھا
شیریں کو تھا نہ ہوش نہ بانو کو ہوش تھا

انسان سخت صدمہ خاموشی سے سہارنے کا حوصلہ رکھتا ہے لیکن کسی ہمدرد اور محبت کرنے والے کو دیکھ کر اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔

کسی سہاگ لٹی عورت، کسی کوکھ جلی ماں، کسی باپ سے بچھڑی بیٹی کو اجنبیوں میں، غیر لوگوں میں انتہائی صدمہ کی حالت میں خاموشی سے آنسو بہاتے یا چپ چاپ بیٹھے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر جہاں کوئی ہمدرد غم گسار نظر آیا، صبر و قرار ختم ہو جاتا ہے اور نالہ و فریاد کا طوفان سینے سے ابل پڑتا ہے۔

انیس اس انسانی خاص کر نسوانی فطرت سے واقف ہیں اور اس کی مرقع کشی اکثر کرتے ہیں حسینؑ کے اہلِ حرم جن کو اپنے مُردوں پر رونے تک کی اجازت نہ تھی۔ ضبط و برداشت کا غیر معمولی حوصلہ رکھتے تھے۔ مگر جب کسی ہمدرد و غمگسار کو

دیکھ پاتے تھے دل کی تڑپ گریہ و ماتم میں ظاہر ہوتی تھی۔ شیریں کو دیکھ کر اہلِ حرم کا ماتم کرنا اور جوشِ غم میں بانو کا ہوش کھونا بالکل قدرتی بات معلوم ہوتی ہے۔ صدموں نے شہر بانو کی کیا حالت بنا دی تھی کہ خود شیریں انھیں نہیں پہچان سکی ؎

شیریں یہ رو کے کہتی تھی بانو سے بار بار — تبلاؤ تم کدھر مری بی بی ہے میں نثار
شیریں سے رو کے بولی یہ کبریٰ جگر فگار — کیا کہتی ہو یہی تو ہیں بانوئے نامدار
قیدی ہیں کوکھ اجڑ گئی اور مانگ جل گئی
وارث شہید ہو گیا صورت بدل گئی

مصائب انسان کے ذہن کے ساتھ ساتھ جسم پر بھی گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ سخت دکھ یا صدمے نے کسی کو چند گھنٹوں میں بدل ڈالا۔ اہلبیتِ رسول کے مصائب کی انتہا دکھانے کے لیے انیس بتاتے ہیں کہ شہر بانو اور زینب کی صورتیں اتنی بدل گئی تھیں کہ ان کی پرانی جاننے والیاں تک نہ پہچان سکتی تھیں ؎

قدموں پہ گر کے تب وہ پکاری بہ دردِ غم — یہ حال ہو گیا مری بی بی کا ہے ستم
پہچانوں کیا کہ بال ہیں بکھرے کمر ہے خم — ماتھے سے خون بہتا ہے آنکھوں پہ ہے ورم
چھالے ہیں خاک کے رخِ نیکو پہ ہے غضب
نیلے نشاں ہیں چاند سے بازو پہ ہے غضب

کیا مصوری ہے ؛ لگتا ہے شیریں کے ساتھ ہم بھی اپنی آنکھوں سے شہر بانو کی وہ حالت دیکھ رہے ہیں جو یزیدی فوج کے جور و ستم نے کر دی تھی۔ اب شہر بانو کو ضبط کی تاب نہیں رہتی ؎

بانو پکاری کیا کہوں شیریں میں اپنا حال — زہرا کا باغ ہو گیا مقتل میں پائمال
اکبر جوان تھے علی اصغر تھے خرد سال — بے جرم قتل ہو گئے وہ میرے نونہال

دونوں کے سر قریں سرِ شاہ زمن کے ہیں
برچھی کے پھل پہ پھول ہمارے چمن کے ہیں

شاعرانہ انداز کے باوجود کتنا پر اثر، دل گداز اور دل نشین بیان ہے! شیریں نے اپنی بی بی کے ان بچوں کو نہیں دیکھا تھا مگر اس کے لیے تو نام اور تصور ہی جان قربان کرنے کے لیے کافی تھا ؎

شیریں کا تھا یہ حال کہ گرتی تھی وہ مضطر
بانو کے قدم پر کبھی زینب کے قدم پر

پھر اپنے آقا کے سرِ اقدس کی طرف دوڑتی ہے ؎

آقا تری اس خوں بھری صورت کے میں واری
میں مر نہ گئی ہائے بلا لے کے تمھاری

اس وقت سرِ حسینؑ اعجازاً است سے گویا ہوتا ہے ؎

صد شکر کہ ہم تجھ سے ہوئے صادق الاقرار — دعوت ہے ہماری یہی اے مونس و غمخوار
فاقے سے کئی روز سے ہے عترتِ اطہار — اور پیاس سے مرتی ہے سکینہ مری دلدار

سیدانیوں کو چادریں کچھ لا کے اڑھا دے
رانڈوں کی مدد کر کہ خدا تجھ کو جزا دے

شیریں فوجِ دشمن کے سردار عمر دبن سعد کے پاس جا کر اصرار کرتی ہے ؎

گھر تک سرِ سرور مجھے لے جانے دے للہ

اور اسے زر کا لالچ بھی دیتی ہے ؎

لے مجھ سے زر و مال اگر طالبِ زر ہے

اور پھر بے تابی میں یہ بھول جاتی ہے کہ یہ تو حسینؑ کا دشمن ہے۔ قاتل ہے ؎

لونڈی ہوں میں آقا ہے مرا یہ شہِ عالم — پیٹوں گی سر و سینہ بچھا کر صفِ ماتم

شب بھر مرے گھر میں رہیں سیدانیاں باہم پھر صبح کو لے بھیجو سرِ سید الاکرام

اس کا شوہر چھوٹا موٹا رئیس ضرور ہے۔ مگر نہ اس کی کوئی فوجی طاقت ہے نہ کوئی اثر۔ وہ یزیدی فوج سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان میں قوتِ ایمانی کا وہ جوش اور دلولہ بھی نہیں جو نہ اپنی جان کی پرواہ کرتا ہے نہ نقصان کی یعنی وہ ان جاں نثار عورتوں سے جنھوں نے اس راہ میں محض حق کی خاطر جانیں دیں۔ بہرحال کمتر ہے۔ لیکن اس کے دل میں امام حسینؑ اور اہلِ بیت کی محبت اور عقیدت ہے۔

جبر و استبداد کے دور میں کسی کا حکومتِ وقت سے بغاوت کرنے والوں سے ہمدردی کرنا بھی کچھ کم ہمت و جرأت کا کام نہیں ہوتا وہ سرفروش نہیں۔ مگر پھر بھی اس کی ہمدردی انسانیت اور محبت دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ شاید اس لیے کہ اس کی کمزوریاں عام انسانی کمزوریاں ہیں۔ اس کا یہ کہنا ے

پھر صبح کو لے بھیجو سرِ سید الاکرام

اس کا ثبوت ہے۔ بہرحال وہ بہت سا زر و مال دے کر شہیدانِ کربلا کے سر اور حسینؑ کے اہلِ حرم کو اپنے گھر لاتی ہے اور پیاروں کی موت کے مہینوں بعد پہلی مرتبہ بدنصیب ماں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کو دل کھول کر رونے کا موقع ملتا ہے ے

حلقے میں حرم کے سرِ شیریں تو کھلا تھا
غل ہائے حسینا کا تھا اور شورِ بکا تھا

مجلسِ ماتم برپا ہے مگر میزبان کو یہ فکر ہے کہ مہینوں کی نیم فاقہ کش عورتوں اور بچوں کو کسی طرح کچھ کھلا پلا دے۔ دل کہتا ہے شہیدوں کی فاتحہ دے کر ہی ان کو کھانے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ انواع و اقسام کی چیزوں پر سید سجاد سے شہیدانِ کربلا کا فاتحہ دلواتی ہے ے

سجادؑ نے جب فاتحہ سے پائی فراغت تا دیر رہی شہ کے عزاداروں میں رقت

تب بیبیوں سے شیریں نے کی یہ عرض بہ منت فاقہ شکنی کیجے کہ ہو رونے کی طاقت

دیکھیے، التجا کرنے میں اس بات پر زور دیا کہ فاقہ اس لیے توڑ دیجیے کہ رونے کی طاقت آجائے۔ جانتی ہے ان غریبوں کی زندگی میں واحد تسکین اپنے محبوب عزیزوں پر رونا ہی تو ہے ؎

اس کھانے پہ ہے فاتحہ خواں روح نبی کی

یہ حاضری ہے سبط رسول عربی کی

لیکن ان کو اپنے بھوکے پیاسے شہید ہونے والوں کی یاد تڑپا رہی ہے جو تین دن کی بھوک اور پیاس میں آغوش اجل میں جا سوئے۔ اس عمدہ کھانے کا تصور بھی ان کے لیے روح فرسا ہے۔ شیریں کم سن سکینہ کو بہلا پھسلا کر کچھ کھانے پینے پر آمادہ کرنا چاہتی ہے ؎

ناچار ہو اک جام کو شیریں نے اٹھایا پاس آن کے ہونٹوں سے سکینہ کے لگایا

بولی کہ یہ بو واری ہے آنکھوں میں دم آیا منہ پھیر کے شیریں کو سکینہ نے سنایا

پیاسے مرے بابا موئے میں بھی نہ جیوں گی

عباس چچا آئیں گے تب پانی پیوں گی

کبھی کبھی دوسرے مرثیہ گو شاعروں کی طرح مبالغہ یا بے خیالی یا روایت پرستی کی وجہ سے انیسؔ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ اس طویل عرصے میں اس لٹے قافلے میں کسی نے کھانا یا پانی چھوا نہیں تھا۔ شاعر کا مقصد غالباً یہ سب کہنے سے یہ ہے کہ پیٹ بھر کھانا، سیر ہو کر پانی پینا نصیب نہ ہوا تھا۔ بہر حال اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں بعض وقت بڑی اہم ہوتی ہیں۔ اور وقتی طور پر متاثر ہونے والوں کو چھوڑ کر جو لوگ انیسؔ جیسے عظیم شاعر کے کلام کا تنقیدی و تحقیقی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہیں

یہ خامیاں کھٹکتی ہیں۔ لیکن دنیا کا بڑے سے بڑا شاعر، عظیم سے عظیم فن کار بھی ایسا نہیں جس کے یہاں کچھ نہ کچھ خامیاں نہ ہوں۔

بہر صورت انیسؔ کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اپنے عزیزوں کا تین دن کی بھوک پیاس کی حالت میں مارے جانے کا احساس ایسا تھا کہ بڑے تو بڑے بچوں تک کے لیے کھانا پینا کرب ناک تھا۔ کھانا پانی سامنے دیکھتے ہی مظلوم حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی بھوک اور پیاس یاد آجاتی تھی۔ صحیح روایات میں مذکور ہے کہ سید سجّادؑ جو واقعہ کربلا کے چالیس برس بعد تک زندہ رہے۔ عمر بھر جب بھی سامنے کھانا پانی آتا ان کی آنکھوں سے سیلِ اشک جاری ہو جاتے۔

غرض اس گریہ و زاری و ماتم و بین میں صبح ہو جاتی ہے۔ دشمن سرِ سید الشہدا اور اہلِ حرم کو لے کر دمشق کی سمت روانہ ہو جاتے ہیں اور شیریں درد و حسرت کے عالم میں بے بسی سے آنسو بہاتی رہ جاتی ہے۔

ہندہ۔ زوجۂ یزید

ہندہ خاندانِ حسین کی کنیز ہی میں رہ چکی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ کچھ عرصے امام حسینؑ کے عقد میں رہی تھی۔ مگر یہ روایت مستند نہیں سمجھی جاتی۔ مرثیہ گو شعرا ایسی روایتوں کو ایک رومانی سی فضا پیدا کرنے کے لیے اپنا لیتے ہیں۔ بہر حال ہندہ ایک عرصے تک مدینے میں اہلِ بیت کی خدمت میں رہی تھی، اور اسے اہلِ بیتِ رسول سے خاص طور پر امام حسینؑ اور حضرت زینب سے گہری عقیدت و محبت تھی۔ وہ بھی حسن و جمال میں لاثانی سمجھی جاتی تھی اور اس کے

حسن کا شہرہ سن کر ہی یزید نے بڑی کوشش کے بعد اسے اپنے سے عقد پر راضی کیا تھا۔ روایتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہند کا اس پر خاصا اثر تھا۔ اور وہ اس کا بڑا خیال کرتا تھا۔ مگر اس بات سے واقف تھا کہ اسے امام حسینؑ اور اہلِ بیت سے گہری عقیدت ہے۔ اس لیے ان سے اپنی دشمنی کو بیوی سے چھپاتا تھا۔ چنانچہ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنے سے لے کر ان کی شہادت، اور کربلا سے دمشق تک کا مہینوں کا اہلِ بیت کا پا پیادہ مصیبت کا سفر، یہ سب گذر گیا اور ہند ان سب باتوں سے یکسر بے خبر یزید کے محل میں آرام سے رہتی رہی۔ دمشق میں اہلِ بیت کو یزید نے سہواً یا ارادتاً ایک ایسے قید خانے میں بند کیا، جو اس کے محل سے بہت قریب تھا اور اپنے خزانے میں سرِ سید الشہداء کو رکھا۔ ہند ہی کیا ملکِ شام اور شہرِ دمشق میں کتنے ہی ایسے لوگ تھے جو یہ نہیں جانتے تھے کہ حاکمِ وقت نے کس دشمن پر حملہ کیا تھا اور یہ کون باغی ہے جس کا سر اور گھرانے والے دمشق لائے جا رہے ہیں۔ وہ تو حسینؑ کی بہن زینب تھیں جنھوں نے ہر جگہ اور ہر مقام پر کوفے سے دمشق تک لوگوں کو بتایا کہ یہ سر کس عالی مرتبت انسان کا ہے اور کس مقصد کے لیے اس نے جان دی۔ اور ہم اہلِ بیتِ رسول ہیں جنھیں حاکمِ شام نے بندی میں رکھا ہے۔

ہندہ کے کردار میں سبھی مرثیہ گو شعرا نے اس کی اہلِ بیت سے محبت و عقیدت کو نمایاں کر کے دکھایا ہے۔ مگر میر انیسؔ نے جس ہند کی سیرت کشی کی ہے وہ ایک مضبوط شخصیت کی عورت ہے۔ وہ وقت کے سب سے بڑے جابر اور ظالم حاکم کی بیوی ہے۔ اسے دنیا کا ہر عیش و آرام میسّر ہے اور ساتھ ہی وہ اس سنگدل کی محبوبہ بھی ہے۔ لیکن اسلام و بانیٔ اسلام۔ اہلِ بیتِ رسول اور حسین علیہ السلام سے اسے جو محبت اور عقیدت ہے وہ ہر حال میں باقی رہتی ہے۔ وہ حق گوئی و بے باکی سے بھی

کام لیتی ہے۔ شوہر کو لعنت و ملامت بھی کرتی ہے۔ اور آخر کار یزید کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اہلِ حرم کو قید سے رہا کر کے مدینے جانے دے۔

ان واقعات میں کتنی تاریخی حقیقت ہے اور کتنی روایات اور شاعرانہ تخیل کی کار فرمائیاں ہیں، یہ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس عورت کے کردار میں جو مضبوطی و کشش اور حسن ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

واقعۂ کربلا سے پہلے انیسؔ کے کلام میں ہند کا ذکر ہمیں نہیں ملتا۔ ہاں جب اہلِ بیتِ رسول دمشق پہنچتے اور قید خانے میں بند کر دئیے جاتے ہیں۔ اس وقت ہندہ نظر آتی ہے۔

اہلِ بیت جس زندان میں قید ہیں وہ ہند کے محل کے اتنا نزدیک ہے کہ مصیبت زدوں کے رونے اور عبادت کی آوازیں بھی اس میں پہنچتی ہیں۔ ہند کئی دن تک یہ آوازیں سنتی رہتی ہے اور سخت مضطرب و بے قرار ہے۔ یہاں تک کہ کھانا پینا، سونا چھوٹ جاتا ہے۔ ایک دن یزید اس کی حالت دیکھ کر پوچھتا ہے کہ اسے کیا ہوا ہے۔ اسی وقت ان دونوں کے مکالمے کو انیسؔ دیکھیے کس انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

پوچھا یزید نے کہ ہے کچھ بد مزہ مزاج
بولی یہ ہند ہوتا ہے ہاں درد دل میں آج

اور پھر جیسے ایک دم پھٹ پڑتی ہے۔ دل میں کھولتا لاوا ابل پڑتا ہے ؎

ہے ظلم اور ستم کا ترے عہد میں رواج — اپنے جگر کے زخم کا میں کیا کروں علاج

تجھ کو تو عید ہے مجھے صدمے گذرتے ہیں
یہ کون ہیں جو راتوں کو فریاد کرتے ہیں

پھر بہت کچھ ملامت کرتی ہے کہ تو نے ظلم و ستم پر کمر باندھی ہے۔ بے گناہوں کو

عورتوں و بچوں تک کو قتل کرتا ہے۔ پھر ان قیدیوں کا ذکر کرتی ہے جن کے نالہ و فریاد نے اسے بے چین و بے قرار کر رکھا ہے۔ آخر میں سیدھا سوال پوچھتی ہے کہ ان کا کیا جرم ہے، جس کی وجہ سے یہ ظلم ڈھائے جا رہے ہیں ؎

بتلا یہ سب اسیر مسلماں ہیں یا نہیں

پھر طنزیہ انداز میں کہتی ہے ؎

ہیں کیا یہ لوگ منکرِ پیغمبرِ الٰہ ؟

یعنی تو جو خلیفۂ رسول ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے کیا تو نے انھیں اسلام کا منکر، رسول و آل رسول کا دشمن ہونے کے باعث قید کیا ہے ؎

کیا دشمنی کچھ ان کو حسین و حسن سے ہے

یزید کیا جواب دے۔ خاموش بیٹھا ساری ملامتیں سنتا رہتا ہے۔ ہند خود ہی کہتی ہے ؎

کوئی اگر کہے بھی تو میں مانتی ہوں کب ۔۔۔ ابرار و حق پرست ہیں قیدی یہ سب کے سب
میں سن چکی ہوں ان کی صدائے نمازِ شب ۔۔۔ فاقوں میں بھی وہ کرتے ہیں تا صبح شکرِ رب

گرمی سے گو کہ سینوں میں دم ان کے رکتے ہیں
ماؤں کے ساتھ سجدے میں بچے بھی جھکتے ہیں

ایک بیمار و نزار نوجوان کی طاعت و زہد و عبادت کی آوازیں سن سن کر ہی وہ عقیدتمند ہو چکی ہے۔ کہتی ہے ؎

کہتے ہیں صبر و شکر اسے اللہ لیے حوصلہ ۔۔۔ شکوہ نہ طوق کا ہے نہ زنجیر کا گلہ
جاری ہے صبح و شام عبادت کا سلسلہ ۔۔۔ ہر دم رواں ہے چشم سے اشکوں کا قافلہ

سوچتی ہے ایسی عبادت، یہ شکر و صبر، سوا خاندان رسالت کے اور کس سے ممکن ہے تو دھڑکتے دل کے ساتھ کہتی ہے ؎

شاید کوئی عزیزۂ شہِ مشرقین ہے
صوتِ حسنؑ میں حُسنِ صدائے حسینؑ ہے

یزید بدستور خاموش و سرنگوں ہے۔ ہند کی عالمِ بے قراری میں باتیں جاری ہیں ؎

سنتی ہوں ننھے بچے بھی دو چار ہیں اسیر
لڑکی بھی کوئی قید ہے رشکِ مہ منیر
رونے سے اس کے لگتے ہیں میرے جگر پہ تیر
کیا قہر ہے یہ ظلم غریبوں پہ اے امیر

دکھ دے کسی کو یہ نہیں عادت کریم کی
قرآں میں حق نے کی ہے سفارش یتیم کی

یعنی وہ صرف مسلمان ہی نہیں۔ پڑھی لکھی با ایمان عورت ہے اور اس کی صفات و اخلاق ثابت کر رہے ہیں کہ اس کا بچپن و جوانی کن قدسی صفات لوگوں کی خدمت میں گذرا ہے۔ وہ اپنے ظالم و جابر شوہر کو راہِ راست سے ہٹتے دیکھ کر اس کو سمجھانے بجھانے کا کام بھی اپنا فرض سمجھتی ہے۔ نصیحت و ملامت کرتے کرتے غصہ اور بڑھتا ہے۔ وہ غصہ جو حق بات پر آتا ہے۔ وہ غصّہ جو ظالم و جابر سے ڈرتا نہیں ؎

قاروں کا گنج اے ستم ایجاد کیا ہوا؟
نمرود کس طرف گیا شداد کیا ہوا؟
تھا پہلے وہ جو بانیِ بیداد کیا ہوا؟
فرعون بد نہاد سا جلّاد کیا ہوا؟

وہ قبر میں ہیں آج جو کل تھے رواق میں
ڈھونڈو تو راکھ بھی نہیں کسریٰ کے طاق میں

جذباتی دباؤ بھی ڈالا جا رہا ہے ؎

کھانے کو میں نہ ہاتھ لگاؤں گی کیسی بھوک
اٹھتی ہے بار بار کلیجے میں میرے ہوک
یہ بیکسوں پہ ظلم غریبوں سے یہ سلوک
ان کے بغیر مجھ پہ یہ کھانا ہے مثل خوک

پھر غصہ اور ملامت کی جگہ نرمی اختیار کرتی ہے اور نصیحت و ہدایت کی طرف

مائل ہوتی ہے۔ تو کس عظیم المرتبت انسان کا نائب ہونے کا دعویدار ہے ؎

خوش ہو گا حق، دلوں کو یتیموں کے شاد کر کیا رحم تھا کرم کو محمدؐ کے یاد کر

کتنی گہری عقیدت ہے ؎

یکساں تھا خلق آپ کا شاہ و فقیر سے ٹھلاتے تنگ فقیر کو برتر امیر سے
باتیں تھیں پرورش کی یتیم و لسیر سے کرتے تھے سیر انھیں رطب و شہد و شیر سے

سامنے یزید کی دستر خوان پر انواع و اقسام کی نعمتیں رکھی ہیں اور پہلو میں قید خانے میں بھوکے پیاسے قیدی ہیں۔ یہ تصور جیسے اسے کچلے دے رہا ہے اور یہ شعر ملامت کے کوڑوں سے کم نہیں کہ ایسی حالت میں جنابِ رسالت مآب کا کیا شعار تھا، اور تو کیا کر رہا ہے ؎

ہر شب کو قیدیوں کی خبر لینے جاتے تھے
دو دن کے بعد نانِ جویں آپ کھاتے تھے

رسولِ اکرم کے ذکر کے ساتھ ہی علیؑ مرتضیٰ کی سخاوت، عدل، رحم دلی کی یاد ذہن میں تازہ ہوتی ہے اور اشارۃً شوہر کو ملامت کی جا رہی ہے کہ تو خلیفہ ہونے کا دعویدار ہے۔ یہ دیکھ کہ خلیفہ کا منصب اور عمل کیا ہوتا ہے۔ حضرت علیؑ کے بارے میں کہتی ہے ؎

رانڈوں کے وارث اور یتیموں کے تھے پدر قاتل پہ مرتے مرتے رکھی رحم کی نظر
ہر دم حسینؑ پر یہ تفقد تھی اے پسر قیدی کے بھی طعام کی رکھیو ذرا خبر

اور اس بے مثال انسان کا بیٹا حسن علیہ السلام جو امامِ وقت تھا ان کا اخلاق کیا تھا ؎

خلقِ خدا ہے معترفِ خلقِ مجتبیٰ
دریائے فیض، ابرِ کرم، منبعِ سخا

اور یہ کہتے کہتے جب حضرت حسینؑ کا نام گرامی زبان پر آتا ہے تو جیسے روح وجد میں آجاتی ہے اور دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ زبان پر مدح وثنا کے زمزمے جاری ہو جاتے ہیں ؎

دنیا ہو اور حسینؑ ہیں اس نام پر نثار   فیضِ نبی تو عصمتِ خاتونِ روزگار
ہے بات بات میں کرمِ شاہِ ذوالفقار   اور خلق میں نظیرِ حسن ہے وہ ذی وقار

خو ہے پیمبروں کی شہِ مشرقین میں
ہیں کس قدر صفات جمع اک حسینؑ میں

اس کی محبت امام حسینؑ سے اتنی پاک اور بلند ہے کہ اس کے اظہار سے لمحہ بھر کو بھی نہیں جھجکتی ؎

بچپن میں بھی فیضِ صحبتِ مولا سے بہرہ ور   پیدا کیا ہے حق نے عجب طرح کا بشر
اس سالکِ طریقِ ہدایت کے ہیں فدا   یثرب سے حج کو آتے ہیں اکثر پیادہ پا

اس سال بھی سنا ہے کہ تشریف لائے ہیں
کعبے میں اہلِ بیت بھی ہمراہ آئے ہیں

بعد کے حالات سے وہ یکسر بے خبر ہے۔ اور یہی بات اس کے دل میں اندیشے پیدا کر رہی ہے ؎

کیا جانیں حج کے بعد سدھارے ہیں وہ کدھر
لونڈی نے پھر سنی نہیں آقا کی کچھ خبر

ذہن میں مہینوں سے جو وسوسہ جو خوف پل رہا تھا جس کو زبان سے نکالنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی وہ اس وقت عالمِ بے قراری میں منہ سے نکل جاتا ہے ؎

رہتی ہوں اس خیال میں پہروں میں نوحہ گر   کعبے میں گھر گئے ہوں نہ سلطانِ بحر و بر
ہے دھوم کچھ دنوں سے جدال و قتال کی   یارب تو خیر کیجیو، زہرا کے لال کی

جنگ و جدل کی اڑتی اڑاتی خبریں تو کان میں پڑ ہی گئی ہیں۔ یہ بھی جانتی ہے کہ یزید کو اہلِ بیتِ رسول اور خاص کر حسین علیہ السلام سے بغض و دشمنی ہے۔ اب تک یہ بات کہنے کا حوصلہ نہ ہوا تھا، مگر اب کہہ گذرتی ہے ؎

اس خانداں میں کون رہا ہے سوائے شاہ — قائم رکھے جہان میں شہ کو مرا اللہ
آگاہ ہوں کہ شاہ سے کینہ ہے تجھ کو آہ — ہے ہے کیا نہ ہو کہیں زہرا کا گھر تباہ

اور پھر عالمِ بے قراری میں جیسے اک ہر چیخ سی نکل جاتی ہے ؎

بے تاب ہوں خیالِ شہِ نیک نام میں
شہزادیاں اسیر نہ ہوں فوجِ شام میں

یزید کہے تو کیا کہے۔ بیوی سے محبت بھی کرتا ہے۔ شاید کچھ ڈرتا بھی ہے کہ جب حقیقت اس پر کھلے گی تو وہ نہ جانے کیا قیامت برپا کرے۔ اس لیے خاموش رہنا ہی مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ ہند کو اس کی خاموشی اور زیادہ پریشان کرتی ہے۔ وہ لاکھ نڈر، حق گو عورت سہی ہے تو اس ظالم و جابر کی بیوی۔ اس کی اجازت کے بغیر اسیروں سے جاکر کیسے ملے؟ اس کو بے حس اور خاموش دیکھ کر رو پڑتی ہے، اور کہتی ہے ؎

گر کہہ تو دیکھ آؤں انھیں جاکے اک نظر — شاید انھیں سے شہ کی مفصل سنوں خبر
ہیں غیر یا عزیزِ شہِ انس و جاں کے ہیں — دریافت تو کروں کہ یہ قیدی کہاں کے ہیں

ذرا دیر کو ایک وسوسہ دل میں پیدا ضرور ہوا تھا۔ پھر بھی جی یہ یقین کرنے کو نہیں چاہتا کہ اس کا شوہر ایسا عظیم گناہ بھی کر سکتا ہے کہ قبلۂ دین امام وقت کو ختم کر دے۔

یزید سمجھ جاتا ہے کہ اب یہ راز بیوی سے چھپانا ممکن نہیں۔ اچھا ہے اسے بھی پتہ چل جائے کہ یزید کیا کچھ کر سکتا ہے؟ اسے اب کس کا ڈر ہے۔ ہند اس کا

کر ہی کیا سکتی ہے۔ اس نے تو حسینؑ جیسے عظیم المرتبت انسان کو مار ڈالا، بڑی بے پروائی سے کہتا ہے ؎

جا دیکھ آ انھیں مرا نقصان ہے اس میں کیا
واں جا کے اور ہووے گا تجھ کو قلق سوا

گویا اشارۃً کہہ دیتا ہے کہ تیرے اندیشے وہاں جا کر یقین سے بدل جائیں گے۔

آدھی رات ہی کو ہند قید خانے میں جانے کو تیار ہو جاتی ہے۔ خوشامدی خادماؤں کی جیسی عادت ہوتی ہے۔ ہند کی کنیزیں اس سے اصرار کرتی ہیں کہ کپڑے بدل لیجیے، زیور پہن لیجیے، یہ سن کر ہند بگڑ جاتی ہے ؎

اک دم میں سوگواروں کو میں دیکھ آتی ہوں
کیا لباس کیا کسی شادی میں جاتی ہوں؟

رانڈوں کی حالت کا تصور کرتی ہے ؎

کپڑے بدل کے رانڈوں میں جانا نہیں روا
ان میں چلی ہوں جن کے سروں پر نہیں ردا

یہ شعر اس کی درد مند اور حساس طبیعت کا گواہ ہے۔

ہند کے زنداں میں آنے کی خبر پہنچتی ہے، تو اہلِ بیت رسول کو سخت پریشانی ہوتی ہے۔ ہند اپنی کنیزوں کے ہمراہ درِ زندان پر آتی ہے تو دربان و پہرہ دار زنِ حاکم کے احترام میں سر جھکا کر وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ ہند آگے بڑھتی ہے مگر ؎

وحشت پہ قید خانے کی جس دم نگاہ کی
ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کے کنیزوں نے آہ کی

اور ہند تھرتھرا کر کہتی ہے ؎

ایسا بھی ظلم کرتا ہے کوئی جہان میں
بندے خدا کے بند ہیں ایسے مکان میں

قدرتی طور پر اس کا ضمیر نیش زنی کرتا ہے کہ تیرے شوہر نے یہ سب ظلم کیے ہیں۔ کنیزیں ہند سے کہتی ہیں کہ بی بی ؎

ہم سے تو اس خرابے میں جایا نہ جائے گا

تو ہند بگڑ کر جواب دیتی ہے ؎

عبرت کا یہ مقام ہے لونڈی خدا سے ڈر
آخر جو اس میں قید ہیں وہ بھی تو ہیں بشر

پھر دردناک لہجے میں کہہ اٹھتی ہے ؎

جانے وہی کلیجے پہ جس کے چھری چلے
ایسی نہ بات کہہ کہ خدا کو بری لگے

وہ عام انسانوں کے غم میں بے چین ہے اور نہیں جانتی کہ اس قید خانے میں اس کی آقا زادیاں مصائب جھیل رہی ہیں۔ درِ زنداں کے قریب اسے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں بندھے بھاری طوق پہنے امام چہارم سید سجاد نیم بیہوشی کی حالت میں پڑے نظر آتے ہیں۔ کنیزیں اس نوجوان کے ملکوتی حسن اور اس کی حیا و شرافت دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں اور آپس میں اس کی تعریف و توصیف کر رہی ہیں مگر ہند کا دل خوف سے کانپ رہا ہے۔ اس مقدس چہرے کی زیارت کر رہی ہے اور خود سے کہہ رہی ہے ؎

آنکھوں میں صاف پھرتی ہے صورت امام کی
تصویر ہے حسین علیہ السلام کی

"تصویر ہے" کہ اس نے حسینؑ کو قریب سے دیکھا ہے جانتی ہے کہ یہ حسینؑ خود نہیں

لیکن مشابہت اتنی زیادہ ہے کہ ان کی شبیہہ ہے بالکل۔ اسے طاقتِ ضبط نہیں رہتی ہے

آخر دبا کے پاؤں یہ بولی وہ نیک نام　　اٹھیے کہ دیر سے میں کھڑی ہوں پئے سلام
بولے یہ آنکھ کھول کے سوائے خاص و عام　　اس بیکس و یتیم بلاکش سے کیا ہے کام

ہجر پدر میں تلخ ہے لذت حیات کی
طاقت نہ آنکھ کھولنے کی ہے نہ بات کی

سید سجاد اور ہندہ کا جو مکالمہ اس کے بعد انیس لکھتے ہیں اس میں ان کا شاعرانہ کمال اور حسن بیان کے ساتھ ساتھ موقع محل کی نزاکت کا احساس بھی صاف نمایاں ہے۔ ایک عورت جوان کے وقار، شان، باطنی نور سے متاثر اور مرعوب ہے۔ سوال پر سوال کر رہی ہے اور امام چہارم برمحل اور بے ساختہ جواب دے رہے ہیں۔ سوال عورت کے دل کا آئینہ ہیں تو جواب ثابت کر رہے ہیں کہ وہ کسی عظیم الشان سے مخاطب ہے۔ چند سوال و جواب ہم یہاں درج کریں گے ۔

بولی یہ ہندہ کب سے علالت ہے میں نثار
فرمایا ساتویں سے محرم کی ہے بخار
اس نے کہا طبیب کو دکھلاؤ حالِ زار
فرمایا خیر شافعِ مطلق ہے کردگار

ہر حال میں نہ صرف راضی برضا رہنا بلکہ شاکر و احسان مند رہنا ان خاصان خدا کا حصہ ہے جو کبھی پیمبر کہلاتے ہیں، کبھی ولی، کبھی امام، کبھی ہادی، کبھی رہبر و رہنما۔ سید سجاد کی سیرت اور اخلاق کی مرقع کشی کر کے انیس ایک ایسی ہی کامل شخصیت کو سامنے لاتے ہیں۔ ہندہ ان کے دکھ، بیماری اور صدموں پر اظہارِ رنج و غم کرتی ہے ،

مگر امام وقت ان دکھ اور صدمات کو کس روشنی میں دیکھتے ہیں ؎

رنج و بلا کو لطفِ خدا جانتے ہیں ہم
دکھ میں کراہنے کو گلہ جانتے ہیں ہم
ایذا کو چین، رنج کو راحت سمجھتے ہیں
مرنے کو راہِ حق میں سعادت سمجھتے ہیں
عسرت ہو، دکھ ہو، قید ہو، فاقہ کشی رہے
دولت یہی بڑی ہے کہ خالق خوشی رہے

ہند یہ سیرت، یہ اخلاق یہ صبر دیکھتی ہے تو اسکی حالت اور زیادہ غیر ہوتی جاتی ہے وہ روتے روتے پوچھتی ہے، حضور کا اسم مبارک کیا ہے، تو فرماتے ہیں ؎

بے کس، عزیز، مردہ گرفتار و بے نوا
کیا پوچھتی ہے نام و نشاں خاکسار کا
اک بندۂ حقیر ہوں پروردگار کا

یہ فصیح و بلیغ کلام یہ عجز و انکسار یہ شان و وقار صبر و شکر کی یہ بے مثل کیفیت سوا خاندانِ نبوت کے اور کہاں پائی جا سکتی ہے؟ یہ سوچ کر ہند کی پریشانی اور ساتھ ہی شبہ بڑھتا جاتا ہے۔ وہ ان سے والد کا نام پوچھتی ہے کہ اس سے تو پتہ چل ہی جائے گا مگر سید سجاد کا جواب حقیقت سے پردہ نہیں اٹھاتا، مگر ایک ایک لفظ صداقت کا حامل ہے ؎

اس نے کہا بتایئے والد کا اپنے نام
فرمایا فاقہ کش، وطن آوارہ تشنہ کام
مقتول نیزہ و تبر و خنجر و حسام
جس کو ملا نہ پیاس میں پانی کا ایک جام
بے گور و بے کفن جسدِ پاش پاش ہے
سر یاں ہے کربلائے معلیٰ میں لاش ہے

اب ہند وطن دریافت کرتی ہے کہ اس سے تو حقیقت حال ضرور ہی روشن ہو جائے گی مگر آپ کا جواب سنیے ؎

پوچھا وطن جو اس نے تو بولے شہِ زمن
دارِ فنا، مقامِ فنا، منزلِ محن
بیٹھے فقیر تھک کے جہاں ہے وہی وطن
بے خانماں اسیر و پریشان و خستہ تن

پردیس میں تباہ ہوئے شہر چھٹ گیا
جنگل میں ہم بھی لٹ گئے اور گھر بھی لٹ گیا

ہندہ ان کا پتہ و نشان معلوم کرنے سے نا اُمید ہو جاتی ہے۔ مگر اس عظیم شخصیت سے اتنی زیادہ متاثر ہے اور ان کے دکھ سے اتنی دکھی کہ بے اختیار پوچھتی ہے ؎

اس نے کہا کہ طوق سے ہوئے گا دم خفا
فرمایا جس میں خالقِ کونین کی رضا

ہند نہیں جانتی کہ اس کے سوالات ان کے زخموں کو کس طرح کرید رہے ہیں عورتوں کی تجسس اور سوالات کرنے کی عام عادت کے مطابق وہ سوال پر سوال کیے جا رہی ہے ؎

وہ بولی اور بھائی بھی تھے کیا مہِ منیر   فرمایا، ہاں جوان تھا اک اور اک صغیر

اور پھر جیسے صابر کے دل سے ایک دردناک آہ کے ساتھ نکلتا ہے ؎

اعدا کو دشمنی تھی صغیر و کبیر سے   برچھی سے ایک قتل ہوا ایک تیر سے

"صغیر و کبیر" یعنی اکبر و اصغر نام لیتے بھی ہیں۔ مگر راز فاش نہیں ہوتا اور یہ کہتے کہتے شدّتِ غم اور ضبط کی انتہائی کوشش میں بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ ہند پریشان و گریاں دروازے سے آگے بڑھتی ہے، تو اسے خاک نشین، برہنہ سر زخمی بازو، سوگوار عورتیں ادھر ادھر سر جھکائے بیٹھی نظر آتی ہیں۔ کسی کی گود میں بچہ ہے، کسی کے پہلو میں بچی ہے جن کے چہروں پر بھوک، مصیبت، یتیمی اور ظلم و ستم کے نشان ہیں۔ خواتین کے چہروں پر اس حالت میں بھی نجابت و شرافت کا وہ نور ہے کہ ہند بے اختیار پکار اٹھتی ہے ؎

چہرے سبھوں کے غیرتِ خورشید و ماہ ہیں
گویا کہ اہلِ بیتِ رسالت پناہ ہیں

باری باری بیویوں سے مخاطب ہو کر حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کررہی ہے۔ یوں سمجھیے کہ دماغ تو مان چکا ہے مگر دل اب بھی ماننے پر تیار نہیں، کہتی ہے ؎

سنتی ہوں میں مدینے میں ہے آپ کا وطن
للّٰلہ کچھ کہو خبرِ سرورِ زمن
ہیں خیریت سے حضرتِ شبّیر کی بہن
زندہ رکھے جہاں میں انھیں ربِّ ذوالمنن

وہ بی بی روحِ بنتِ رسالت پناہ ہے
عصمت پہ جس کی خالقِ اکبر گواہ ہے

لیکن زینب پہلے ہی سب کو منع کر چکی ہیں کہ کوئی ہند کو ان کا یا اپنا نام نہ بتائے۔ سب کو خاموش پاکر ہند شہر بانو سے مخاطب ہوتی ہے ؎

صدقے گئی بتائیے کیا آپ کا ہے نام
للّٰلہ کچھ کہو میں ہوئی جاتی ہوں تمام

لیکن شہر بانو صرف زینب کی طرف اشارہ کر دیتی ہیں کہ خاندان کی سردار میں نہیں یہ بی بی ہیں۔ اب جو ہند دوبارہ غور سے زینب کو دیکھتی ہے تو اپنی مخدومۂ آقازادی کو پہچان لیتی ہے ؎

ہرگز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے
زینب تمھیں ہو خالقِ اکبر گواہ ہے

زینب کو اپنے خاندان کی پروردہ کے سامنے جو آج حاکم وقت کی بیوی ہے اس حالت میں اپنے کو ظاہر کرتے شرم محسوس ہوتی ہے وہ مجاہدہ جو کربلا سے شام تک کے سفر میں بار بار ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرتی رہی کہ میں رسول کی نواسی ہوں، یہ سر نواسۂ رسول کا ہے۔ ہم اہل بیت رسول ہیں۔ اس وقت اپنے کو چھپانے کی انتہائی کوشش کرتی ہیں۔ ان کی قدسی اور ملکوتی سیرت میں یہ کوشش

ناکام انسانی و نسوانی کمزوری کا ایک عجیب دلکش رنگ بھر دیتی ہے۔ کبھی وہ یہ کہتی سنائی دیتی ہیں ؎

نسبت نہ ان سے دے کہ وہ ہے فاطمہ وقار

اور بار بار کہتی ہیں ؎

زینب میں ہی ہوں یہ ترا بے جا خیال ہے

ہند صورت پہچاننے میں غلطی کر سکتی تھی کہ انتہائی مصائب نے صورت بدل دی تھی۔ مگر لب و لہجہ، اس کو یہ جاں گداز حقیقت بتا دیتا ہے۔ کہ یہ کون ہے تو وہ بلک بلک کر کہتی ہے ؎

اے میری شاہزادی چھپاؤ نہ مجھ سے حال زینب تمھیں ہو خواہرِ شبیرِ باکمال
تم کو قسم ہے فرقِ شہِ مشرقین کی
جلدی کہو خبر مرے آقا حسین کی

تو زینب کے صبر و ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ بھائی کی فدائی اور اپنی غمگسار کو سامنے دیکھ کر بے اختیار بھائی کی مصیبت سنانے لگتی ہیں ؎

اے ہند کیا کہوں خبرِ شاہِ تشنہ لب ہنگامِ عصر کٹ گیا زہرا کا باغ سب
مطلق ڈرا نہ خالقِ اکبر سے بے ادب چوبِ یزید اور لبِ شبیر ہے غضب
رونے نہ پائے ماتمِ شاہِ شہید میں
سر ننگے لے گئے ہمیں بزمِ یزید میں

اے ہند رن میں شاہ کے یاور ہوئے شہید عباس قتل ہو گئے اصغر ہوئے شہید
بن بیاہے دشت میں علی اکبر ہوئے شہید شبر کا لال اور مرے دلبر ہوئے شہید
مرجھا گئے فاطمہ کی نہ کھیتی ہری ہوئی
بچوں سے گود ہو گئی خالی بھری ہوئی

ہند سر سے چادر پھینک دیتی ہے اور بین کرنے لگتی ہے ؎

تاراج محمد کا بھرا گھر ہوا ہے ہے لخت جگرِ فاطمہ بے سر ہوا ہے ہے

عالمِ بے قراری میں یہ بھول جاتی ہے کہ یہ سب ظلم و ستم اس کے ظالم شوہر نے کیا ہے ؎

ہاتھوں کو اٹھا کر سوئے مقتل یہ پکاری یا شاہ میں قربان غریبی پہ تمھاری

بسمل تہِ شمشیر دو دم ہو گئے آقا

پردیس میں تم پر یہ ستم ہو گئے آقا

اے شاہ غریباں ترے بچوں کے میں قربان جنگل میں وطن چھوڑ کے سب ہو گئے بیجاں

زنداں میں گرفتار ہوئی زینب ذیشاں بطحا ہوا برباد مدینہ ہوا ویراں

اے تشنہ لب و صابر و شاکر ترے صدقے

اے قبرِ پیمبر کے مجاور ترے صدقے

پھر اپنی بے بسی اور بدنصیبی کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ یہ سب قیامت گذر گئی اور وہ بے خبر رہی۔ مگر اب کیا کرے۔ کس طرح ان کی مصیبت میں کمی کرے ؎

پھر کہنے لگی قدموں سے زینب کے لپٹ کر صدقے گئی لونڈی یہ ستم ہو گئے تم پر

کن آنکھوں سے دیکھوں یہ اسیری یہ کھلا سر صدقے گئی لونڈی ہوں میں اوڑھے ہوئے چادر

آج وہ سب زیور و مال و دولت اسے حقیر اور قابلِ نفرت معلوم ہوتا ہے جس پر کل تک ناز تھا ؎

صندوق مرے گھر میں بھرے زیور و زر سے درکار ہو جو کچھ وہ منگا لو مرے گھر سے

یہ درخواست ثابت کر دیتی ہے کہ وہ ایک عام عورت ہے جسے خاندانِ نبوت سے عقیدت و محبت ہے مگر ذہن کی اڑان بس اتنی ہی ہے کہ جو کچھ ضرورت ہو میرے

یہاں سے منگالو۔ یہ جملہ جواس نے بڑے خلوص سے، اپنی عقل کے مطابق بیویوں کی مصیبت میں کمی کرنے کو کہا ہے۔ نہیں جانتی کہ اس کی مخدومہ کے دل پر کتنا گہرا گھاؤ ڈال گیا ہوگا۔ مگر زینب کا جواب ان کے کردار کے شایانِ شان ہے۔ وہ اسے ملامت نہیں کرتیں کہ تواپنی آقازادیوں سے یہ کیا کہہ رہی ہے۔ یہ بھی نہیں کہتیں کہ تو یزید جیسے ظالم قاتل کی بیوی ہے ہم کیوں تیرا احسان لیں! بلکہ نہیں ے

زینب نے کہا تجھ کو مبارک کرے اللہ
زیور سے کہیں سوگ نشین ہوتے ہیں آگاہ
سر پر ابھی کس طرح سے اوڑھوں میں ردا آہ
محتاجِ کفن رن میں ہے لاشِ شہ ذیجاہ

اب چہروں کا پردہ یہ کھلے مو ہیں ہمارے
رسی کے نشاں جوشنِ بازو ہیں ہمارے

شیریں نے جو چادریں عقیدت کے ساتھ نذر کی تھیں وہ قبول کرلی تھیں اگرچہ ذرا دیر بعد نیزوں کی نوکوں سے انھیں بھی دشمنوں نے اتار لیا تھا۔ مگر ہند سے چادر لینے کو غیرت گوارا نہیں کرتی۔ مگر عذر کرنے کے انداز میں ملامت کا شائبہ بھی تو نہیں ے

ہم بے سروسامانوں کو کیا چاہیے ساماں
ملبوس سیاہ، بال کھلے، چاک گریباں

لیکن کچھ نہ کہہ کر صرف اپنی موجودہ حالت کی طرف اشارہ کرکے وہ سب کچھ کہہ جاتی ہیں، جو کہا جا سکتا تھا۔ علیؑ کی بیٹی کسی کا احسان کیوں اٹھائے۔ ہاں ایک فرمائش کرتی ہے۔ اس چیز کی جو اس کی ہے۔ اور اسی کو ملنا چاہیے ے

درکار نہیں کچھ مجھے اسباب مگر ہاں
سر شہ کا منگادے تو بڑا تیرا ہو احسان

مدت سے جو دیکھا نہیں دل غم سے بھرا ہے
سنتی ہوں کہ حاکم کے خزانے میں دھرا ہے

ہند فوراً تعمیلِ ارشاد کرتی ہے۔ مگر شاعر اس بات کو بھی بتا دیتا ہے کہ ہند کا کچھ ایسا زیادہ حکم نہ چلتا تھا کہ صرف اس کے کہنے سے سرِ امام خزانے سے لا دیا جاتا ؎

یہ ہند نے سنتے ہی منگایا سرِ شبیر — حاکم سے کوئی پوچھ کے لایا سرِ شبیر

سر آتا ہے تو ؎

ڈیوڑھی پہ گئی ہند سراسیمہ و مضطر — اور نوچ کے سب پھینک دیا خاک پہ زیور

ڈیوڑھی سے پھری لے کے جو شہ کا سرِ انور — زنداں کی زمیں ہو گئی پرتو سے منوّر

اور سرِ اقدس حسینؑ کو دیکھ کر ؎

تھراتے ہوئے خاک سے تعظیم کو اٹھے — قیدی سرِ شبیر کی تسلیم کو اٹھے

شاعر بتاتا ہے کہ اس کے بعد ہند اہلِ حرم کو قید سے چھڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک اور مرثیے میں انیس نے بالکل دوسری روایت نظم کی ہے کہ یزید خواب میں جنابِ رسالتمآب کو دیکھتا ہے (اور ہند بھی یہی خواب دیکھتی ہے) کہ آپ گریاں و محزون اور سر ننگے سرِ حسینؑ کے پاس آتے ہیں۔ اس وقت یزید خوف و ندامت سے بے حال ہو جاتا ہے۔ تب ہند موقع دیکھ کر اسے لعنت ملامت کرتی ہے ؎

یہ خواب ابھی دیکھ کے اٹھی ہوں میں مضطر — گھر میں مرے سر پیٹتے آئے ہیں پیمبر

مخدومۂ عالم کا سرِ پاک کھلا ہے

اور احمدِ مرسل کا گریبان پھٹا ہے

آگاہ نہ تھا فاطمہ کے رتبہ سے تو کیا — کچھ زینب و کلثوم کے رتبے کو نہ سمجھا

تو نے جو انھیں قید کیا بھوکا پیاسا — واللہ ہوئی فاطمہ کی روح کو ایذا

ماتم ہے اسی کا تو رسولِ عربی کو

زینب کی اسیری سے نہیں چین کسی کو

یزید اہلِ حرم کی رہائی کا حکم جاری کر دیتا ہے۔ مگر اس کی سفاکی یہاں بھی نظر آتی ہے

کہ اس وقت بھی سر سید الشہدا واپس نہیں دیتا۔

ہند کے کردار میں انیسؔ نے کسی مثالی عورت کا جلوہ نہیں دکھایا۔ وہ ایک عام عورت ہے جس میں کمزوریاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ وہ مصائبِ حسینؑ پر گریہ وزاری کرتی ہے۔ اہلِ حرم کے ساتھ ماتم بھی کرتی ہے۔ مگر اس کے دل میں عقیدت و محبت کا وہ گہرا جذبہ نہیں جو جان کی بھی پروا نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے سفاک شوہر کا ساتھ چھوڑتی بھی نظر نہیں آتی۔ مگر اس کے باوجود وہ نڈر، حق گو، اور انسان دوست مسلمان عورت ضرور ہے جو اپنی توفیق بھر خاندانِ رسالت کی ہمدردی و مدد کرتی ہے۔ اور اس کی یہی خوبیاں اور کمزوریاں اس کو ایک جیتا جاگتا کردار بنا دیتی ہیں۔

———— : : ————

عام عورتیں

کہا جا سکتا ہے کہ فضہ، شیریں اور ہندہ وہ عورتیں تھیں جنھوں نے ساری زندگی کا ایک بڑا حصہ اہلِ بیت رسول کی خدمت میں گذارا تھا اور ان سے ایمان، اخلاق اور حق پرستی و حق پسندی کا درس لیا تھا۔ لیکن تاریخ کربلا میں ہمیں ایسی عام عورتیں بھی ملتی ہیں جن کا براہ راست خاندانِ رسالت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انھوں نے ان محترم ہستیوں کو دیکھا تک نہ تھا، مگر اسلام کی محبت ان کے دل میں تھی اور وہ بانیِ اسلام اور ان کے خاندان کی فدائی اور جاں نثار تھیں۔

ان عورتوں نے امام حسینؑ کی شہادت کی خبر سن کر صرف گریہ و ماتم ہی نہیں کیا بلکہ اپنے ظالم و جابر یا پھر بے حس مردوں سے احتجاج بھی کیا، یہاں تک کہ وہ ان سے بغاوت پر تل گئیں۔ اور بعض نے جانیں تک قربان کر دیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حق و ایمان کی راہ میں یہ ہندہ اور شیریں سے بازی لے گئیں کہ انھوں نے حسینؑ پر صرف گریہ و ماتم اور اہل بیت سے ہمدردی کر کے وفا و محبت کا حق ادا کیا تھا، مگر یہ عام جاہل اور تند و عورتیں عشق و وفا کی اس بلند منزل پر پہنچ گئیں

جہاں کوئی مجاہد اور شہید ہی پہنچ سکتا ہے۔

واقعۂ کربلا کے ان عام کرداروں کی عظمت کو انیسؔ نے پوری طرح پہچانا اور ان کی سیرت اور کارناموں کو بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ اپنے مرثیوں میں پیش کر کے ان گمنام یا کم مشہور شخصیتوں کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ ان عورتوں کی قربانی، ایمانی قوت اور جذبۂ سرفروشی ہمیں زبانِ حال سے یہ سناتے ہیں کہ مرد کتنے ہی جفا پیشہ و جنگ جو ہوں، مگر عورتیں، ان مردوں کے گھرانے کی عورتیں بھی، امن پسند، حق پرست اور انصاف و ایمان کی حامل ہوتی ہیں جو تلوار کی دھار اور نیزے کی نوک پر بھی سچ کہتی اور حق کا ساتھ دیتی ہیں۔

ان میں ہمیں بنی اسد کی عورتیں، کوفی عورتیں، شامی عورتیں، عام عورت کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہیں اور حارث کی بیوی، خولی کی بیویاں حق پرست، مجاہد عورتوں کی انفرادی تصویریں پیش کرتی ہیں۔

روایت ہے کہ کربلا کے میدان میں خیمے نصب کرنے کے بعد امام حسینؑ نے اس اطراف کے کسانوں کو بلا کر جو بنی اسد کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے آس پاس کی زمین خرید لی تھی کہ شہیدوں کا مدفن کسی غیر کی زمین میں نہ ہو۔ پھر واقعۂ کربلا ظہور پذیر ہوا اور یہ سیدھے سادے گنوار بدو سب کچھ دیکھتے رہے۔ دہشت اور خوف اتنا غالب تھا کہ امام وقت کی حمایت میں ایک لفظ منہ سے نہ نکلا۔ ایک ہاتھ حمایت کو آگے نہ بڑھا۔ ایک انسان نے بھی جان کی بازی نہ لگائی۔ البتہ ضمیر کی خلش نے دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ شہادتِ حسینؑ کے بعد انھوں نے یہ روح فرسا منظر بھی دیکھا کہ اہلِ بیت رسول کو قید کر کے دشمن لے گئے اور شہیدوں کے لاشے بے گور و کفن صحرائے کربلا میں پڑے رہے۔ میر انیسؔ کے مشہور مرثیے "جب طوق و سلاسل میں مسلسل ہوئے عابد" میں ان کا تذکرہ

ملتا ہے۔ ہم اس مرثیے کے کچھ شعر اور بند کہیں کہیں سے پیش کریں گے۔

جب اہلِ حرم قید ہو کر شام کی سمت روانہ ہو گئے تو ؎

بے گور و کفن رہ گئی لاشِ شہِ ابرار

جز بے کسی و یاس نہ دل سوز نہ غم خوار

اس وقت کسان جو آس پاس کی زمینوں پر کھیتی کرنے آتے ان کی حالت ابتر تھی۔

کھیتوں پہ جو آتے تھے وہاں اہلِ زراعت ۔۔۔ لاشے نظر آتے تھے انھیں آتی تھی رقت

دن بھر تو وہ سب روتے تھے باصد غم و حسرت ۔۔۔ اور شب کو گھروں میں بھی نہ تھی غم سے فراغت

کھاتے تھے نہ پیتے تھے نہ سوتے تھے سحر تک

شبیر کی مظلومی پہ روتے تھے سحر تک

انیسؔ کو احساس ہے کہ یہ گنوار دیہاتی حق و صداقت کی خاطر آواز نہ بلند کر سکے کہ خوف اور کمزور ارادے اور ظالم حاکم کی دہشت نے ان کی قوتِ عمل مفلوج کر دی تھی۔ مگر دل سے انسانیت نہیں مٹی تھی۔ وہ بے چین تھے روتے تھے مگر کچھ کر نہ پاتے تھے، یعنی کمزور و بے بس عورتوں کی سی حالت تھی ان کی۔ لیکن ان کے مقابلے میں ان کی عورتوں کا کردار دیکھیے۔ پہلے تو وہ اپنے مردوں کی یہ عجیب حالت دیکھ کر پریشان ہوتی ہیں ؎

کیوں بے خور و بے خواب ہو کس بات کا ہے غم ۔۔۔ بتلاؤ یہ ہے کون سے مظلوم کا ماتم

خرمن پہ گری برق کہ کھیتی ہوئی پامال

املاک ہوئی ضبط کہ دنیا میں پڑا کال

سوچتی ہیں کہ یہی چیزیں کسان کے لیے پریشان کن ہو سکتی ہیں مگر ظالم و جابر حاکم کے ظلم و ستم کے افسانوں سے بھی ان کے کان آشنا ہیں۔ اس لیے فوراً ہی ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں حاکم کا عتاب تو نازل نہیں ہوا ؎

کچھ جرم کسی طرح کا ٹھہرایا ہے تم پر
کیا حاکمِ جابر کا عتاب آیا ہے تم پر

مرد عورتوں کے اصرار سے مجبور ہو کر کہتے ہیں کہ ہم پر تو کوئی مصیبت نہیں آئی مگر اس کرب و بلا کے بن میں ایک اندوہ ناک حادثہ پیش آیا ہے ؎

تھی دوسری تاریخ محرم کی کہ ناگاہ
وارد ہوا اس دشت میں اک بندۂ اللہ

تھوڑے سے ملازم تھے پہ سب غنچہ وہاں تھے
کچھ پیر تھے، کچھ طفل تھے، کچھ تازہ جواں تھے

اور ان مجاہدوں کی شان سے وہ بہت مرعوب ہوئے تھے ؎

مکّی کوئی، کوئی عربی، کوئی حجازی
رہوارِ تہِ راں عربی، ترکی و تازی

ان کی صفات بھی بیان کی جا رہی ہیں ؎

جانبازی و تسلیم و رضا ختم تھی ان پر
آقا پہ تصدّق تھے، وفا ختم تھی ان پر

ان کو سناتے ہیں کہ جب سردارِ قافلہ خیمہ زن ہوا تو اس نے ہمیں طلب کیا اور جب ہم وہاں پہنچے تو ؎

خدّام پکارے کہ رہے دھیان ادب کا
دربار ہے فرزندِ شہنشاہِ عرب کا

تب ان پر یہ حقیقت کھلی کہ وہ نواسۂ رسول امامِ وقت کے دربار میں آئے ہیں ؎

اللہ رے اخلاقِ شہنشاہِ خوش اوقات
کی ہم سے غریبوں پہ عجب لطف و عنایات

ان دور دراز صحرانشین بدوؤں نے خُلقِ محمدیؐ اور اخلاقِ حیدری کا جلوہ نہ دیکھا تھا وہ حسینؑ کی شانِ کرم دیکھ کر حیران رہ گئے ؎

آداب سے سر قدموں پہ نہوڑا دیئے ہم نے
پہلو میں جگہ دی ہمیں اس بحرِ کرم نے

امام نے ان سے درخواست کی ؎

اس دشت میں تھوڑی سی جگہ دو تو بسائیں ہے جی میں کہ اب یاں سے کہیں اور نہ جائیں
ایذائے سفر سہہ چکے راحت بھی اٹھائیں قبضہ جو ہوا اس بَن میں تو سب کام بن آئیں
جاگیر کی خواہش ہے نہ املاک کی خواہش
لے آئی ہے یاں تک ہمیں اس خاک کی خواہش

قیمت کچھ نہ لینے پہ جو ہم نے کیا اصرار قسمیں ہمیں دے دے کے دیے درہم و دینار
گھر تک ابھی ہم پھر کے نہ پہنچے تھے کہ اک بار فوجیں ہوئیں کچھ شام کی جانب سے نمودار
تاریخ ششم تک تو زمانہ ہی پھرا تھا
دو لاکھ کے نرغے میں وہ معصوم گھرا تھا

روزِ عاشور کے واقعات اس تمہید کے ساتھ سنانا شروع کرتے ہیں ؎
عاشور کو مرنے پہ مسافر ہوئے تیار
اور پھر اس آغاز کا انجام یہ ہوا کہ ؎
کس منہ سے کہیں حال شجاعان عرب کا
پیاسے تھے ہوا ظہر تلک خاتمہ سب کا
عورتیں دم بخود سن رہی ہیں۔ ابھی اس حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچیں کہ یہ بہادر کس خاندان کے لوگ تھے۔ مگر انسانی ہمدردی دلوں کو بے چین کر رہی ہے، اور مرد داستانِ الم سنائے جا رہے ہیں ؎
بے سر جو ہوئی فوج تو تنہا ہوا سردار ہر سمت سے پڑنے لگی تلوار پہ تلوار
جس وقت گرا گھوڑے سے وہ بیکس و ناچار اک بی بی نکل آئی تھی خیمے سے کئی بار
یہ سنتے ہی عورتوں کا دل پکار اٹھتا ہے کہ ایسی بے قرار محبت صرف بہن ہی کر سکتی ہے اور جب مرد کہتے ہیں ؎
بکھرائے ہوئے بال وہ آوارہ وطن تھی عورات نے رو کر کہا ہے ہے وہ بہن تھی

عورتوں کا تجسس اور بے قراری اب برداشت سے باہر ہو چکی ہے ؎

اک بولی کہ آگے کہو کیا گذری پھر اس پر — وہ بولے کہ زخمی کے چلا حلق پہ خنجر
تن گھوڑوں سے کچلا گیا، تاراج ہوا گھر — اور چھین لی اعدا نے اسی بی بی کی چادر

کونین میں اس ظلم کا اک شور پڑا ہے
اس روز سے وہ بے کفن و گور پڑا ہے

اور جب وہ یہ بتاتے ہیں کہ ؎

بے جرم و گنہ تیغِ ستم جس پہ چلی ہے
معلوم ہوا یہ کہ حسین ابنِ علی ہے

تو عورتیں جو اب تک عام انسانی ہمدردی کی وجہ سے متاثر ہیں، یہ جان کر کہ یہ ظلم و ستم بانیِ اسلام کے نواسے امام وقت حسینؑ پر توڑے گئے ہیں۔ بے قرار ہو جاتی ہیں ؎

یہ سنتے ہی عورات نے اک شور مچایا — گھبرا کے کہا ہائے یہ کیا تم نے سنایا
شبیرؑ تو خاتونِ قیامت کا ہے جایا — کیا شمعِ امامت کو لعینوں نے بجھایا

مظلوم کا سر تن سے اتارا گیا ہے ہے
ہے ہے پسرِ فاطمہ مارا گیا ہے ہے

ان مصرعوں کی بلاغت پر غور کیجیے "خاتونِ قیامت کا جایا" "پسرِ فاطمہ" سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کو فاطمہ زہرا سے زیادہ عقیدت و محبت ہے اور بیقراری میں انھیں کی نسبت سے حسینؑ کو روتی ہیں۔ اب ان کو اپنے مردوں کی بزدلی اور بے حسی کا اور شدت سے احساس ہوتا ہے تو عرب کی بہادر بدو عورت غم و غصے سے پاگل سی ہو جاتی ہے۔ پہلا ردِ عمل لعنت و ملامت کا ہے۔ فوجِ کثیر سے ڈر کر ان کے مرد امامِ وقت کا ساتھ نہ دے سکے اس حد تک ان کی سمجھ میں آسکتا ہے لیکن مظلوم

کے کفن دفن تک سے گریز کیا یہ بزدلی بلکہ نامردی ہے۔

دسویں کو ہوئی شہ کے تن و سر میں جدائی　　اور آج تلک لاش نہ سید کی اٹھائی
ان کا نہ تو باقی کوئی بیٹا ہے نہ بھائی　　تم نے بھی نبی زادے کی تربت نہ بنائی
فرزندِ نبی دشت میں بے دفن ہے کب سے
معلوم ہوا ڈر گئے حاکم کے غضب سے

مرد کی بزدلی پر اسے شرمندہ و ذلیل کرنے کا عورت کا سب سے بڑا حربہ ہے

تم اوڑھو ردائیں ہمیں دو جنگ کے ہتھیار　　بس آج سے تلوار نہ تم باندھیو زنہار
ناخوش ہیں نبی تم سے علی تم سے ہیں بیزار　　بے پردہ ہے زینب ہمیں پردہ نہیں درکار
فوجیں بھی جو بھیجے تو نہ حاکم سے ڈریں گے
اب فاطمہ کے لال کو ہم دفن کریں گے

ان عورتوں کی نڈرتا مردوں کے دلوں سے بھی حاکم کا خوف دور کر دیتی ہے ضمیر کی جو چنگاری انھیں اندر ہی اندر جلا رہی تھی، بھڑک اٹھتی ہے۔ عورتوں نے صرف زبانی دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ ہے

یہ کہہ کے بس عورات نے عریاں کیے سر　　جلدی سے اتارا انھیں پہنے تھیں جو زیور
آغوش سے بچوں کو بھی بٹھلا دیا رو کر　　اور پھینک دیا سب نے رداؤں کو زمیں پر
گہہ سینہ زنی تھی کبھی فریاد و بکا تھی
اس غول میں زہرا کے بھی رونے کی صدا تھی

یہ بند ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ عورت زیادہ جذباتی اور شدت پسند ہوتی ہے مگر اس کی یہ کمزوری جب حق کی راہ میں ہو تو وہ طاقت کا سرچشمہ بن سکتی ہے۔ اپنی عورتوں کی یہ حالت دیکھ کر مردوں کی حمیت بیدار ہو جاتی ہے ہے

مردوں نے جو دیکھا کہ چلیں عورتیں باہر　　گھبرا گئے اور بولے یہ گر گر کے قدم پر

تم روؤ گھروں میں صفِ ماتم کو بچھا کر   ہم گاڑتے ہیں لاشۂ فرزندِ پیمبر
دیویں گے کفن شاہ غریب الغربا کو
منہ ہم کو بھی دکھلانا ہے محبوبِ خدا کو

مگر بات چھپی نہیں رہتی کہ محبوبِ خدا کو منہ دکھانے کی شرم کا جذبہ ان میں عورتوں ہی نے بیدار کیا ہے۔ چنانچہ وہ میدانِ کربلا میں جاتے اور شہدائے کربلا کو دفن کرتے ہیں۔ پھر شاعر (عام شیعہ عقیدے کے مطابق) بیان کرتا ہے کہ جب امام حسینؑ کے دفن کا وقت آتا ہے تو اعجاز سے سید سجاد کربلا کے میدان میں آتے ہیں کہ ؎

مشرق میں جو ہو موت امام ذوی الاکرام
مغرب سے امام آتا ہے واں دفن کے ہنگام

اور چوتھے امام آکر امام حسینؑ کی بے سر لاش کو دفن کرتے ہیں۔

اس طرح بنی اسد کی یہ عورتیں نہ صرف عرب کی بدّو عورتوں کی لاج رکھتی ہیں بلکہ اپنی حق پرستی اور ایمانی قوت کا مظاہرہ کر کے دنیا کی عورتوں کا سر بلند کر دیتی ہیں۔

زوجۂ حارث

حارث کی زوجہ کوفے کی رہنے والی ہے۔ یہ وہی کوفہ ہے جس نے امام حسینؑ کو دعوت دی تھی کہ آکر ہماری رہنمائی کیجیے۔ ہم یزید کی حرکتوں سے بیزار ہیں اور اس کی بیعت نہیں کرنا چاہتے۔ مگر یہ کوفے والے حسینؑ کے پہنچنے سے پہلے ہی حاکم کے خوف کے آگے جھک گئے۔ یہی نہیں کہ حسینؑ کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان سے جنگ کرنے میں بھی پیش پیش رہے۔ یہ وہی کوفہ ہے جس کی طرف امام حسینؑ نے اپنے

چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ لوگوں نے ان کے ہاتھ پر امام حسینؑ کی بیعت کی اور پھر انسانیت، شرافت اور شہریت کے سارے اصولوں کو توڑ کر انھیں اور ان کے دو کم عمر بچوں کو شہید کر دیا۔

وہی کوفہ جہاں حسینؑ کے اہلِ حرم قید کر کے لائے گئے تو بھرے دربار میں یہ غدار بیٹھے دیکھتے رہے اور ان کے ضمیر پر آنچ نہ آئی۔ مگر کوفے کی لاج بھی ایک کوفی عورت نے رکھی جو حارث کی بیوی تھی۔ حارث جو حریص ظالم شخص ابن زیاد کا جاسوس اور اہلِ بیت رسول کا دشمن تھا۔

روایت ہے کہ مسلم کی شہادت کے بعد ان کے کم عمر بچوں کو قید کر کے سخت تکلیفوں میں رکھا گیا۔ زندانِ ستم میں وہ اس سے بھی بے خبر تھے کہ ان کے ماموں حسینؑ اپنے سارے خاندان اور دوستوں کے ساتھ شہادت پا چکے، اور ان کی ماں، پھوپھیاں یزیدی فوجوں کی قید میں ہیں۔ وہ بچے قید و بند کے مصائب جھیل رہے تھے کہ اتفاق سے زندان کا نگہبان ایک محبِ اہلِ بیت شخص نکل آتا ہے۔ اور جب اسے معلوم ہوتا کہ یہ بچے حسینؑ کے بھانجے ہیں تو ایک روز چپکے سے رات کی تاریکی میں انھیں قید خانے سے نکال کر مدینے کے راستے پر ڈال دیتا اور سمجھاتا ہے کہ اگر کسی طرح تم اس شہر کے مضافات سے نکل جاؤ تو شاید تمھاری جان بچ جائے۔ بچے اتنے کمزور اور ناتواں ہو چکے ہیں کہ لاکھ کوشش پر بھی چل نہیں پاتے۔ راستہ بھٹک جاتے ہیں اور بجائے مدینے کی سمت جانے کے پھر الٹے کوفے کی طرف چلنے لگتے ہیں۔

ادھر صبح کو جب ان کی گم شدگی کی خبر ملتی ہے تو حکام شہر ان کی گرفتاری کے احکام جاری کرتے ہیں۔ اس ہدایت کے ساتھ ؎

مظلوم سمجھ کر کوئی ترحم ان پہ نہ کھائے ہاتھ آئیں تو دربار میں پکڑے ہوئے لائے

جس نے انھیں پنہاں کیا گھر اس کا لٹے گا
مرجائے گا پر قید سے کنبہ نہ چھٹے گا

کسی کے دل میں اتنا رحم یا خدا پرستی کا جذبہ نہ تھا کہ اس کے بعد بھی ان کو پناہ دیتا مگر کوئی عورتوں کے دل اپنے مردوں جیسے پتھر نہ تھے۔ وہ بے بس و مجبور تھیں مگر بے کس بچوں پر رحم کھاتی اور چپکے چپکے ان کے حال پر آنسو بہاتی تھیں۔ یہاں بھی ہمیں انیس یہ بتاتے ہیں کہ فطری طور پر عورت کے دل میں محبت، رحم، اور انسانی ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے ے

باتیں انھیں معصوموں کی ہوتی تھیں گھروں میں
منہ ڈھانپے ہوئے بیبیاں روتی تھیں گھروں میں

ان کی مدد کرنے کا جذبہ بھی دل میں موجود تھا ے

کہتی تھی کوئی کیا کریں کیونکر انھیں پائیں
جاسوسوں کا خطرہ ہے کہاں ڈھونڈنے جائیں
جلادوں سے چھپ کر وہ اگر یاں چلے آئیں
ہم دل کی طرح ان کو کلیجے سے لگائیں
آقا ہیں وہ اس کے جو غلام شہِ دیں ہے
ہم لونڈیاں حاضر ہیں جو ماں پاس نہیں ہے

یہ شعر ثابت کرتے ہیں کہ ان کے دل میں اسلام اور بانیٔ اسلام اور اہلِ بیت کی محبت ہے اور خاندانِ نبوت کے ان بچوں کی حالت پر دل کٹے جا رہے ہیں ے

کیا روزِ سیہ چرخ نے بچوں کو دکھایا
ہے ہے نہ چچا سر پہ نہ ماں باپ کا سایا
سات آٹھ برس کا تو سن اور دیس پرایا
جانیں نہ بچیں گی کسی دشمن نے جو پایا
کچھ بس نہیں کس طرح کوئی آہ بچائے
بچوں تمھیں پردیس میں اللہ بچائے

یہ تو عام عورتوں کی حالت تھی۔ لیکن ان عورتوں میں سے ایک عورت

ان بچوں کو یاجاتی ہے تو وہ سب کر گذرتی ہے۔ جوان عورتوں کی آرزو تھی یعنی یہ سب زبانی باتیں نہ تھیں اس ضعیف عورت کا کردار ہمیں بتاتا ہے کہ وہ سچی مومنہ اور صحیح معنوں میں انسان ہے۔ صبح بہت سویرے وہ عورت کسی جگہ بچوں کو ڈرا سہما کھڑا دیکھ کر پوچھتی ہے کہ تم کون ہو، اور ان سے یہ سن کر ے

رکھتے ہیں قرابت تو رسول عربی سے
مسلم کے پسر ہیں ہمیں کہیو نہ کسی سے

اور بچے اس سے یہ درخواست بھی کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے گھر میں چھپالو ے

وہ بولی کہ آنکھوں پہ رکھوں میں تمھیں دن رات
پر صاحبِ خانہ ہے بڑا فاسق و بدذات
حاکم کا تو وہ دوست ہے اور دشمنِ سادات
گر دیکھ لیا اس نے تو بننے کی نہیں بات
لونڈی ہوں میں زہرا کی تمھارا ہی یہ گھر ہے
گر ہے تو اسی ظالم بدذات کا ڈر ہے

لیکن بچوں کی منت و زاری اسے یہ خطرہ مول لینے پر آمادہ کردیتی ہے۔ خطرہ اپنا نہیں بچوں کی جان کا ہے ے

دونوں نے بہ منت جو کہا اس سے یہ رورو
تھی مومنہ معصوموں پر رحم آگیا اس کو
کہنے لگی میں تم کو چھپا رکھوں گی جو ہو
میں صدقے گئی آؤ مری بی بی کے پیارو
مہماں ہوئے جا کر ستم ایجاد کے گھر میں
دونوں کو قضا لے گئی جلاد کے گھر میں

بچے اتنے ڈرے سہمے ہیں کہ ان سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں جاتا اور جب ضعیفہ اندر حجرے میں لے جاتی ہے تو وہ تکان اور نقاہت سے بیہوشی کی نیند سو جاتے ہیں۔ زوجۂ حارث سخت پریشانی کی حالت میں ہے کہ رات گئے اس کا شوہر سخت غصے میں واپس آتا ہے ے

کوسوں سے تھکا آیا ہوں در کھول دے آکر　　چلّایا ضعیفہ کو یہ زنجیر ہلا کر

وہ ہاتھ میں تلوار لیے غیظ و غضب میں اپنی بوٹیاں نوچتا، بیوی کو جھڑکتا، بگڑتا آکر سو جاتا ہے۔ اسی حالت میں اس کے کان میں رونے کی آواز آتی ہے تو وہ اٹھ کر خنجر ہاتھ میں پکڑ کر کونے کونے میں ڈھونڈھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس حجرے میں جاتا ہے ؎

اک برج میں دو عرش کے تارے نظر آئے　　واں مسلم مظلوم کے پیارے نظر آئے

ان بچوں کی اس وقت کی حالت دکھا کر شاعر بے بسی و مصیبت کی وہ مرقعہ کشی کرتا ہے کہ دل ہل جاتے ہیں ؎

سوتے تھے دھرے پیار سے رخسار پہ رخسار　　جاگے جو کبھی رات کے تھے وہ جگر افگار
باہیں جو گلے میں تھیں تو با دیدۂ خونبار　　تصویر سے بستر پہ کشیدہ تھے تن زار

بچوں کی آنکھ کھل جاتی ہے اور اجل سر پر دیکھ کر وہ خوف سے لرزنے لگتے ہیں اور جب حارث نام و پتہ پوچھتا ہے تو معصوم اس سے پہلے اماں مانگتے ہیں کہ بچے بھی یہ جانتے ہیں کہ عرب جس کو امان دے دے پھر اس کے لیے جان بھی دے سکتا ہے ؎

اس نے کہا ہاں دونگا تو بولے وہ گل اندام　　وہ بولے اماں دیگا جو بتلائیں تجھے نام
کھینچے ہوئے ہے ہاتھ میں تو تیغ جفا کو
ڈر لگتا ہے تجھ سے ہمیں ضامن دے خدا کو

لیکن یہ سنتے ہی کہ یہ معصوم مسلم کے پسر ہیں اس کی آتش حرص و ہوس بھڑک اٹھتی ہے اور وہ بے دردی کے ساتھ بچوں کو گھسیٹتا ہوا اس طرح باہر لاتا ہے کہ ؎

مجرم کی طرح باندھ دیا دونوں کو در سے　　کرتے بھی پھٹے ٹوپیاں بھی گر گئیں سر سے

اور صبح ہوتے ہی ان کو قتل کرنے کے لیے دریا کی سمت لے جانے لگتا ہے۔ اس وقت زوجۂ حارث کی بھی بے قراری کو بیان کرنا انیس ہی کا کام ہے ؎

چلاتی چلی پیچھے ضعیفہ جگر افگار　　بن باپ کے بچے ہیں یہ ظالم نہ انھیں مار
کیوں فاطمہ زہرا کو رلاتا ہے کفن میں
دو پھول تو رہنے دے محمد کے چمن میں

بچوں سے لپٹی تھی جو وہ کھولے ہوئے سر　　تلوار کے ہولوں سے ہٹاتا تھا ستمگر
وہ کہتی تھی تو ان کے عوض قتل مجھے کر　　ہے ہے مرے مہمان ہیں یہ بیکس و مضطر
آنکھوں سے قدم ان کے لگانے نہیں پائی
کھانا بھی غریبوں کو کھلانے نہیں پائی

یزیدی افسروں نے انسانیت اور شرافت کے سب آئین اور خود عرب کی خصوصیات جو جاہلیت کے زمانے میں بھی عربوں کو جان سے زیادہ پیاری ہوتی تھیں، خاک میں ملا دی تھیں۔ چنانچہ حارث پر اس کا اثر بھی نہیں ہوتا کہ یہ معصوم اس کے گھر مہمان ہیں اور بیوی ہی نے نہیں خود اس نے بھی خدا کو ضامن دے کر بچوں کو پناہ دی ہے۔ حارث جب بچوں کو قتل کر کے ابن زیاد کے پاس لے جاتا ہے تو بڑے فخر سے اپنی سفاکی و وفاداری کا ذکر کر کے بتاتا ہے کہ میں نے اپنی بیوی تک کو راستے سے کس طرح ہٹا دیا ہے

جب لے کے چلا گھر سے انھیں قتل کی خاطر　　زوجہ نے یہ کہہ کر مرے پاؤں پہ رکھا سر
مہمان ترے گھر آئے ہیں یہ دونوں مسافر　　لے ان کے عوض کاٹ لے سر ہے مرا حاضر
تقصیر جو کچھ ان سے ہوئی ہے وہ بحل کر
ہے ہے مجھے مہمانوں کے آگے نہ خجل کر

للہ تو معصوموں کے اب چھوڑ دے بازو　　کیوں کھینچتا ہے بچوں کو پکڑے ہوئے گیسو
تلوار کو کر میان میں ڈرتے ہیں یہ گلرو　　قربان ہیں یہ چپ ہیں بھرے آنکھوں میں آنسو

کس یاس سے ہے ہے مرا منہ تکتے ہیں دونوں
دہشت سے تری کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں دونوں

یہ کہہ کے جو بچوں کو چھڑانے لگی ایکبار
جھنجھلا کے میں بولا تجھے کیا ان سے سروکار
جا دور ہو کہنا ترا مانوں گا نہ زنہار
میں قتل کروں گا یہ ہیں حاکم کے گنہگار
اب حلق سے معصوموں کے شمشیر ملے گی
سر ان کے دکھاؤں گا تو جاگیر ملے گی

سمجھا نا نہ ہرگز وہ مرا دھیان میں لائی
جھنجھلا کے اسے ضربِ ستم میں نے لگائی
اک وار میں ساعد سے گری کٹ کے کلائی
چلّا کے لگی دینے دہائی یہ دہائی

اور پھر اسی حالت میں ؎

مظلوموں کی لے لے کے بلائیں یہ پکاری
اب تم سے جدا ہوتی ہے لونڈی یہ تمھاری
شکوہ نہ مرا کیجیو زہرا سے میں واری
کس طرح بچاؤں مجھے تلوار ہے ماری
مجبور ہوں طاقت نہیں اٹھنے کی زمیں سے
اللہ بچائے تمھیں اس دشمنِ دیں سے

اور اسی حالت میں یہ فریاد بھی کرتی ہے ؎

دوڑے کوئی، معصوم گرفتارِ بلا ہیں
بچوں کو چھڑا دے کہ یہ بے جرم و خطا ہیں

ذرا اس جذبے کی شدت و صداقت پر غور کیجیے۔ تلوار لگنے کے بعد بھی پہلا یہ خیال آتا ہے کہ میں تو ان پر قربان ہو گئی۔ اب کون بچائے گا تو آواز بلند کرتی ہے کہ ہے کوئی اللہ کا بندہ جوان بے جرم و خطا مظلوم معصوموں کو بچائے اس ظالم سے۔ مصیبت کے مارے بچے اس ضعیفہ کی محبت میں مادری الفت کا جذبہ دیکھتے ہیں اور روتے ہیں ؎

روتے تھے ضعیفہ کی محبت میں وہ مہرو
بہہ بہہ کے گریبان تلک آتے تھے آنسو

اور اسی حالت میں ؎

کھینچے لیے جاتا تھا یتیموں کو جفا جو   اک ہاتھ میں تلوار تھی اک ہاتھ میں گیسو

خوں دیکھ کے دونوں جو ضعیفہ کا ڈرے تھے
دہشت سے بندھے ہاتھوں کو آنکھوں پہ دھرے تھے

اس واقعہ میں انیس نے ایمان و کفر کا، شرافت و سفاکی کا انسان و درندے کا فرق کس خوبی سے دکھایا ہے۔ ایک طرف ایک ظالم مرد ہے جو جاہ و منصب کی طلب میں بدترین مظالم ڈھانے سے دریغ نہیں کرتا جو حیوانیت سے بھی بڑھ کر شیطنت کے درجے پر اتر آتا ہے۔ وہ نمائندہ ہے ان عہد شکن جابر و بزدل کوفیوں کا جنھوں نے حسینؑ سے دغا کی اور خود ان کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ دوسری طرف اس کی گمنام بیوی ہے۔ کوفی عورتوں کی نمائندہ جن کے دل میں ایمان کی شمع روشن ہے۔ بانیٔ اسلام اور اس کے اہل بیت کی محبت جلوہ گر ہے۔ وقت آنے پر ان کی ایک بہن جرأت، شجاعت، ایمان و یقین، انسانیت و شرافت کی چٹان بن کر ظالم شوہر کے سامنے ڈٹ جاتی ہے اور اس کے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد مرتے مرتے بھی مظلوم بچوں کی حمایت کا نعرہ اس کے لبوں پر رہتا ہے۔ وہ شہید مومنہ ختم ہو جاتی ہے مگر داستانِ کربلا کے ساتھ اس بے نام کوفی عورت کا نام بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہ جاتا ہے۔ اور اردو داں طبقے کو اس دلکشی، اس حسن و خوبی سے روشناس کرانے کا کام انیس انجام دیتے ہیں۔

خولی۔ قاتل حسینؑ کی مومن بیویاں

قاتلانِ حسینؑ میں چند نام بہت مشہور ہیں جن کی سفاکی ضرب المثل بن

چکی ہے۔ ایک شمر ذی الجوشن ہے، دوسرا خولی اصبحی۔ جن مومن بیویوں کا ہم ذکر کریں گے وہ اسی خولی کی بیویاں تھیں۔ واضح رہے کہ یہ سب اپنے کو مسلمان کہتے تھے اور ان کی بیویاں بھی مسلمان بیویاں تھیں مگر ان کی طرح نام کی نہیں، سچی مسلمان۔ یہ دونوں خواتین اس کی بیّن مثال ہیں۔

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ابن سعد نے سب شہیدوں کے سروں کو ایک ایک افسر کے سپرد کیا کہ اس کی کربلا سے دمشق تک کے سفر میں حفاظت کریں اور سرِ سیدالشہداء حسین علیہ السلام خولی کو دے کر اس کی سخت نگرانی کرنے کی ہدایت کی کہ ان سروں کو دربارِ یزید میں پیش کر کے انعام واکرام، جاگیر اور یزید کی خوشنودی حاصل کرنی تھی۔ اہلِ حرم کو اونٹوں پر سوار کر کے سید سجاد کو مہار پکڑا کر فوجوں کے گھیرے میں لے کر دشمن کربلا سے دمشق کی سمت روانہ ہوئے مگر ان بزدلوں کے دل میں خوف تھا کہ کہیں کوئی مومن، کوئی جاں نثارِ حسینؑ سرِ سیدالشہداء کو چرا نہ لے۔ اس لیے خولی کو حسینؑ کے سر کی حفاظت کی خاص تاکید کی گئی تھی۔ اسی راستے میں ایک مقام پر خولی کا گھر قریب پڑتا تھا وہ سرِ حسینؑ کو چھوڑنا خلافِ احتیاط سمجھ کر اسے رومال میں باندھ کر اپنے ساتھ لے کر اپنی پہلی بیوی کے یہاں جاتا ہے جو بنی اسد کے قبیلے کی ہے۔ وہاں کیا پیش آتا ہے یہ انیس کے کلام میں دیکھیے۔ وہ سرِ حسینؑ ایک جگہ رکھ کر خود کمر کھولنے لگتا ہے بیوی دیکھتی ہے کہ ؎

سارا مکان نور سے معمور ہو گیا
گھر میں فروغِ روشنیِ طور ہو گیا

رومال میں یہ لایا ہے کیا چیز باندھ کر
حیران ہو کے بولی وہ بی بی نکو سیر
جس کی ضیا سے ہو گیا روشن تمام گھر
ہے درشب چراغ جو ایسا ہے جلوہ گر

کیا سانحہ ہے جس سے مرا دل ملول ہے
اس نے کہا کہ یہ سرِ سبطِ رسول ہے

بیوی یہ سن کر سخت پریشان و بے قرار ہو جاتی ہے ؎

چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولی وہ خوش خصال ہے ہے یہ اس کا سر ہے جو ہے فاطمہ کا لال

لوٹا یہ کس نے خانۂ محبوبِ ذوالجلال دنیا کے آفتاب پہ یوں آ گیا زوال

واحسرتا حسین سے زینب بچھڑ گئی

ہے ہے بتولِ پاک کی کھیتی اجڑ گئی

دیکھیے وہی نسوانی تقاضا کہ سب سے پہلے شہید کی بہن کا خیال آتا ہے۔ جس کی ماں کی کھیتی اجڑ گئی۔ رنج و غصے میں بے حال ہو کر وہ بھول جاتی ہے کہ خولی اس کا شوہر ہے جو اس کو سزا دے سکتا ہے، نکال سکتا ہے، جان سے بھی ایسا ظالم مار دے تو کیا عجب۔ اس پر لعنت و ملامت کی بوچھار کر رہی ہے ؎

لاتے ہیں آدمی تو غنیمت میں مال و زر لایا ہے گھر میں تو پسرِ فاطمہ کا سر

او ظالم و لعین و بد آئین و بدگہر سر کو حسین کے لیے پھرتا ہے در بدر

پیشِ خدا جو روزِ قیامت کے جائے گا

بتلا مجھے بتول کو کیا منہ دکھائے گا

برباد دیں کیا طمعِ زر سے ہے غضب تو کچھ ڈرا نہ روحِ پیمبر سے ہے غضب

لایا ہے سر حسین کا لشکر سے ہے غضب لٹکائے تھا یہ بے ادبی سر سے ہے غضب

جن و ملک تو روتے ہیں اور تجھ کو غم نہیں

ظالم یہ سر حسین کا قرآں سے کم نہیں

غصہ بڑھتا جاتا ہے ؎

یہ کہہ کے سر کو پیٹتی دوڑی وہ سوگوار

چلائی اے نبی کے نواسے ترے نثار

اسی بنی اسد قبیلے کی ہے جس کی عورتوں نے مردوں کو سخت ملامت کی تھی

کہ تم نے لاشِ سید الشہداؑ کو دفن نہیں کیا۔ اسی بہادر قبیلے کی یہ بہادر عورت قاتلِ حسینؑ کو سزا دینے سے بھی نہیں چوکتی ہے

اس مومنہ نے غیض میں پھر آکے ایک بار　　مارا لعین کو سنگ کہ سر ہو گیا فگار

بیوی کا یہ غیض و غضب دیکھ کر بزدل شوہر بھاگ جاتا ہے ہے

پایا محل نہ گھر میں جو آرام و چین کا
بھاگا وہاں سے لے کے لعیں سر حسین کا

وہاں سے وہ دوسری بیوی خضرمیہ کے گھر آتا ہے۔ اب وہ ڈرتا ہے کہ یہ بیوی بھی سچی مسلمان ہے تو ڈر کر سرِ اقدس کو چھپا کر تنور میں رکھ دیتا ہے اور سو جاتا ہے خضرمیہ کو نمازِ شب کی عادت ہے جب وہ آدھی رات کو اٹھتی ہے تو اسے ہے

اک روشنی سی گھر میں نظر آئی چار سو

وہ حیران ہو کر سوچتی ہے ہے

روشن بھی آج تو نہیں میں نے کیا تنور　　کھلتا نہیں یہ کچھ نہ کچھ اسرار ہے ضرور

پرنور کیوں تنور سے سارا مکان ہے
کیسی یہ روشنی ہے کہ تا آسمان ہے

آگے شاعر جو روایت بیان کرتا ہے اس پر جن لوگوں کو عقیدہ نہ ہو وہ اسے شاعر کی قوتِ بیان اور زورِ تخیل سمجھ سکتے ہیں۔ بہرحال انیس کا مقصد خضرمیہ کی محبتِ دین و حق پرستی کو اجاگر کرنا ہے۔ اسی روشنی میں اس واقعے کو دیکھنا چاہیے۔ خضرمیہ دیکھتی ہے کہ آسمان سے ایک ہودج اترتا ہے جس میں دوسری مقدس و محترم بیویوں کے ساتھ فاطمہ زہراؑ اترتی اور تنور کے قریب آتی اور سرِ حسینؑ کو آغوش میں لے کر گریہ و ماتم کرتی ہیں۔ خضرمیہ مبہوت یہ سب دیکھ رہی ہے۔ اور اب اس پر

یہ حقیقت کھلتی ہے کہ یہ سر فاطمہؑ زہرا کے لختِ جگر حسین علیہ السلام کا ہے۔ ذرا دیر بعد ہو وج واپس چلا جاتا ہے تو ؎

آئی تنور پر زنِ خولی بصد فغاں دل کانپتا تھا سینے میں اور اشک تھے رواں
رقت کا تھا یہ جوش کہ تھرا کے گر پڑی
دیکھا جو سر تنور میں غش کھا کے گر پڑی

اور غشی میں اس نے ہاتفِ غیبی کی یہ صدا سنی۔ آپ اسے ضمیر کی آواز کہہ لیجیے۔

اے زن بس اپنے شوہرِ ملعوں کے گھر سے جا
تو دوست ہے علی کی یہ ہے دشمنِ خدا کافر سے کام مومنہ پاک کو ہے کیا
تو نیک اعتقاد ہے وہ بد سرشت ہے
دوزخ مکاں ہے اس کا ترا گھر بہشت ہے

وہ غش سے چونک کر سر کو تنور سے نکالتی ہے اور ؎

چھڑ کا گلاب اور رکھا جا نماز پر ہے ہے حسین کہہ کے وہ چلائی تا سحر
لیکن صبح ہونے پر اس کا سفاک شوہر سرِ اقدس کو لے کر جانے لگتا ہے تو شرم، رنج اور غصے سے بے حال ہو کر وہ ترکِ دنیا کر دیتی ہے ؎

ہنگامِ صبح غم کی چھری دل پہ چل گئی
جنگل کو پیٹتی ہوئی گھر سے نکل گئی

بنی اسد کی عورتیں، کوفے کی عام عورتیں، حارث کی بیوی، خولی کی بیویاں، ان پڑھ، سیدھی سادی عام دیہاتی یا بدو عورتیں ہیں وہ علم سے بہرہ ور نہیں۔ سیاست اور اس کی چالوں سے آگاہ نہیں، لیکن انھوں نے اسلام قبول کیا، اور اس سے انھیں گہرا لگاؤ اور پیمبرِ اسلام سے عقیدت اور ان کی اولاد سے ارادت و

محبت ہے۔ ان کے مرد کبھی تو خوف اور بزدلی کی وجہ سے حق کی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ کبھی غلط فہمیوں میں مبتلا نظر آتے ہیں اور کبھی جاہ و منصب، دولت و جاگیر کی ہوس ان کو راہ راست سے بھٹکا دیتی ہے۔ بعض حارث اور خولی جیسے بدباطن اور سفاک ہیں جن پر انسانیت شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہے لیکن ان کی عورتوں میں سے ایک بھی تو ایسی نہیں جو ظالم و جابر کا ساتھ دینا تو کجا اس بات سے آگاہ ہو کر کہ کیا ستم کیے جا رہے ہیں، خاموشی ہی اختیار کر لے۔ ہم بنی اسد کی عورتوں حارث کی بیوی اور خولی کی بیویوں کے تذکرے میں ان کی جاں نثاری کے واقعات بیان کر آئے ہیں۔ شاعر نے تخیل کی اڑان اور مشاہدے کی گہرائی اور عقیدے کے سہارے ان واقعات کو جن کا مجمل ذکر تاریخ کربلا میں ملتا ہے۔ ایسی مرقع کشی کی ہے کہ سبحان اللہ ہر تصویر منہ سے بول رہی ہے۔ انیسؔ نے ایک عام عورت کا کردار بھی حق و سچائی کا پالن کرنے والا اور امن کا پرستار دکھایا ہے۔ وہ بالواسطہ ثابت کرتے ہیں کہ اگرچہ مرد بھی حق کا پالن کرتے اور امن و سلامتی کے پرستار ہوتے ہیں مگر انے گئے، لیکن عورت فطری طور پر امن کی طلبگار، دین کی امین، رحمدل حق گو اور حق پرست ہوتی ہے۔ انیسؔ کی یہی ایک خصوصیت ایسی ہے جو انھیں اور سب شاعروں سے ممتاز کر سکتی ہے اور اس میدان میں حالی کے سوا جنھوں نے اپنے محدود دائرے میں عورت کے کردار کو سراہا ہے، کوئی اور ان کا ہم نوا نظر نہیں آتا۔

زینب کبریٰ کا کردار
شہادت حسین تک

حضرت زینب کا کردار اور شخصیت اسی طرح عظیم و منفرد ہے۔ جیسی امام حسینؑ کی۔ اور کیوں نہ ہوتی، دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں۔ ایک ڈالی کے دو ثمر، ایک پھول کی دو پنکھڑیاں ہیں۔ زینب اور حسین نے ایک ہی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ ایک ہی دریائے علم سے سیراب ہوئے۔ دونوں بچوں نے اپنے نانا رحمۃ للعالمین محمد مصطفےٰؐ کی آغوش محبت میں آنکھیں کھولیں اور اس عظیم انسان کی صفات کو سب سے قیمتی ورثہ جانا۔ پھر کیا تعجب ہے کہ جس محمدؐ کے نواسے نے ان کے دین کے بچانے کے لیے اپنا سب کچھ راہ الہٰی میں لٹا دیا۔ اسی کی بہن زینب نے اپنا سب سرمایہ۔ جو عورت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے اسی راہ میں قربان کر دیا۔ جس عظیم مقصد کے لیے حسینؑ نے جان قربان کی اسی مقصد کی تکمیل کے لیے زینب نے زندہ رہنا گوارا کیا۔ حسینؑ پر جو مصائب توڑے گئے ان کا خاتمہ شہادت پر فائز ہونے کے بعد شام عاشور تک ہو گیا لیکن زینب کی مصیبتیں یہاں ختم نہیں ہوئیں، بلکہ مصائب کی سختی اور ظلم و ستم اور زیادہ بڑھ گیا

پھر روزِ عاشور تک جو کچھ جھیلا تھا اس میں حسینؑ جیسا بھائی ساتھ تھا۔ اب جو سہا تنِ تنہا سہا۔ مگر اس عظیم مقصد کی تکمیل کی خاطر ہر جان لیوا دکھ، ہر روح فرسا ستم انھوں نے اس عزم و وقار اور صبر و ضبط کے ساتھ سہارا جو تاریخِ اسلامی و انسانی میں ایک منفرد واقعہ بن گیا۔ وہ عورت کی عظمت کا ایک ایسا ستون ہیں جسے حادثات کی کوئی آندھی کوئی زلزلہ ڈھا نہیں سکتا۔ انھوں نے مدینے کے سفر سے لے کر واپس مدینے جانے تک جو کچھ کیا، جو جھیلا وہ اتنی بڑی داستان ہے، جس کے لیے خود ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے اور میر انیسؔ کے کلام میں تو زینب کا کردار سب سے محبوب موضوع ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انیسؔ کا کوئی مرثیہ کوئی سلام اس ذکر سے خالی نہیں تو یہ ایک حقیقت ہوگی۔ دراصل واقعاتِ کربلا میں زینب کی شخصیت اور کردار امام حسینؑ کے کردار کی طرح ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے دونوں بھائی بہن روح و جان کی طرح ہیں۔ ان کی ذات سورج کی طرح ہے، اور باقی لوگ ان کے گرد گھومنے والے سیارے۔ ایک باب ان کے کردار اور کارناموں کے بیان کے لیے ناکافی ہوتا۔ اس لیے میں نے ایک باب میں شہادتِ حسینؑ تک کے اور دوسرے میں شہادت کے بعد کے جو واقعات پیش آئے وہ بیان کیے ہیں۔ میں نے ان کو سمیٹنے اور مختصر کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی اور اس کے باوجود بھی وہ نہ زینب خاتون کی شخصیت کو ابھارنے کا حق ادا کر سکے اور نہ کلام انیسؔ کے ساتھ جیسا چاہیے تھا ویسا انصاف ہو سکا۔

انیسؔ ایک مرثیے میں زینب کا تعارف یوں کراتے ہیں ؎

آفاق میں زہرا کا نہیں ہے کوئی ہمسر ‏ ‏ ‏ زوجہ اسد اللہ کی اور بنتِ پیمبر
حوا کا شرف، نورِ خدا عرش کا زیور ‏ ‏ ‏ قرآں میں جسے یاد کرے خالقِ اکبر
ثانی کوئی زہرا کا نہ ہوگا نہ ہوا ہے
ہاں حضرتِ زینب کو جو کہیے تو بجا ہے

یہ شاعرانہ انداز بیان ہی نہیں حقیقت بھی ہے کہ سعادت مند بیٹی ماں کی صفات کی ورثہ دار ہوتی ہے اور اس سے کسبِ فیض بھی کرتی ہے آگے چل کر کہتے ہیں ے

ان کی بھی وہ عزت ہے جو زہرا کی ہے توقیر
ساری وہی سیرت، وہی صورت، وہی تقریر

ذرا ان کی عظمت کی دلیلیں دیکھیے۔ کتنی زبردست اور کتنی سچی ے

لختِ جگرِ شیرِ خدا صاحبِ تطہیر مخدومۂ عالم، شہِ کونین کی ہمشیر
ممتاز کیا حق نے نواسی کو نبی کی
عصمت تھی جو زہرا کی تو شوکت تھی علی کی

اس کی صفات وہی ہیں جو باپ اور ماں کی ہیں ے

فاقوں میں شکایت کبھی لب پر نہیں آئی سو شکر کیے نانِ جویں ایک جو پائی
تھی آسیہ کا فخر یداللہ کی جائی فضّہ کی جگہ کرتی تھی خود آسیہ سائی
جو پاس ہوا صرف کیا راہِ خدا میں
زہرا کی طرح ہوتے تھے پیوند ردا میں

اس کی زندگی ابتدا ہی سے غموں اور دکھوں میں بسر ہوئی ے

ماں باپ نے جو رنج والم خلق میں پائے سب زینبِ غم دیدہ کے حصّے میں وہ آئے
فاقے بھی کیے میوۂ فردوس بھی کھائے غربت بھی ملی اور مصائب بھی اٹھائے
ملتا تھا چلن فاتحِ خیبر کے چلن سے
بولی نہیں باندھے گئے بازو جو رسن سے

انھوں نے اپنے بحر العلوم والد سے علم کی دولت حاصل کی تھی۔ اور تاریخِ کربلا میں ان کے فصیح و بلیغ خطبات ثابت کرتے ہیں کہ وہ بڑی عالم و فاضل خاتون

تھیں۔ ان کا لقب خاندان میں عقیلہ بنی ہاشم تھا۔ لیکن میر انیس زینب کی ان خصوصیات کی طرف کہیں کہیں صرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے پیش نظر ایک تو بھائی بہن کی گہری محبت دکھانا ہے دوسرے زینب کو ان کے مقصد سے جو گہرا لگاؤ ہے اس کی وضاحت کرنا ہے۔ وہ زینب میں ایک عاشق زار بہن اور سچی مسلمان عورت کا کردار ابھارتے ہیں۔ لیکن یہ شاعر کے گہرے مشاہدے اور انسانی سیرت کی باریکیوں کو سمجھنے کی صلاحیت کا کمال ہے کہ بے ارادے بھی ان کی سیرت کا ہر پہلو اجاگر ہو جاتا ہے۔

انیسؔ لکھتے ہیں کہ جب فاطمہ زہراؑ کے انتقال کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے اس لاڈلے بیٹے کو (جس کی الم ناک شہادت کی پیش گوئی وہ رسول خدا سے سن چکی تھیں) کم سن بیٹی کے سپرد کیا ہے

جب خلق سے وقت سفر فاطمہ آیا تب زینب و شبیر کو پاس اپنے بلایا
روئیں بہت اور بیٹے کو چھاتی سے لگایا زینب کے دیا ہاتھ میں ہاتھ اور یہ سنایا

اے زینب بے کس مری دولت سے خبردار
محبوب الٰہی کی امانت سے خبردار

بظاہر یہ عجیب بات ہے کہ وہ کم سن بچی کو بڑے بھائی کے سپرد کرنے کی جگہ بیٹے کو بچی کے سپرد کرتی ہیں مگر آنے والے واقعات ثابت کرتے ہیں کہ ان کا مقصد اور مطلب اس سے کیا تھا زینب کے دل پر ماں کی یہ وصیت نقش کالحجر ہو جاتی ہے ہے

ہر رنج میں اس بھائی کے کام آئیو زینب
جائے یہ جدھر ساتھ چلی جائیو زینب

اوپر تلے کے بھائی بہن میں یوں بھی بہت محبت اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ ان میں لڑائی

جھگڑا بھی ہوتا ہے مگر پیار بھرا مگر زینب کو حسینؑ سے جو محبت ہے اس میں عقیدت کا عنصر بھی ہے اور مادرانہ شفقت کا انداز بھی۔ بہن بھائی میں گہری دوستی بھی ہے۔ ماں کی وفات کے بعد ان کا حال یہ تھا کہ ؎

دن رات یہاں تک رہی سرگرم اطاعت
شاہ شہدا بھول گئے ماں کی محبت

بھائی کو بھی بہن سے ویسی ہی محبت ہے ؎

شفقت سے نظر کرتے تھے ہر آن بہن پر
وہ ان پہ تصدق تھی یہ قربان بہن پر

زینب کو ہر وقت بھائی کے آرام و راحت کی فکر رہتی ہے ؎

تھیں بھائی کے آرام کی ہر وقت طلبگار
سوتے تھے جو شبیر تو یہ رہتی تھیں بیدار

یوں تو زینب کو اپنے بڑے بھائی امام حسنؑ سے بھی کم محبت نہ تھی کہ ان کا دل محبت کا ایک ایسا ساگر تھا جس کی تھاہ نہیں ہوتی۔ اور جب بڑا بھائی زہر سے شہید کر دیا جاتا ہے تو ان پر سخت صدمہ گذرتا ہے۔ پھر جب کچھ مخالف نواسۂ رسول کو پہلوئے رسول میں دفن نہیں ہونے دیتے اور روایت کے مطابق لاش پر تیروں کی بوچھار کی جاتی ہے تو اس وقت حسینؑ کو غصہ آجاتا ہے۔ وہ غصہ جو حق کی خاطر زندگی میں پہلی بار آیا تھا، اور شاید آخری بار بھی کہ اپنے پر ڈھائے گئے ظلم انھوں نے خاموشی سے سہارے اور کہیں بھی غیض و غضب کا شائبہ نظر نہیں آیا اس وقت زینب بیقرار ہو کر کہتی ہیں ؎

غصہ ہے آج فاطمہ کے نور عین کو
للہ کوئی جا کے سنبھالو حسین کو

"یہ آج" قابلِ غور ہے۔ ایک بھائی بچھڑ چکا ہے۔ دوسرے کی سلامتی کی فکر اور زیادہ ہوگئی ہے ؎

زخمی کہیں نہ ہو پسرِ ضیغمِ الٰہ — ہم بیکسوں کا اب وہی وارث وہی ہے شاہ
اک بھائی کو تو قتل کیا دشمنوں نے آہ — چھوٹان پہ بن گئی تو یہ گھر ہو گیا تباہ

اب تو حسن سے تا بہ قیامت جدائی ہے
ہے ہے یہی جہاں میں مرا ایک بھائی ہے

کئی سوتیلے بھائی بھی ہیں۔ زینب ان کو بھی بہت چاہتی ہیں مگر عورت کی یہ کمزوری دکھانے سے بھی انیسؔ منہ نہیں چراتے کہ حسینؑ سے جو محبت ان کو ہے اس کے اور بھی بہت سے وجوہ ہیں۔ مگر سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کے ماں جائے بھائی ہیں۔

شروع ہی سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ حسینؑ کی مشیر و صلاح کار ہی نہیں نصیحت کرنے والی بھی ہیں ؎

بابا کا صبر یاد کرو تم پہ میں نثار

اور ساتھ ہی یہ درد بھری ہدایت بھی کی جا رہی ہے ؎

لے جا کے ماں کے پہلو میں گاڑو غریب کو

حضرت زینب کی شادی اپنے عم زاد بھائی عبداللہ بن جعفر سے ہوئی تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اپنے چچا علیؑ مرتضیٰ کی صحبت میں رہے تھے اور ان سے کسبِ فیض کیا تھا۔ سخی اور بہادر تھے۔ زینب سے شادی کے بعد بھی وہ حضرت علیؑ کے پاس ہی رہے۔ چنانچہ شادی کے بعد زیادہ تر زینب میکے ہی میں رہیں اور بھائی کی صحبت و محبت کی دولت حاصل رہی۔ روایت ہے کہ ان کے چار بیٹے ہوئے جن میں سے دو عون و محمد واقعاتِ کربلا کے وقت ان کے

ساتھ تھے چونکہ عبداللہ واقعہ کربلا کے وقت بیمار تھے اس لیے یہ دونوں بیٹے حضرت زینب کے ساتھ گئے اور وہ باپ کے پاس مدینے میں رہے۔

بچے ہوئے تو ماں نے وہی محبت اور عقیدت بیٹوں کے دلوں میں بھی پیدا کی جو خود بھائی سے تھی ۔

فرزندوں پہ طفلی سے یہ تاکید تھی دن رات
ماموں کی غلامی میں رہو جوڑے ہوئے ہات

شاید بچے یہ سمجھیں کہ ہم بھی تو اسی خاندان کے ہیں۔ اس لیے بار بار ان کو حسینؑ کا اعلیٰ مرتبہ سمجھایا جاتا ہے

محبوب الٰہی کے برابر انھیں سمجھو — ہم مرتبۂ حیدر صفدر انھیں سمجھو
صدقے گئی سب خلق سے بہتر انھیں سمجھو — آقا انھیں، مالک انھیں، سرور انھیں سمجھو

ماں کی تعلیم و تربیت کا جو اثر بچے پر ہوتا ہے وہ سبھی جانتے ہیں اور آج کے زمانے کے ماہرین نفسیات تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اس وقت سے اس کے خیالات اور احساسات کا اتنا گہرا اثر قبول کرتا ہے کہ زندگی بھر وہ اثرات اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتے۔ انیس ماہر نفسیات نہیں تھے لیکن انسانی سیرت کی باریکیوں کو جانتے اور ماں کی تعلیم و تربیت کے گہرے پائیدار اثر سے آگاہ تھے۔ وہ بار بار دکھاتے ہیں کہ عون و محمد نے ماں کی تربیت اور تعلیم کا کتنا اثر لیا تھا۔ ماں کی طرح ماموں اور ان کی اولاد پر فدا تھے۔

مدینے سے امام حسینؑ عازم سفر ہیں۔ زینب اپنے شوہر کی اجازت سے حسینؑ کے ساتھ جا رہی ہیں۔ اس وقت پہلی بار کلام انیس میں عون اور محمد نظر آتے ہیں۔ ان کی جدائی سے ان کے ہم جولی بے چین ہیں ۔

کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
گرمی کا مہینہ ہے سفر کے یہ نہیں دن

عون و محمد محبت سے جواب میں کہتے ہیں ؎

ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر

مگر آگے جو بات کہتے ہیں، وہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ معمولی لڑکے نہیں ؎

پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم بھائی ہیں، نہ کہ نوکر   ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر

وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ماموں پہ فدا ہوں

یہ مطلب نہیں کہ وہ آنے والے واقعات کے نشیب و فراز سے آگاہ ہیں۔ لیکن ماں نے بچپن ہی سے بچوں کے دل میں ماموں پر فدا ہونے کا جذبہ پیدا کیا ہے اور انھیں یہ احساس دلایا ہے کہ وہ وقت آ رہا ہے جب تمھاری محبت و وفا جرأت و ہمت کا امتحان ہوگا۔

حضرت زینب اور ہمسایہ عورتوں کی بات چیت سے ایک طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آنے والے واقعات کا اندازہ لگا چکی ہیں اور دوسری طرف اس پر روشنی پڑتی ہے کہ ان کی شخصیت کس قدر محبوب اور محترم تھی ؎

عورات محلہ چلی آتی ہیں بصد غم   کہتی ہیں یہ دن رحلت زہرا سے نہیں کم

غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہیں زینب
ہر اک سے گلے ملتی ہیں اور روتی ہیں زینب

یہ عورتیں جانتی ہیں کہ زینب کا حسینؑ پر کس قدر اثر ہے ؎

لے لے گئے بلائیں یہی سب کو فکر یہ   سمجھا نہیں بھائی کو اے زینب دلگیر

اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر

زینب کہتی ہیں ؎

بی بی ہمیں یثرب سے لیے جاتی ہے تقدیر

اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر   یہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیر

اپنے وطن، گھر، سہیلیوں اور عزیزوں سے عورت کو کتنا گہرا لگاؤ ہوتا ہے

یہ سب جانتے ہیں ؎

مجھ کو بھی غم ایسا ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتی

مگر سب چھوڑنے پر جو محبت مجبور کر رہی ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے ؎

بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

دلیل کا وزن دیکھیے ؎

گھر بھائی سے تھا، بھائی نہ ہوگا تو کہاں گھر

دو بہنیں ہیں ماں جائیاں اور ایک برادر   رسّی سے بندھیں ہاتھ کہ بلوے میں کھلے سر

جو ہوئے سو ہو بھائی کے ہمراہ ہے زینب

اس کوچ کے انجام سے آگاہ ہے زینب

اس آگاہی کی یہ وجہ بھی ہے کہ اس کے نانا اس آنے والے حادثے کی خبر دے چکے ہیں۔ اور یہ عاقل و زمانہ شناس بھائی نے بہن کو اندازہ کرا دیا ہے کہ جس حادثہ کی خبر بچپن میں مل چکی ہے وہ قریب آن پہنچا ہے۔

مدینے سے روانگی کے وقت کا جو نقشہ انیسؔ نے کھینچا ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ ان کا خاندان اور مدینے میں کیا وقار تھا۔ پہلے تو یہ آواز بلند ہوتی ہے ؎

باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے

مریم سے سواحق نے شرف ان کو دیئے ہیں   افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

اور پھر جب ؎

آپہنچی جو ناقے کے قریں دخترِ حیدر خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبطِ پیمبر
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر تھے پردۂ محمل کو اٹھائے علی اکبر
فرزند کمر بستہ چپ و راست کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

پھر شاعر گریز کر کے بعد شہادت حسینؑ زینب کی سواری کا دردناک حال دکھا کر اس تضاد و انقلاب کا چند مصرعوں میں نقشہ کھینچ دیتا ہے جو انھیں پیش آیا ؎

اک دن تو مہیا تھا یہ سامان و سواری اک روز تھا وہ گرد تھے نیزے لیے ناری
محمل تھا نہ ہودج نہ کجاوہ نہ عماری بے پردہ تھی وہ حیدرِ کرّار کی پیاری
ننھے کئی بچوں کے گلے ساتھ بندھے تھے
تھے بال کھلے چہروں پہ اور ہاتھ بندھے تھے

مدینے میں امام حسینؑ کے بعض دوستوں اور عزیزوں کو خیال تھا کہ یہاں ان کی جان محفوظ ہے اور باہر جانے میں خطرہ ہے۔ زینب کے شوہر عبداللہ کا بھی یہی خیال تھا۔ مگر امام حسینؑ کے سمجھانے پر وہ خاموش ہو گئے۔ اور نہ صرف بیوی کو اجازت دی بلکہ اپنے لڑکوں کو بھی امام کی حمایت کے لیے ساتھ کر دیا۔ ابن حنفیہ امام حسینؑ کے ایک سوتیلے بھائی بھی اس سفر کے خلاف تھے۔ ان لوگوں کی نظر حسینؑ جیسی گہری نہ تھی اور نہ واقعات پر ان کی گرفت اتنی مضبوط تھی، جتنی امام حسینؑ اور زینب کی۔ مدینے سے روانگی کے بعد راستے میں ابن حنفیہ امام حسینؑ سے ملے اور ان کو آگے جانے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن ان کو اپنے ارادے میں اٹل پا کر اصرار کرتے ہیں ؎

ناموس کو چھوڑو یہیں اے حضرتِ شبّیر حرمت سے حرم میں رہیں تا صاحبِ تطہیر
انھیں سب سے زیادہ فکر اپنی بڑی محترم بہن کی ہے ؎

پردیس میں کیا جانیئے کیا جور و جفا ہوں
ڈر ہے کہیں زینب نہ گرفتار بلا ہوں

زینب جو محمل میں بیٹھی دونوں بھائیوں کی باتیں سن رہی ہیں اب ضبط نہیں کر پاتیں۔ چھوٹے بھائی سے دردناک لہجے میں شکوہ کرتی ہیں ے

کی تم نے سفارش مری کیا آہ برادر
بھائی سے چھڑاتے ہو مجھے واہ برادر

عزم کا یہ اظہار دیکھیے ے

بھائی کے لیے ماں کی لحد چھوڑ کے آئی	رہنے کی نہیں حیدرِ کرّار کی جائی
مر جاؤں گی بچھڑے گا جو مجھ سے مرا بھائی	نانا کے بھی روضے سے ہوئی مجھ کو جدائی

ہمراہ میں کاٹوں گی مصیبت کے سفر کو
تنہا نہیں چھوڑوں گی محمدؐ کے جگر کو

میں علیؑ جیسے بہادر کی بیٹی ہوں جو کسی بات سے نہیں ڈرتی۔ جس کا ارادہ اٹل ہے اور محمدؐ کے لختِ جگر کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی یعنی یہ جذبہ صرف بھائی بہن کی محبت ہی کا نہیں ہے بلکہ فاطمہؑ و محمدؐ کے لختِ جگر کی حفاظت و حمایت کا بار بھی تو ہے ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا جاتا ہے کہ تم نہ جانو مگر زینب سمجھتی ہے کہ کیا کیا خطرات اسے پیش آسکتے ہیں ے

وہ شہر ہے جس بَن میں ہو زہرا کا گل اندام	اب گھر سے ہے مطلب نہ مدینے سے مجھے کام
بھائی تجھے معلوم ہے اس کوچ کا انجام	میں یاں نہ رہوں گی مرے رہنے کا نہ لو نام

بابا نے مرے ہاتھ میں ہاتھ ان کا دیا ہے
اماں نے مجھے بھائی کے ہمراہ کیا ہے

اور اب عظیم امانت کی حفاظت ہی زینب کی زندگی کا مقصد ہے۔ مگر یہ

کہتے کہتے نسوانیت غالب آجاتی ہے ؎

یہ کہہ کے جو روئی اسداللہ کی پیاری
ابن حنفیہ کے بھی آنسو ہوئے جاری

امام حسینؑ آگے بڑھتے ہیں راستے میں انھیں اپنے سفیر (جو چچازاد بھائی، اور بہنوئی بھی ہیں) مسلم بن عقیل کے شہید ہونے کی خبر ملتی ہے۔ لیکن اس خبر کے سننے کے بعد بھی سفر جاری ہے۔ منزلِ شہادت نزدیک آتی جاتی ہے باہر کی ذمہ داریاں حسینؑ، عباس اور علی اکبر سنبھالے ہیں۔ مگر عورتوں و بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی ڈھارس بندھانا زینب کے فرائض میں ہے گویا پہلا سبق رل رہا ہے اس کام کا جو آگے چل کر تنِ تنہا انجام دینا ہے ؎

کہتے تھے قریں ناقوں کے جاکر شہ ابرار اے بنت یداللہ سکینہ سے خبردار
رستہ یہ پہاڑوں کا ہے منزل یہ کڑی ہے
بچوں کو چھپائے رہو لوں آج بڑی ہے

بہن بھائی کو دیکھتی ہے تو جیسے جان میں جان آجاتی ہے ؎

محمل سے نظر کرکے یداللہ کی جائی کہتی تھی کہ اللہ نے یہ شکل دکھائی
جس دن سے چھٹا گھر کہیں راحت نہیں پائی قربان بہن دھوپ میں سنولا گئے بھائی

منزل کرب و بلا قریب آرہی ہے۔ دوران سفر میں محرم کا چاند نظر آتا ہے چاند دیکھنے کے بعد زینب کی کیفیت میں ہندوستانی مسلمان عورت کی جھلک دیکھیے جس کا ذکر انیسؔ نے بڑے دلکش انداز میں کیا ہے۔ فضہ خیمے کے در سے اکبر سے کہتی ہے ؎

لو دیکھ چکیں چاند یداللہ کی پیاری
آنکھوں کو کیے بند یہ فرماتی ہیں واری

آئے تو رخِ اکبرِ ذی قدر کو دیکھوں
شکلِ مہِ نو دیکھ چکی بدر کو دیکھوں

یہ سن کر ؎

شہ داخل خیمہ ہوئے فرزند کے ہمراہ   منہ دیکھ کے یوں کہنے لگی بنت یداللہ
یہ چاند ہے کس طرح کا اے فاطمہ کے ماہ

امام حسینؑ بہن کو آنے والے مہینے کی مصیبتوں سے آگاہ فرماتے ہیں ؎

یہ آلِ نبی کی ہے مصیبت کا مہینہ   یہ ظلم کا عشرہ ہے یہ آفت کا مہینہ
پہنچا ہے غریبوں کی شہادت کا مہینہ   آخر ہے بس اب عمر کی مدت کا مہینہ
سر تن سے مرا اس مہ پُر غم میں کٹے گا
زینب یہ مہینہ تمھیں ماتم میں کٹے گا

اس سارے بند کا ماحصل یہ آخری مصرعہ ہے۔ بعض وقت تفصیل سے اختصار زیادہ پر اثر ہوتا ہے۔ ایک بار ایک صاحبِ ذوق نے انیسؔ کے ایک مشہور مرثیے کے مطلع کا پہلا مصرعہ ؎ آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے۔ سن کر کہا تھا، انیسؔ نے ناحق اتنا بڑا مرثیہ کہا یہ ایک مصرعہ پورے پورے مرثیوں پر بھاری ہے۔

محرم کی ۲ تاریخ کو حسینی قافلہ کربلا کے میدان میں پہنچا اور امام حسینؑ کے حکم سے وہاں پڑاؤ ڈالا گیا۔ عباس نے امام سے پوچھا کہ :۔

خیمے کہاں بپا کریں یا شاہ بحر و بر

تو حسینؑ کہتے ہیں ؎

زینب جہاں کہیں وہیں خیمے کرو بپا

بڑے بھائی کو بہن کے رائے کی اصابت کا یہ احساس ہے اور چھوٹے کے

دل میں یہ احترام ہے

پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباس با وفا — جاکر قریب محمل زینب یہ دی صدا
حاضر ہے جاں نثار امام غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

زینب کے جواب میں اگرچہ انکسار کا عنصر ہے۔ جنگی مصلحتوں سے ناواقفیت کا اظہار بھی ہے۔ مگر یہ صائب مشورہ دینے سے گریز نہیں کرتیں کہ سب کے آرام کا لحاظ رکھ کر خیمے لگاؤ ے

بولی یہ سن کے دختر خاتون روزگار — اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل میں نثار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار — ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار
مختار کائنات کے تم نور عین ہو
اترو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

دونوں بھائیوں کی آپس کی محبت کا پورا احساس ہے ے

عاقل ہو تم تو نام خدا اے علی کے لال — مجھ سے زیادہ بھائی کی راحت کا ہے خیال
دریافت کر لو پہلے کسی سے یہاں کا حال — واری کسی طرح کا نہ آقا کو ہو ملال

"آقا" کہہ کر یہ ظاہر کر دیتی ہیں کہ امام میرا تمھارا دونوں کا آقا ہے۔ ساتھ ہی سفر کی صعوبتیں یاد آجاتی ہیں مگر ہر بات ثابت کر رہی ہے کہ یہ احساس اپنے نہیں حسینؑ اور ان کے بچوں کے دکھ کا ہے ے

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہے گھر — کن آفتوں میں چار مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر — دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
اندیشے دبائے نہیں دبتے ے

آج اس زمین پر ہمیں لایا ہے آسماں — اب دیکھیے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں

آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں — یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں

دشمن بہت ہیں بادشہِ خوش خصال کے

بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

زمین اور آسمان کی رعایتِ لفظی تک کتنی فطری ہے۔ چوتھے اور چھٹے مصرعوں کا اندازِ بیان کتنا پراثر اور روزمرہ کے مطابق ہے ؎

بھائی سے اس زمیں کی سنی ہے بہت صفت

ہے وہ امامِ واقفِ اسرارِ شش جہت

یعنی اصل رائے تو خود حسینؑ کی ہے لیکن سن اور تجربے کا بھی احترام کرنا چاہیے

جو جو مسن ہیں ان سے بھی لازم ہے مصلحت — صدقے گئی حبیب[1] سے بھی کرلو مشورت

ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو

بھیّا مجھے یہ ڈر ہے کہ ردّ و بدل نہ ہو

اور یہ اندیشہ فوراً ہی سامنے آجاتا ہے۔ فوج یزید کا پہلا دستہ کربلا میں داخل ہو کر حسینؑ کے خیمے دریا کے کنارے نصب کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ عباس مقابلے کے لیے تیار ہیں مگر امام حسینؑ انھیں منع کر دیتے ہیں۔ زینب محل سے یہ سب دیکھ کر بھائیوں کی جان کی فکر میں لرز رہی ہیں ؎

ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال — کہہ دے کوئی کہ اے اسدِ کبریا کے لال

قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو

میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصّے کو تھام لو

احساس ہے کہ عباس، علیؑ کا بیٹا ہے۔ اس کا غصہ بھی حق پر ہے مگر مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت غصہ روک لیا جائے ؎

[1] حبیب ابن مظاہر امام حسینؑ کے دوست تھے اور رسول اللہ صلعم کے صحابی بھی کہے جاتے ہیں۔

عباس تم تو ساقیِ کوثر کے ہو پسر   یہ نہر کیا ہے جس کے لیے رنج اس قدر

پھر تڑپ کر یہ کہنا ؎

مر جاؤں گی سفر میں جو بچھڑوں گی بھائی سے

اور ہر حال میں راضی بہ رضا رہنے کا یہ عزم ؎

جنگل مجھے پسند ہے گذری ترائی سے

دریا کو روکتے ہیں اگر بانیِ ستم   جلتی زمیں پہ بچوں کو لے کر رہیں گے ہم

غربت زدوں پہ چاہیے اللہ کا کرم   پھر آؤ بس سکینہ کے سر کی تمھیں قسم

پہلے جو اندیشے تھے وہ اب یقین میں بدلتے جا رہے ہیں ؎

ثابت ہوا کسی کو ہماری ولا نہیں

پانی بھی اب نہ دیں تو ہمیں کچھ گلا نہیں

"کچھ گلا نہیں" میں کتنے گلے چھپے ہیں۔ اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو اُردو کے روزمرہ اور عورتوں کے محاوروں سے واقف ہو۔

امام حسینؑ سمجھا بجھا کر عباس کو خیمے میں واپس لاتے ہیں تو ؎

زینب لپٹ کے رونے لگی چھوٹے بھائی سے

اور اب بڑی بہن کی چھوٹے بھائی سے گفتگو سنیے۔ روزمرہ اور محاوروں کی چاشنی اس گہری بے بناوٹ محبت میں اور زیادہ دلکشی پیدا کر دیتی ہے ؎

کیا جی میں آگئی تھی یہ بھیّا بہن نثار   صدقے کروں وہ نہر لڑیں جس پہ نابکار

پیارا رہے انھیں جنھیں پانی عزیز ہے

بھیّا ہمیں تمھاری جوانی عزیز ہے

صبحِ عاشور محمدؐ کا علم باہر نکلتا ہے۔ سب منتظر ہیں کہ دیکھیں کون علمدار چنا جاتا ہے، زینب بیٹوں کی علم کی خواہش پر کہتی ہیں ؎

چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹوں کے برابر

بگڑوں گی گلہ گر کسی اسلوب کروگے عباس سے کیا تم مجھے محجوب کروگے

جب بیٹے میدانِ جنگ کو سدھارتے ہیں تو اس وقت عباس سے کہتی ہیں ؎

اپنے غلام سمجھو انھیں تم پہ میں نثار

پہلے پہل نکلتے ہیں گھر سے یہ گلعذار

اس سے بھائی پر اٹل بھروسے کا اظہار ہوتا ہے۔ عباس اور ان کی بیوی بھی ماں کی طرح ان کا احترام اور ان کی رائے کا پاس کرتے ہیں۔ روزِ عاشورہ جب سب دوست اور عزیز شہید ہو جاتے ہیں اور صرف عباس اور اکبر رہ جاتے ہیں، اس وقت بھی امام حسینؑ عباس کو جنگ کی رضا نہیں دیتے۔ عباس حسینؑ سے کہ جو امام اور آقا ہیں بحث نہیں کر سکتے۔ مگر زینب کو ماں کی جگہ سمجھتے ہیں اور ماں سے تو ضد بھی کی جا سکتی ہے۔ شکوے کا انداز کتنا حقیقی ہے ؎

بنتِ علی کے پاس جو پہنچا وہ سیم بر ماتم کی صف پہ رکھ دیے ہتھیار کھول کر

بہن یہ دیکھ کر حیران ہے کہ فوج کا علمبردار سب سے بڑا بہادر سپاہی ہتھیار کیوں کھول رہا ہے ؎

عباس کیا ہے کھولتے ہو کس لیے کمر

دل میں آشا کا ننھا سا دیا جل اٹھتا ہے ؎

اب تو کوئی لڑے گا نہ بیکس امام سے کیوں بھائی صلح ہو گئی کیا فوجِ شام سے

لیکن عباس کی بے قراری اور گریہ وزاری پریشان کر دیتی ہے۔ عباس بہن سے شکایت کرتے ہیں۔ ایسی شکایت جو محبت و وفا کی تفسیر کہی جا سکتی ہے ؎

مجھ کو حسینؑ مرنے کی دیتے نہیں رضا

میرا نہیں خیال شہِ خاص و عام کو دیجیے نجف میں جانے کی رخصت غلام کو

زینب پر صورتِ حال واضح ہو جاتی ہے۔ سمجھ رہی ہیں کہ آج جو معرکۂ حق و باطل برپا ہوا ہے اس میں کوئی نہ بچے گا، نہ عباس، نہ حسینؑ۔ مگر دل چاہتا ہے جہاں تک ہو سکے، جب تک بن پڑے، نبی کے نواسے، زہرا کے لال، امامِ وقت کو بچایا جائے۔ چھوٹے بھائی کی یہ دل شکستگی دیکھی نہیں جا رہی ہے۔ بڑے بھائی کے حال پر الگ کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ کس کو سمجھائیں، کس کی سی کہیں۔ اس کشمکش کو انیسؔ نے کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

کیونکر کہوں کہ بھائی کو مرنے کا اذن دو　　　اچھا بلا کے کہتی ہو آگے جو ہو سو ہو

رونا اِدھر اُدھر کو غش بھی و یاس ہے
ان کا بھی درد ہے مجھے ان کا بھی پاس ہے

مشکل مجھے ہے کس سے کہوں اپنا حالِ زار　　　وہ ماں کی جان و روح یہ بابا کی یادگار
بیکس بہن سے پوچھے کوئی بھائیوں کا پیار　　　کیونکر جئیں گے ہائے شہنشاہِ نامدار

اپنی حالت اور صدمے سے زیادہ فکر بھائی کی ہے کہ دونوں کی گہری محبت سے واقف ہیں اور یہ بھی جانتی ہیں کہ انسانی رشتوں میں یہ سب سے پیارا، سب سے زیادہ خلوص و محبت کا رشتہ ہے ؎

کہتے ہیں موت خلق میں سب اس جدائی کو　　　یارب مفارقت نہ ہو بھائی سے بھائی کو

اس سادہ، سہل بے بناوٹ انداز میں فصاحت و بلاغت درد و غم کی کتنی بڑی دنیا چھپی ہے

مگر یہ بھی جانتی ہیں کہ اس بہادر کو شہادت کی سعادت اور رن کی رضا ملنا ہی چاہیے۔ یہ اس کا حق ہے۔ حسینؑ کے خیمے میں آتے ہی عباس کی سفارش کی جاتی ہے ؎

صدقے بہن ہو بھائی انھیں دیجیے رضا

کیوں رضا دیجیے ؂

دنیا میں اور بھی ہے کوئی ایسا باوفا

ان کی صفات کا بھی بیان ہو رہا ہے ؂

مثلِ علی جہاں کے شجاعوں کے تاج ہیں

اور پھر کس درد اور پیار سے کہا جا رہا ہے ؂

ظاہر ہے آپ پر کہ یہ نازک مزاج ہیں

نیت سفر پہ باندھی ہے ہتھیار کھول کر   بہنوں کی بیکسی پہ بھی اب تو نہیں نظر

دل مان نہیں رہا، زبان اٹھ نہیں رہی، مگر بڑی بہن کا فرض تو ادا کرنا ہی ہے ؂

کیونکر زباں سے اپنی کہوں میں جگر فگار   ضد ہے یہی کہ جلد ملے اذنِ کار زار

صفدر ہیں جان دینے کو کچھ جانتے نہیں

غصے میں یہ تو بات کوئی مانتے نہیں

یعنی میں نے تو سمجھا بجھا کر بھی دیکھ لیا اب تو انھیں جہاد کی رضا دینی ہی پڑے گی۔ اگر وہ کہتیں کہ آخر سبھی جانباز جہاد پر جا رہے ہیں۔ جامِ شہادت پی رہے ہیں۔ پھر آپ انھی کو اس سعادت سے کیوں محروم رکھتے ہیں۔ تو یہ حقیقت پسندی، موقع شناسی، دانشمندی کی باتیں ہوتیں۔ ایک چاہنے والی بہن کے جذبات و احساسات کی ترجمانی نہ ہوتی۔ بات وہی ہے مگر انداز میں عورت کے نازک و اعلیٰ جذبات کس طرح بول رہے ہیں۔ جس میں بھائیوں کی محبت بھی ہے اور ان کی شجاعت، حق پرستی پر ناز بھی۔

کربلا کے معرکہ حق و باطل میں حسینی قافلے کی نو ماؤں نے اپنے سپوتوں کو حسینؑ پر قربان کیا۔ اور ہر ایک نے قربانی و صبر کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ زینب نے بھی اپنے دو بیٹے راہِ خدا میں نثار کیے مگر ماں کی حیثیت سے زینب کا کردار جس

طرح ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ان کی شخصیت کی انفرادیت اور عظمت کا گواہ ہے عزم و ارادے کی مضبوطی، صبر و رضا کی کیفیت، حق کی خاطر قربانی کا بے پناہ جذبہ جو اس ہستی میں نظر آتا ہے وہ مثالی ماں و مثالی عورت ہی کا نہیں مثالی انسان کا جلوہ دکھا رہا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ ماں کی گہری محبت اور ممتا کے فطری اور مقدس جذبے کی کمزوری یعنی گریہ و ماتم سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔

انیسؔ ہمیں زینب کے کردار کی یہ عظمت اور یہ کمزوری دونوں دکھاتے ہیں جو ان کی شخصیت میں اور زیادہ دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ انیسؔ کے کلام میں زینب کا رول بحیثیت ماں کے ملاحظہ کیجیے :۔

عاشور کی صبح فوجِ حسینی کا علمبردار چُنا جاتا ہے۔ اس علم کے پہلے علمبردار رسول اللہ کے چچازاد بھائی جعفر طیار (عون و محمد کے دادا) دوسرے علمبردار علی مرتضیٰ (عون و محمد کے نانا) تھے۔ ایسے ہی کسی شخص کو حسینی فوج کا علم سونپا جانا تھا، جو اپنے بزرگوں کی طرح بہادر، جاں باز ہو۔ زینب کے بیٹے کم سن بیٹے ہیں مگر دل میں شجاعت کے ولولے ہیں اپنے بزرگوں پر ناز ہے۔ وہ نانا دادا کے ورثہ دار ہونے کے خواہشمند ہیں۔ اس پرچم کو بلند کر کے ماموں کے ساتھ جہاد میں شرکت اور ان پر جان نچھاور کر کے ماں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ عَلَم کے آس پاس پھر رہے ہیں ؎

تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے زینب کے لال زیرِ عَلَم آ کھڑے ہوئے
جعفر کا رعب دبدبۂ شیر کردگار
بوٹا سے ان کے قد پہ نمودار نامدار

آپس میں مشورہ بھی کیا جا رہا ہے کہ یہ حق تو ہمارا ہے کیا اس کے لیے ماموں جان سے کہیں ؎

زینب کے پسر کرتے تھے یہ مشورہ باہم — کیوں بھائی علم لینے کو ماموں سے کہیں ہم
تائیدِ خدا چاہیے گو عمر میں ہیں کم — عہدہ تو ہمارا ہے یہ آگاہ ہے عالم

واقف ہیں سبھی حیدر و جعفر کے شرف سے
سچ پوچھو تو حق دار ہیں ہم دونوں طرف سے

چھوٹا بھائی حالات کے نشیب و فراز کو کیا سمجھے ؎

دادا بھی علمدار ہے نانا بھی علمدار — ہم اپنے بزرگوں کے ہیں منصب کے طلبگار

مگر بڑا بھائی سمجھتا ہے کہ ماں ہم سے کیا چاہتی ہیں ؎

کہتا تھا بڑا عرض کا موقع نہیں زنہار — ہیں بادشہِ کون و مکاں مالک و مختار

عہدہ تو بڑا یہ ہے کہ ماموں پہ فدا ہوں
چپکے رہو اماں نہ کہیں سن کے خفا ہوں

ماں بچوں کی باتیں سن لیتی ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں کنبے میں کوئی اور نہ سن لے۔ حسینؑ کو شبہ نہ ہو جائے کہ بھانجے منصب کے طلبگار ہیں۔ عباس کے کان میں بھنک نہ پڑ جائے۔ غصہ سے کہتی ہیں ان کو اشارے سے اندر بلا لائے

کچھ کہنا ہے سن لیں اسے فرصت انھیں گر ہو
عباس نہ دیکھیں نہ شہِ دیں کو خبر ہو

"فرصت انھیں گر ہو" میں ناراضگی ہے۔ شکایت ہے کہ انھیں بھلا اتنی فرصت کہاں کہ ماں کے پاس آئیں ؎

کہتی تھی یہ زینب کہ خود آئے وہ نکوکار — چھوٹے سے یہ فرمانے لگیں زینبِ ناچار
کیا باتیں ابھی بھائی سے تھیں اے مرے دلدار — اس وقت میں ہو کون سے منصب کے طلبگار

سمجھے نہ کہ مادر عقبِ پردہ کھڑی ہے
گھر لٹتا ہے میرا تمھیں منصب کی پڑی ہے

شروع میں انداز دھیما ہے۔ "میرے دلدار" کہہ کر دلداری بھی کی جا رہی ہے مگر رفتہ رفتہ غصہ بڑھتا جا رہا ہے ؎

بچو! تمھیں ایسا نہ سمجھتی تھی میں زنہار
اللہ بڑا عزم کیا باندھ کے تلوار
کیا دخل تمھیں امر میں سلطانِ امم کے
دیکھوں گی نہ پھر منہ جو گئے پاس علم کے

یہ ملامت، یہ غصہ، یہ حکم یہ اپنا حق منوانے کا یقین صرف اسی ماں کو ہو سکتا ہے جس کو اپنی دی تربیت پر یقین اور اپنے بچوں پر پورا بھروسہ ہو کہ وہ اس کے حکم پر سر جھکانا اور اشارے پر جان دینا فرض و سعادت جانیں گے ؎

تم کون ہو جو آگے بڑھے جاتے ہو سب سے
کچھ اور بھی تیور ہیں علم نکلا ہے جب سے
عہدہ ہے یہ جس کا مجھے معلوم ہے کب سے
استادہ ہو جا کر عقبِ شاہ ادب سے
اس امر میں خاطر نہ کریں اور کسی کی
خوش ہوں میں بجا لائیں وصیت کو علی کی

مگر ماں کا دل دکھ بھی رہا ہے کہ بچوں کو رنج ہوگا۔ ناراضگی کا رخ آہستہ آہستہ نصیحت کی طرف مڑ جاتا ہے ؎

کھیل اس کو نہ سمجھو یہ محمدؐ کا علم ہے
چھوٹے سے ہیں قد سن بھی تمھارا ابھی کم ہے
ہرگز نہ ابھی کچھ شہِ ذی جاہ سے کہنا
کہنا بھی تو رخصت کے لیے شاہ سے کہنا

دبی زبان سے یہ بھی کہہ جاتی ہیں ؎

مانا کہ پہنچتا ہے تمھیں منصبِ جعفر
آقا کی غلامی ہے عہدہ کوئی بڑھ کر

ایک اور مرثیے میں انیس نے اس موقع کی مرقع کشی اور زیادہ پر اثر انداز میں کی ہے ؎

سب خوش تھے خیمۂ شہِ ذی جاہ میں مگر
چیں بر جبیں تھے زینبِ ناشاد کے پسر
نے جانبِ علم تھی نہ ماں کی طرف نظر
آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر
اس طرح تھا عرق رخِ پُرآب و تاب پر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

پھر کر ادھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر
سمجھی علم نہ ملنے سے بے دل ہیں یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا ادھر
آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر
بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
قربان جاؤں کیا ہے جو چہرے اداس ہیں

دلداری ہے، معذرت ہے کہ یہ قیامت کا دن ہے میرے ہوش و حواس ٹھیک نہیں۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ مجھے تمہارا خیال نہیں یعنی سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھنے کا انداز ہے

ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہ حق شناس
تم نے نہ زیبِ جسم کیے فاخرہ لباس
مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس
دولہا سے بن کے آؤ امامِ امم کے پاس
پھر جیسے ممتا ابل پڑتی ہے ے
کچھ ملگجے ہیں آؤ میں کپڑے اتار دوں
سرمہ لگا دوں گیسوئے مشکیں سنوار دوں

مگر بچے روٹھے ہوئے ہیں۔ ماں کو صدمہ ہوتا ہے کہ بچے اس کی حالت اور مصیبت نہیں سمجھ رہے ہیں۔ عورت کی فطری کمزوری کہ اپنے پیاروں سے چاہے وہ کم سن بچے ہی ہوں چاہتی ہے کہ وہ اس کا دکھ درد محسوس کریں ے

ماں پر یہ آفتیں ہیں یہ ماموں پہ ظلم و جور
پیارو! ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور
نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور
اب مشورے ہیں اور تصور ہیں اور اور

اوروں کا ذکر کیا تمھیں اپنی خبر نہیں
وہ دل نہیں، وہ آنکھ نہیں، وہ نظر نہیں

آخری شعر ثابت کر رہا ہے کہ ان سے زیادہ بچوں کی ذہنی کیفیت کو کون سمجھ سکتا ہے ؎

اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیے گی ماں — ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں — مجھ سے سوا ہے کون تمھارا مزاج داں

پھر جیسے بے ساختہ منہ سے نکل جاتا ہے ؎

جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
غصے کی آنکھ کا ہے کو پہچانتی ہوں میں

"کاہے کو پہچانتی ہوں میں" روزمرہ کی شکایت کا کتنا حسین انداز ہے۔ خیال آتا ہے کہ شاید سب کے سامنے حالِ دل کہنے سے جھجک رہے ہیں تو ؎

پردہ ہے تو سناؤ الگ چل کے دل کا حال

بچوں کو رنج ہے شکایت ہے اس کا حال پہلے ہی مصرع میں کھل جاتا ہے ؎

دونوں نے عرض کی نہیں کچھ نہیں ملال
ہاں آج ہم کو بھول گئے شاہِ خوش خصال — اوروں کی پرورش ہے ہمارا نہیں خیال
کیا وارثِ دارِ جعفرِ طیار ہم نہ تھے
اس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

بچوں سے یہ سن کر ماں کا ردِ عمل کتنا فطری اور بے ساختہ ہے ؎

انگشت رکھ کے ہونٹوں پہ ماں نے کہا کہ ہا — اب اس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا
دیکھو سنیں نہ زوجۂ عباسِ باوفا — اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گلے کی جا

پھر یہ سمجھانا ؎

داری وہ کون غیر ہیں تم کون غیر ہو

کتنی سیدھی سادی کتنی فطری جذبات نگاری ہے۔ ایسی مثالیں خود انیس کے یہاں بھی کہیں کہیں ہی ملیں گی۔ یہ ماں بول رہی تھی۔ اب علیؑ کی بیٹی حسینؑ کی بہن کی گفتگو سنیے۔ جو آج کے معرکے کے انجام کو آنکھوں سے دیکھ رہی ہے ؎

اک دو پہر کے واسطے ناحق یہ قیل و قال
تا عصر تم نہ ہوگے نہ عباس خوش خصال
اس دن کی دے گئے ہیں خبر شیرِ ذوالجلال
مجھ کو نہیں یقیں کہ بچے فاطمہ کا لال
پیدا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے
رہ جاؤں گی میں قید میں جانے کے واسطے

ہونہار لڑکوں کے دل میں ماں کی باتیں اترتی چلی جاتی ہیں ؎

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال
ہم با وفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال
دیجے سزا ہمیں جو بل ابرو پہ پھر پڑیں
کہیے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں

ادھر چھوٹے ماموں کو بہن کا پاسِ خاطر اور بھانجوں کی دلداری کا خیال دیکھیے کہ علم ملنے پر جب بہن مبارکباد دیتی ہیں تو کہتے ہیں ؎

مجھ کو سمجھیے عون و محمد کا جاں نثار
ان کی طرف سے ہم تم بند و بست ہوں
مالک یہ شاہزادے ہیں میں پیش دست ہوں

اس وقت بے اختیار ہو کر زینب کا حسینؑ کی سلامتی کے لیے یہ کہنا ؎

گھیرا ہے بے گناہ شہِ مشرقین کو
تم سب شریک ہو کے بچالو حسین کو

بلکہ یہ دعائیں اس امید موہوم پہ مبنی ہیں جو عورت کی فطری کمزوری ہے یعنی وہ اپنے پیارے کی جان بچ جانے سے آخری سانس تک مایوس نہیں

ہوتی - پھر بیٹوں سے مخاطب ہوتی ہیں۔ ان کی سعادت مندی کا اعتراف خالص مادرانہ شان سے کیا جارہا ہے ؎

زینب بلائیں لے کے یہ بولیں کہ میں نثار
دے ایسے لال سب کو زمانے میں کردگار

اب پورا اطمینان ہے کہ بچے راہِ حق میں جان دینے پر دل و جان سے آمادہ ہیں ؎

پہنائے پیار سے انھیں پھر فاخرہ لباس | ہتھیار جب لگائے تو رو دیں بہ درد و یاس
جب ان کو لے کے آئیں امامِ امم کے پاس | بولے گلے لگا کے انھیں شاہِ حق شناس

دو چاند ہیں یہ خانۂ شیرِ الٰہ میں
زینب انھیں بھی بھیجو گی کیا قتل گاہ میں

زینب نے امام حسینؑ پر اپنے بچوں کو قربان کیا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ مگر اس کی جزویات کو تخیل کی نظر سے اس شرح و بسط کے ساتھ دیکھنا شاعر کا کمال ہے۔ اس کا دل کہتا ہے کہ جب زینب کو بھائی بھتیجوں سے اتنی الفت تھی تو ان کو بھی بھانجوں سے بہت محبت ہوگی۔ تو وہ کربلا کی ان سچی کہانیوں میں اپنے مخصوص انداز میں ایسے رنگ بھرتا ہے کہ جیتی جاگتی زندگی کا نقشہ کھنچ کر سامنے آجاتا ہے۔

اس موقع پر بہت کچھ کہا جاسکتا تھا مگر جاں نثار بہن کے منہ سے یہی نکلتا ہے

رکھتی نہیں کچھ اور میں یا شاہِ بحر و بر | اک جان ہے بس اور یہ دو پارۂ جگر

مایہ مرا یہی، یہی دولت، یہی ہے زر

اور کیا درد و محبت کی ایک دنیا اس مصرع میں یہیں سمٹ آئی ہے

ان کو بچاؤں گر تو کسے پھر فدا کروں

بیٹوں کی سفارش بھی کی جارہی ہے۔ تعریف بھی درپردہ ہو رہی ہے اس اندیشے

کا بھی قبل از وقت ازالہ کیے دے رہی ہیں کہ کہیں حسینؑ انھیں کم سن سمجھ کر جہاد کی رضا نہ دیں۔ دنیا کی ہر ماں کی طرح ان کو بھی اپنے بیٹوں پر اعتماد ہے ناز ہے ہے

دادا[1] کا رعب و دبدبہ و شوکت و جلال — تیغ و سپر میں ہے شہِ مرداں کی چال ڈھال
کیجے نظر سنوں پہ تو بے شک صغیر ہیں
ہمت میں نو جوان ہیں متانت میں پیر ہیں

ثبوت بھی دیتی جاتی ہیں ہے

روتی تھی ہیں جو آج کی شب کو بہ درد و یاس — دونوں دلاسہ دینے کو آ بیٹھے میرے پاس
رو کر کہا کہ آپ کو اتنا ہے کیوں ہراس — آسان کچھ ہے قتلِ شہنشاہِ حق شناس
بچے ہیں شیر کے جنھیں بچہ سمجھتی ہیں
کیا آپ ماموں جان کو تنہا سمجھتی ہیں

اور پھر جاں نثاری کا یہ ولولہ ہے

سو سو کی جان لے کے ہر اک جان کھوئے گا — ہم سب کے بعد ہوگا جو قسمت میں ہوئے گا

فخر سے ماں سے کہا جاتا ہے ہے

خالی نہ جائیں گے یہ شجاعت یہ ولولے — رکھ دیں گے دوڑ دوڑ کے قدموں پہ خود گلے
ہم بھی ہیں بنتِ فاطمہ کے شیر کے پلے — مرتے ہیں شوق میں کہیں تلوار تو چلے
چمکا کے نیچوں کو جو کھیلیں گے جان پر
لاشے زمیں پہ ہوں گے لہو آسمان پر

مگر بچوں کی ان باتوں میں کس کی آواز ہے، یہ چھپا نہیں رہتا۔ حسینؑ بہن سے بھانجوں کے عزم و شجاعت کا بیان سنتے ہیں تو ہے

فرمایا شہ نے ان کی شجاعت میں فرق کیا — ہیں وارثِ دارِ شیرِ الٰہی یہ مہ لقا

[1] حضرت علیؑ

اچھا ہمارے ساتھ چلے ایک دل ربا　　زینب تمہارے پاس رہے ایک مہ لقا

تم کس طرح جیو گی جو دونوں سے یاس ہو
گھر لٹتے وقت ایک تو فرزند پاس ہو

لیکن زینب کی آرزو ہے کہ ؎

دونوں نثار آپ پہ ہوں میرے روبرو

اور صرف یہ ان کی آرزو ہی نہیں ہے بلکہ وہ بچوں کی آپس کی محبت اور دوستی سے بھی آگاہ ہیں ؎

طفلی سے آج تک نہ ہوئے یہ کبھی جدا　　کھیلے تو ایک گھر میں پلے یہ تو ایک جا
چرچا ہے سارے کنبے میں دونوں کے پیار کا　　بیشک ہیں ایک جان دو قالب یہ مہ لقا

تڑپے ملاپ کو جو خفا ہو کے بھائی سے
وہ کس طرح جیے گا جدا ہو کے بھائی سے

یہاں بچوں کی آپس کی محبت کا کتنا گہرا مشاہدہ اور زندگی ہی میں نہیں مرتے وقت بھی یک جا رہنے کی کتنی ارفع تمنا ہے ؎

چھوٹا تنک مزاج ہے یا شاہِ بحر و بر　　سن لے تو جان دے دے گلا اپنا کاٹ کر
نو دس برس جہاں میں ہوئے جس طرح بسر　　باہم یونہی جہاں سے کریں آخری سفر

ہر جا بڑے کے ہاتھ میں چھوٹے کا ہاتھ ہو
میں چاہتی ہوں دونوں کا مرنا بھی ساتھ ہو

اللہ اکبر ماں کی محبت کا کتنا مقدس مظاہرہ ہے اس کا احساس بھی ہے کہ ان کے شوہر حسینؑ کی نصرت کے لیے ساتھ نہیں آسکے۔ اس کی تلافی کرنا بھی ان کا فرض ہے ؎

باپ ان کا آج ہوتا جو اے شاہِ نامدار　　کرتا قدم پہ سر کو تصدق بہ افتخار

اک ان کے بدلے آپ کے قدموں پہ ہو نثار　　میرے عوض فدا کرے اک اپنی جانِ زار

ان پر ہمارا حق ہے تو ہم پر حق آپ کا
یہ بھی تو کچھ ادا کریں حق اپنے باپ کا

شوہر کی طرف سے عذر کیا جا رہا ہے ان کے نہ آنے کے وجوہ بیان کیے جا رہے ہیں ے

کرتے تھے مجھ سے وقتِ سفر رو کے یہ بیاں　　محروم اس شرف سے ہوں میں زار و ناتواں

وقت آ پڑے تو پاس ہمارا نہ کیجیو
بیٹوں کو تم حسین سے پیارا نہ کیجیو

تو ے

چپ رہ گئے بہن سے بہت خوب کہہ کے شاہ

یہ پہلی اجازتِ صبحِ عاشور بیٹوں کے لیے حاصل کی گئی تھی۔ جنگ چھڑی حسینؑ کے دوستوں، رفیقوں اور عزیزوں نے جہاد میں حصہ لیا۔ اور ظہر تک اپنی جانیں قربان کر دیں۔ وہاں شہادت کا بازار گرم ہے۔ یہاں زینب کا اضطراب بڑھ رہا ہے کہ اب تک عون و محمد میدانِ جنگ میں کیوں نہیں گئے۔ ادھر بھانجے بار بار ماموں سے رضائے جنگ مانگ رہے ہیں۔ ماں کا حوالہ دے کر اصرار کر رہے ہیں ے

اماں کا تو نازک ہے مزاج آپ ہیں آگاہ

عورت ہیں یہ خو بوئے شہِ مرداں کی ہے ساری　　شب کو بھی یہ فرمایا تھا ہم سے کئی باری

تم یہ نہ سمجھیو کہ میں عاشق ہوں تمھاری　　بھائی سے مجھے جان نہ اولاد ہے پیاری

کس کام کے پھر سر جو تصدق نہ کرو گے
تب دودھ میں بخشوں گی جو عزت سے مرو گے

حسینؑ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بھی نہ بچیں گے مگر محبت کا تقاضا ہے کہ جب تک بھی بچوں کو بچایا جا سکے بچائیں۔ بھانجوں سے کہتے ہیں ے

اکبر کو تو ہمشیر نے میں نے تمھیں پالا ۔۔۔ ماموں سے جدا ہوتے ہو جب ہوش سنبھالا

اب کون ہے غربت میں مرا کہنا ماننے والا ۔۔۔ دل کا کوئی ارمان بھی تم سے نہ نکالا

وہاں ماموں بھانجوں میں یہ باتیں ہیں۔ یہاں زینب اس حال میں ہیں ؎

سر زانو پہ تھا فکر میں اور لب پہ یہ تقریر ۔۔۔ محجوب کیا بیٹوں نے ہے ہے مری تقدیر

آنا ہے دمِ صبح سے یاں لاشے پہ لاشہ ۔۔۔ ان کے لیے اوروں کی لڑائی ہے تماشا

ماں غصے میں حقیقت پر غور نہیں کر رہی۔ مگر بانو عون و محمد کی ممانی

بچوں کی طرف سے صفائی پیش کرتی ہیں ؎

میداں کی رضا دیتے نہ ہوں گے شہِ والا ۔۔۔ آزردہ نہ ہوں آپ یہ غصے کی نہیں جا

اتنے میں درِ خیمہ سے فضہ کی آواز سنائی دیتی ہے ؎

لو میرے خوزادوں نے رضا جنگ کی پائی

اے بنتِ علی رو رہے ہیں آپ کے بھائی

تو یہ سنتے ہی ؎

اور خاک پہ سجدے کو جھکیں حضرتِ زینب

فرمایا کہ صد شکر بر آیا مرا مطلب ۔۔۔ عزت مرے بچوں کی ترے ہاتھ ہے یارب

بھاوج کہتی ہیں بچوں سے ایک بار پھر مل لیجیے ؎

بانو نے کہا دیکھ لو پھر ان کو بلا کر ۔۔۔ فرمایا نہیں آئیں گے خود برچھیاں کھا کر

اصرار کیا سب نے تو گردن کو جھکا کر ۔۔۔ فرمایا کہ اچھا کوئی کہہ آئے یہ جا کر

صدقے گئی کچھ کام ہے یا آکے سدھارو

سب کے اصرار پر تیار تو ہو گئی ہیں کہ ایک بار پھر لاڈلے بیٹوں کی صورت دیکھ لیں مگر جیسے اپنے سے ڈر لگ رہا ہے کہ صبر کا دامن نہ ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ "کچھ کام ہے" بڑی عام سی روزمرہ کی بات ہے مگر پھر بے اختیار منہ سے نکل جاتا ہے ؎

جاتے ہوئے شکلیں مجھے دکھلا کے سدھارو

تو کھل جاتا ہے کہ دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔

بچے ڈرتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں گلے سے لپٹا لیتی ہیں مگر مقصد کی لگن، بھائی کے عشق، بچوں کی شجاعت اور بہادری پر ناز کا حصار اپنے دل کے گرد کھینچ لیا ہے ؎

ماموں پہ فدا ہوتے ہو میں تم پہ فدا ہوں

لو آؤ کہ اب تو نہ میں غصے نہ خفا ہوں

بچوں کو کلیجے سے لگا کر عرب کی یہ بہادر ماں گریہ و زاری نہیں کرتی۔ کسی بے تابی و بے قراری کا اظہار بھی نہیں بلکہ بزرگوں کی شجاعت کی طرف اشارہ کر کے ان کی ہمت بڑھا رہی ہے ؎

اعدا کو مرے دودھ کی تاثیر دکھاؤ ۔ اجلال حسن، شوکت شبیر دکھاؤ

جعفر کی طرح جوہر شمشیر دکھاؤ ۔ تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھاؤ

خورشید امامت سے قرابت میں قریں ہو

تم شیر ہو، شیروں کے حسینوں کے حسیں ہو

جعفر سے نمودار کے دلبر ہو دلیرو ۔ حیدر سے دلاور کے دلاور ہو دلیرو

جرار ہو، کرار ہو، صفدر ہو، دلیرو ۔ ضرغام ہو، ضیغم ہو، غضنفر ہو دلیرو

یوں آئیو چار آئینہ پہنے ہوئے بر میں

جس طرح علی بعد ظفر آتے تھے گھر میں

یہاں انیس ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں ہندوستانی عورت کی جھلک نہیں دکھاتے۔ اس وقت جو عورت بول رہی ہے وہ علیؑ کی بیٹی، جعفر طیار کی بہو، حسنؑ اور حسینؑ کی بہن ہے۔ فکر ہے کہ بچے کئی روز کے بھوکے پیاسے ہیں کہیں

پیاس کی شدّت میں دریا کا رخ نہ کریں۔ کہیں بغیر حسینؑ اور ان کے بچوں کے اپنی پیاس نہ بجھالیں۔ مگر جو پانی حسینؑ پر بند ہے وہ زینب کے بچوں پر بھی حرام ہونا چاہیے۔ کس خوبصورتی سے منع کیا جا رہا ہے

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی ۔۔۔ گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی ۔۔۔ بجلی بھی گرے گر تو جھجکتے نہیں غازی

آفت میں حواس ان کے بجا ہوتے ہیں پیارو
جرّاروں کے تیور ہی جدا ہوتے ہیں پیارو

پہلے بہادری کے آداب شجاعت کے گُر بتائے جاتے ہیں تب دل کی بات زبان سے نکالتی ہیں۔ اندیشہ ہے کہ بچے بگڑ نہ جائیں کہ اماں ہم سے بدگمان ہیں اس لیے پیار سے خوشامد سے سمجھایا جا رہا ہے

ماں صدقے گئی گھاٹ پہ دریا کے نہ جانا ۔۔۔ پانی کی طرف پیاس سے گھبرا کے نہ جانا
ساحل پہ کبھی سرد ہوا پا کے نہ جانا ۔۔۔ صابر ہو تو رہواروں کو گرما کے نہ جانا

جس پانی کو ترسے اسد اللہ کا پیارا ۔۔۔ کیوں جاؤ ادھر نہر پہ کیا کام تمھارا
عاقل کے لیے کافی و وافی ہے اشارا ۔۔۔ گر آبِ بقا ہو تو مناسب ہے کنارا

بچوں کی کم سنی اور ناتجربہ کاری کا احساس کلیجہ ٹکڑے کیے دے رہا ہے مگر اس کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ بلکہ دونوں کو ساتھ رہنے کی ہدایت دی جا رہی ہے۔

بھائی کسی ہنگام میں بھائی کو نہ چھوڑے ۔۔۔ دونوں میں کوئی عقدہ کشائی کو نہ چھوڑے
جرأت کو جلالت کو لڑائی کو نہ چھوڑے ۔۔۔ ہمت کو مروّت کو بھلائی کو نہ چھوڑے

جو امر کہ مشکل ہے وہ دشوار نہ ہوگا
اک دل ہوئے جب دو تو کوئی چارہ نہ ہوگا

کیسی بہادر ہو گی وہ ماں جو بچوں کو جہاد اور شہادت پر یوں اُکسائے ؎

نیزوں کی طرف چھاتیاں تانے ہوئے جانا ہاں تیروں کی بارش میں سپر منہ پہ نہ لانا
ہنس ہنس کے ہیں قربان گئی برچھیاں کھانا لازم ہے وہ ہمت کہ معرّف ہو زمانا
اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہے گا
دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

بیٹوں کا جواب ماں اور بیٹوں دونوں کے شایانِ شان ہے ؎

دونوں نے کہا ہوگا یہی فضلِ خدا سے کیا بات ہے جیتے ہیں تو مر جائیں گے پیاسے
ہم اور نہیں کوئی، علی کے ہیں نواسے غافل نہ رہیں آپ غلاموں کی دعا سے
مر جائیں گے دنیا میں سدا کون جیا ہے
دودھ آپ کا ہم دونوں غلاموں نے پیا ہے

یہ تو بہادر نوعمر لڑکوں کے جوش و ولولے کا اظہار تھا مگر چاہنے والے بچوں کے دل کی حالت کیا تھی۔ ماں سے جدا ہوتے وقت ؎

مختار ہیں یوں آپ سزا دیں کہ خفا ہوں تب وقت ہے غصے کا جو وعدے نہ وفا ہوں
نانا کی اگر شانِ جلالت نہ دکھائیں
مصحف کی قسم آپ کو صورت نہ دکھائیں

جب کہہ چکے یہ جوشِ شجاعت میں وہ گلرو آنکھوں سے ٹپکنے لگے رخساروں پہ آنسو
لپٹا کے گلے کہنے لگی زینبِ خوشخو اللہ یہ غصہ ہے کہ بل کھاتے ہیں گیسو
لڑنا ہے تمھیں فوج سے مطلوب لڑو گے
لو روؤ نہ معلوم ہوا خوب لڑو گے

بچوں کے آنسوؤں نے دل اور بھی تڑپا دیا۔ مگر ذرا سی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی جاتی۔ دلداری ہے تعریف ہے مگر ماں کی بے قراری ان کے دل میں کمزوری نہ

پیدا کردے۔ اس لیے ان کی بہادری اور شجاعت کا ہی تذکرہ کیے جا رہی ہیں۔

ان کے ساتھ ساتھ خود اپنے کو سنبھالنے کی بھی یہی صورت ہے ؎

صدقے میں اراد وں کے مرے شیر جوانو ۔۔۔ اے بے وطنو، فاقہ کشو، تشنہ دہانو

اب عیش سے ٹھہراؤ نہ کہنا مرا مانو ۔۔۔ ماں کہتے تھے پر اب مجھے تم خادمہ جانو

یہ فصل لڑائی کی نہیں کھیل کے دن ہیں

میں اس لیے کہتی ہوں کہ چھوٹے ابھی سن ہیں

"چھوٹے ابھی سن ہیں" میں سبھی کچھ تو آ گیا۔ معذرت ہے، محبت ہے درسِ شجاعت ہے۔ ماں ممتا کا درد ہے۔ مگر ضبط کا دامن جو ایک پل کے لیے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا تھا۔ پھر مضبوطی سے تھام لیا جاتا ہے ؎

فرما کے یہ لیں دونوں کے چہروں کی بلائیں ۔۔۔ اور تھام کے بازو کو پڑھیں آپ دعائیں

فرمایا کہ رخصت جنھیں ہونا ہے وہ آئیں ۔۔۔ لو بیبیو سب آؤ تو بچے مرے جائیں

اور پھر ماں ممتا کی ایک چیخ سی منہ سے نکلتی ہے ؎

رن میں یہ برات اپنی چڑھانے کو چلے ہیں

دونوں دلھنیں بیاہ کے لانے کو چلے ہیں

کس ماں کے دل میں بیٹوں کے بیاہ کا ارمان، ان کے پروان چڑھنے کی تمنا نہیں ہوتی۔ مگر یہاں لہجے کے انداز سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہی جہاد ان کا بیاہ اور برات ہے۔ میرے بچوں کا پروان چڑھنا حسینؑ پر قربان ہونا ہی ہے۔

حضرت عباس بھانجوں کے سر پر علم کا سایہ کر کے باہر جانے لگتے ہیں تو رخصت ہوتے بچوں سے یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتیں ؎

کچھ حد ہے اس بزرگی و جاہ و جلال کی

دیکھیں نوازشیں شہِ مرداں کے لال کی

اشارہ ہے کہ علم نہ ملنے پر تم خفا تھے اب اس قدر و منزلت پر غور کرو۔ شجاع بھائی سے بیٹوں کی مدد کی درخواست کی جاتی ہے ؎

صدمے سے جان اب نہیں زہرا کی جائی میں
دھڑکا یہ ہے کہ دیکھیے کیا ہو لڑائی میں

یہ دھڑکا بچوں کے زخمی ہونے یا مارے جانے کا نہیں اس کے لیے تو بھیجا ہی جا رہا ہے کہ وہ راہِ حق میں جہاد کر کے شہید ہوں۔ اندیشہ کیا ہے ؎

سیراب سب ادھر انھیں سولہ پہر کی پیاس
رہیے نہ دور ان سے اگر ہے بہن کا پاس
بچے کہاں یہ اور وہ دَل فوجِ شام کا
بھیا مجھے ہے دھیان بزرگوں کے نام کا

ایک ایک لفظ میں عورت کے دل کی دھڑکن اور اس کے جذبات کی عکاسی موجود ہے بھائی بہن کو ڈھارس دیتا ہے ؎

کچھ فکر کی جگہ نہ تردد کا ہے مقام
سن لیجیے گا آج یہ جیسا کریں گے نام
اور پھر ؎
روتی ہیں آپ کیوں مری جاں ان کے ساتھ ہے

غرض عون اور محمد میدانِ جنگ میں جاتے ہیں۔ رجز پڑھ کر دشمن کی فوج کو اپنا حسب نسب بتاتے اور بہادری سے جہاد کرتے ہیں۔ سبھی مرثیہ گویوں نے ان نو عمر لڑکوں کی جنگ کا حال جوش اور مبالغے سے لکھا ہے۔ انیسؔ نے بھی متعدد مرثیوں میں (جن میں سے کئی ان کے بہترین مرثیے کہے جا سکتے ہیں) عون و محمد کی جنگ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایک دو بند میں اس کی بھی ذرا سی جھلک دیکھتے چلیے ؎

اللہ رے نبی کے نواسوں کی کارزار
دونوں کے تیغے تھے کہ چلتی تھی ذوالفقار
شانہ کٹا کسی کا جو روکا سپر پہ وار
گنتی تھی زخمیوں کی نہ کشتوں کا تھا شمار
اتنے سوار قتل کیے تھوڑی دیر میں
دونوں کے گھوڑے چھپ گئے لاشوں کے ڈھیر میں

کرنے والے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ دو کم عمر لڑکے ہزاروں ہتھیار بند سواروں سے چند منٹ بھی ایسی جنگ کیسے کر سکتے ہیں۔ لیکن شاعر کا عقیدہ ہے کہ ذرا سی دیر کے لیے ہی سہی جہاد میں مجاہد کے بازو میں غیبی طاقت زورِ حیدری پیدا کر دیتی ہے۔ صرف عون و محمد ہی کے لیے نہیں ہر وہ جانباز جو روزِ عاشور کربلا کے میدان میں جنگِ حق و باطل میں لڑنے آیا۔ ایسی ہی بے پناہ شجاعت سے لڑا۔ آپ اس پر عقیدہ رکھیں یا نہ رکھیں انیس کا اس پر ایمان ہے اور یہ یقین ہی ان کے بیان کی جان ہے خوبصورت نوعمر لڑکوں کی جنگ کا حسن دیکھیے ؎

وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ وہ نازک کلائیاں آفت کی پھرتیاں تھیں غضب کی صفائیاں
ڈر ڈر کے کاٹتے تھے کماں کش کنائیاں فوجوں میں تھی علی و نبی کی دہائیاں
شوکت جو ہو بہو تھی جنابِ امیر کی
طاقت دکھا دی شیروں نے زینب کے شیر کی

عباس جو فنونِ سپہ گری میں ان کے استاد ہیں بڑھ بڑھ کر داد دے رہے ہیں ؎
بڑھتے تھے گاہ گاہ سرک جاتے تھے عباس جب کرتے تھے وہ وار پھڑک جاتے تھے عباس
ہمت بھی بڑھاتے جاتے ہیں ؎
ہاں شیروں کے شیروں کا یہی کام ہے شیرو بس آج لڑائی میں بڑا نام ہے شیرو
پنجے میں تمھارے سپہ شام ہے شیرو تم دونوں کا جد صاحب صمصام ہے شیرو
اک شمس تو اک برج شرافت کا قمر ہے
ماں کس کی ہے بیٹی تو پدر کس کا پسر ہے

فوج کے جنرل کی یہ کیفیت ہے مگر سردار کا دل اپنے کم عمر بھانجوں کے لیے تڑپ رہا ہے ؎
شہ کہتے تھے بچے ہیں لڑیں ہائے کہاں تک لاکھوں سے لڑے دونوں میں طاقت تھی جہاں تک

دور روز سے پانی نہیں پہنچا ہے وہاں تک　　اب پھر کے کوئی انھیں لے آئے یہاں تک

ادھر ماں در خیمے سے لگی فضہ سے دم دم کی خبریں معلوم کر رہی ہیں۔ مگر جب فضہ کہتی ہیں ؎

دم خوف سے سینے میں سماتا نہیں اب تو
ہے ہے مجھے چھوٹا نظر آتا نہیں اب تو

ساتھ ہی ؎

یہ ذکر ابھی تھا کہ صدا رونے کی آئی　　دروازے سے اکبر نے یہ آواز سنائی
لوٹی گئی ہے ہے پھوپھی اماں کی کمائی　　مارے گئے دو ساتھ کے کھیلے ہوئے بھائی

تو یہ سنتے ہی ؎

چلائے حرم لٹ گئی بنتِ اسد اللہ

مگر انھوں نے ایمان و یقین کا یہ معجزہ دیکھا ؎

سجدے کو سوئے قبلہ جھکیں زینبِ ذی جاہ

اور ادھر ؎　　دوڑے طرف دشتِ دغا روتے ہوئے شاہ

یہاں خاندان کی عورتیں اس حادثۂ جانکاہ پر ماتم کناں ہیں ؎

ماتم تھا کہ برباد یہ گھر ہو گیا ہے ہے　　زہرا کے نواسوں کا سفر ہو گیا ہے ہے
تقدیر میں سر پیٹنا تھا نوحہ گری تھی
خالی ہوئی وہ گود جو بچوں سے بھری تھی

شہر بانو نند کو بیبیوں کے پاس لے جانا چاہتی ہیں کہ لوگ پرسے کو جمع ہیں وہاں چل کر رو لو تو جواب ملتا ہے کہ میں نہ جاؤں گی ؎

آنچ آتما کی دل کو جلائے تو کیا کروں
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں

امام حسینؑ جانباز مجاہدوں کے لاشے لے کر خیمے میں آتے ہیں کہ بدنصیب بہن کو بچوں کا آخری دیدار کرادیں تو صابر بہن کی یہ حالت دیکھتے ہیں ؎

زینب نے نہ فریاد کی نے اشک بہائے　　بیٹھی رہیں سرِ زانوئے اقدس پہ جھکائے

مگر ؎

لب خشک تھے منہ زرد مژہ اشکوں سے تر تھی
نے اپنی نہ بھائی کی نہ لاشوں کی خبر تھی

انتہائی صدمے اور انتہائی صبر کی تصویر دیکھیے ؎

بانو جو قریں آئی تو بولی یہ وہ مغموم　　بی بی مجھے کچھ آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم
کس جا علی اکبر ہیں کدھر ہیں شہِ مظلوم　　کس کی خبر آئی ہے کہ ماتم کی ہے یہ دھوم
پردیس میں جینے سے کسے یاس ہوئی ہے
یہ کون سی ماں بیٹوں سے بے آس ہوئی ہے

عرصہ ہوا بچوں کو مرے رن میں سدھارے　　کیا جانیے سر ماموں پہ وارے کہ نہ وارے
دھڑکا ہے کہ کم سن ہیں بہت وہ مرے پیارے　　دریا پہ کہیں جا نہ پڑیں پیاس کے مارے

بھائی کے دل پر بہن کا یہ حال دیکھ کر قیامت گذر جاتی ہے ؎

شبیر پکارے کہ بہن میں ترے قرباں　　زندہ تھا سحر تک مگر اب میں ہوا بے جاں

اور پھر بہن کو یہ جاذکاہ حقیقت بتاتے ہیں ؎

فوجوں کو بھگایا ہے ہزاروں سے لڑے ہیں　　یہ عون و محمد ہیں جو بے جان پڑے ہیں

تعریف میں جو صداقت اور خلوص ہے وہ پڑھنے والے بھی محسوس کر سکتے ہیں ؎

افسوس کہ ان دونوں کی دیکھی نہ جوانی　　میں کیا کہوں کیا صاحبِ ہمت تھے یہ جانی
ہوتی ہے بہت زخمیوں کو تشنہ دہانی　　پر ہم سے دمِ مرگ بھی مانگا نہیں پانی
سمجھے کہ گرفتارِ بلا آج ہے ماموں
وہ جانتے تھے پانی کو محتاج ہے ماموں

اب بہن کا جواب سنیے ؎

حضرت سے کہا آپ کو ایذا ہوئی یا شاہ — کس طرح لڑے دونوں غلامانِ ہوا خواہ
حضرت نے کہا مدح میں قاصر ہے زباں آہ — زینب مجھے یاد آگئی جنگ اسداللہ
نانا کی طرح دونوں نواسوں نے وغا کی
بچوں کی نہ تھی جنگ یہ قدرت تھی خدا کی

عباس و علی اکبر ان جانبازوں کی بہادری کے قصے سنا رہے ہیں کہ جانتے ہیں کہ زینب کو اس سے اطمینان ہوگا۔ مگر وہ ماں کے دل کی حالت کیسے سمجھ پاتے، اسے یا تو کچھ حسینؑ سمجھ رہے ہیں یا پھر شہر بانو جو خود عورت ہے، ماں ہے، وہ شوہر سے کہتی ہیں ؎

قربان گئی آپ بس اب جائیے باہر
گر ضبط اسی طرح سے فرمائیں گی زینب — یہ ماتمِ اولاد ہے مر جائیں گی زینب

اور امام حسینؑ کے باہر جانے کے بعد ؎

بانو نے رکھے زانوئے زینب پہ سر ان کے — جو بیبیاں تھیں آگئے منہ کو جگر ان کے
زینب نے جو کی جھک کے رخوں پر نظر ان کے — دکھلائی دیے چاند سے منہ خوں میں تر ان کے
رخسار بھی مجروح تھے ابرو بھی کٹے تھے
شانے تھے جدا چاند سے بازو بھی کٹے تھے

کوئی بھی ماں جس کی تخلیق آب و گل کے عناصر سے ہوئی ہے اپنے بچوں کی یہ حالت دیکھ کر ضبط نہیں کر سکتی۔ اگر کرے تو وہ یا ہوش و حواس کھو چکی ہوگی یا بے حس دل پہلو میں ہوگا۔

انیسؔ اس وقت ماں کی حالت کی جو عکاسی کرتے ہیں وہ دنیا کی کسی بھی ماں پر ایسی صورتِ حال میں صادق آسکتی ہے۔ یہ ٹکڑا انیسؔ کے کلام میں ہر طرح شاہکار کا

درجہ رکھتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب، بیان کا حسن اور اثر، سچی قلبی کیفیت، درد و غم کی گہرائی شعروں کے قالب میں ڈھل کر نشتر بن کر دلوں میں اتر تی چلی جاتی ہے ؎

منہ چھاتیوں پہ رکھ کے وہ ناشاد پکاری | آرام سے ہو یا ہے غشی پیاس کی طاری
ہوتا ہے بیاں شوکت و ہمت کا تمھاری | تسلیمیں کرو قبلۂ کونین کو واری

سمجھی میں کہ باعث ہے یہ بیداریٔ شب کا
پیارو یہ طریقہ نہیں ارباب ادب کا

ابھی تک اپنے پر قابو ہے۔ بچوں سے مخاطب ہو کر ان کی بہادری کا ذکر، ماموں کی تعریف و توصیف کا بیان کر کے اپنے کو سنبھالنے کی ایک آخری کوشش ہو رہی ہے۔ ان کی شخصیت کس طرح ان شعروں میں جھلک رہی ہے ؎

تعریفِ امام دوسرا کرتے ہیں اُٹھو | عباس علمدار ثنا کرتے ہیں اُٹھو
ہم شکلِ نبی مدح و ثنا کرتے ہیں اُٹھو | سب لوگ نہ اٹھنے کا گلا کرتے ہیں اُٹھو

آقا سے مصیبت میں جدا ہو نہیں جاتے
صدقے گئی یوں جنگ کے دن سو نہیں جاتے

یہ حصّہ کافی بڑا ہے، بہت سے بند ہیں۔ اس کی خوبی و اثر اور فصاحت و بلاغت کو پوری طرح تبھی پرکھا جا سکتا ہے، جب سب بند پڑھے جائیں۔

مگر آخر اس ہوش و بے ہوشی آگہی و بے خودی کے عالم میں بچوں سے باتیں کرتے کرتے ماں پر یہ جاں گداز حقیقت کھل جاتی ہے کہ نہ یہ پیاس کی غشی ہے نہ جوانی کی نیند۔ یہ وہ نیند ہے جس سے انسان پھر بیدار نہیں ہوتا۔

تم تو کبھی یوں رات کو غافل نہیں سوئے | پانی نہیں کاہے سے یہ ماں چہروں کو دھوئے
اب تم نہ ملو گے جو کوئی جان بھی کھوئے | قسمت میں یہ لکھا تھا کہ ماں لاشوں پہ روئے

سر دے کے مرے حق سے ادا ہو کے پھرے ہو
سمجھی ہیں کہ ماموں پہ فدا ہو کے پھرے ہو

اور پھر ایک ایک بات صبح سے وقت رخصت تک کی یاد آتی ہے، اپنی خفگی، بچوں کی سعادت مندی، ان کا شوقِ جہاد، اپنی بدگمانی، ان کی بہادری، جہاد، جاں نثاری، معذرت ہے کہ درد کا دریا لہریں مار رہا ہے ؎

اس وقت نہ تھی ہوش میں یہ بیکس و دلگیر
اس دائی نے کی تھی گلہ آمیز جو تقریر
شرمندہ ہوں، محجوب ہوں بخشو مری تقصیر
منظور یہ تھا پہلے ہو تم فدیۂ شبیر
روتے تھے کہ اماں میں خفا ہونے کی خو ہے
گھڑکا تھا کلیجہ مرا اس غم میں لہو ہے

گل پیرہنو، تشنہ لبو، گیسوؤں والو
احسنت مرے صف شکنو نیک خصالو
لو چھوٹی سی باہیں تو گلے میں مرے ڈالو
غش آتا ہے پیارو مجھے اٹھ اٹھ کے سنبھالو
مظلوم ہو دربار میں عادل کے سدھارو
جاتے ہو تو اماں سے گلے مل کے سدھارو

دنیا اتنی فانی، اتنی بے ثبات، اتنی بے مہر ہے یہ جانتی تھیں۔ بڑے بڑے صدمے بچپن سے سہارتی آئی تھیں۔ مگر آج اس حقیقت کا جیسا گہرا احساس ہوا اس سے پہلے کہاں ہوا تھا ؎

جاتا ہے تہی دست گدا ہو کہ شہنشاہ
یہ دہر ہے بے مہر یہ دنیا ہے گذرگاہ
ماموں کی نہ تقصیر نہ کچھ اس میں ہے ماں کی
قبریں بھی ملیں گی وہیں ہے خاک جہاں کی

اب تک جو عورت بین کر رہی تھی وہ محمدؐ کی نواسی، علیؑ کی بیٹی اور حسینؑ کی بہن ہے جس کا صبر اور برداشت جس کا یقین و ایمان مسلّم ہے مگر اب جو تڑپ اور بلک رہی ہے وہ ماں ہے صرف ماں ؎

جیتی ہوں یہ قسمت میں مری پھیر ہے پیارو
اب جینے سے اماں کا بھی جی سیر ہے پیارو

تم مر گئے دنیا مجھے اندھیر ہے پیارو		کیا جانے مری موت میں کیا دیر ہے پیارو

ہے کون سی دولت جسے کھونے کو رہی ہوں

معلوم نہیں اب کسے رونے کو رہی ہوں

بچوں کی ایک ایک ادا، محبت اور خدمت یاد آکر کلیجہ تڑپا رہی ہے ؎

اب دھیان مرا شام و سحر کون رکھے گا		الفت کی محبت کی نظر کون رکھے گا

پردیس میں اماں کی خبر کون رکھے گا		جھک جھک کے مرے پاؤں پہ سر کون رکھے گا

سب ہوں گے مگر گود کے پالے نہ ملیں گے

اب تم سے مجھے چاہنے والے نہ ملیں گے

واردات قلب کی سچی عکاسی، محاورہ اور روزمرہ کا بے تکلف استعمال، تشبیہوں کا بے ساختہ حسن پڑھنے اور سننے والے کو بے خود سا کر دیتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ یہ شاعر انیسؔ کہہ رہا ہے یا سچ مچ کسی دکھیاری ماں کے دل کے زخم رس رہے ہیں ؎

ہر سال بہار آئے گی کھل جائیں گے سب گل		سرسبز جوانانِ چمن ہوئیں گے بالکل

سبزہ کہیں ہوگا کہیں نسریں کہیں سنبل		وہ سرد ہوائیں، وہ خوش الحانیِ بلبل

دنیا کے نہ بستانِ فرح ناک میں ہو گے

گل باغ میں تم زیرِ زمیں خاک میں ہو گے

اس سارے بیان میں صرف اوپر دیا ہوا بند ہے جو دکھیا ماں کا نہیں شاعر انیسؔ کا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس آواز میں جو حسن، بیان میں جو نزاکت اور تشبیہوں میں جو خوبی ہے وہ داد سے بے نیاز ہے۔

جب یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ لاشے بھی چھن جائیں گے تو بے قراری میں اضافہ اور صبر میں کمی آتی جاتی ہے ؎

تاریکی میں واری تمھیں نیند آئے گی کیونکر — شب ہوگی تو بچوں کو یہاں پائے گی کیونکر
مادر دلِ بیتاب کو سمجھائے گی کیونکر — واں تک مرے رونے کی صدا جائے گی کیونکر

نکلوں جو تجسس کو تو بے جا نہیں واری
ماں ہوں مرا پتھر کا کلیجہ نہیں واری

بیتابی میں بین کر رہی ہیں مگر یہ احساس بھی ہے کہ نہیں کرنا چاہییں مگر معذرت کا انداز دیکھیے میں ماں ہوں اس لیے مجبور ہوں ؎

جنگل میں قیام آج کہاں ہوگا بتاؤ — ماں صدقے مقام آج کہاں ہوگا بتاؤ
دن تم کو تمام آج کہاں ہوگا بتاؤ — بستر سرِ شام آج کہاں ہوگا بتاؤ

ہموار زمیں شب کو بچھونے کو ملے گی
ہے کون سی جا جو تمھیں سونے کو ملے گی

یاد آتا ہے کہ چھوٹا بچہ رات میں ماں کا پہلو پاکر چین کی نیند سو سکتا تھا تو صبر و قرار کا دامن جو کسی نہ کسی حد تک اب تک تھامے تھیں۔ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے ؎

دو بھائی ہو تم ایک جگہ رات کو سونا
معلوم ہے چھوٹے کا مجھے چونک کے رونا — صدقے گئی غافل مرے بچے سے نہ ہونا
بے ماں کے سحر رونے میں ہو جاتی ہے اس کو
پہلو مرا ملتا ہے تو نیند آتی ہے اس کو

یہ کہہ کے جو چھاتی پہ دو ہتڑ کئی مارے — سینہ ہوا شق ہاتھ بھی نیلے ہوئے سارے
ہم شکل نبی پاؤں پہ گر کر یہ پکارے — بس والدہ اب رویئو لاشے پہ ہمارے
اب پیاس میں آبِ دمِ شمشیر پئیں گے
بھائی نہ رہے خلق میں ہم بھی نہ رہیں گے

لاڈلے بھتیجے کی بات سن کر بے خود و مدہوش غم کی ماری ماں ہوش میں آجاتی ہے یاد آجاتا ہے کہ یہ لال تو اس نے خوشی سے بھائی پر قربان کیے ہیں۔ یاد آتا ہے کہ میں نے تو نہ رونے اور صبر کو ہاتھ سے نہ کھونے کا دل سے عہد کیا تھا یہ بھی کہا تھا ؎

روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے
صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئیں گے

یاد آتا ہے کہ شہیدوں کی ماں روتی نہیں، فخر کرتی ہے یاد آجاتا ہے کہ آج کا دن صبر و امتحان کا دن ہے اور اپنی حالت پر شرمندگی اور تکلیف محسوس ہوتی ہے ؎

گھبرا کے وہ مخدومۂ عالم یہ پکاری
مرجائے یہ ناشاد بلا لے کے تمھاری
بن بیاہے ہو تم لاشوں کے پاس آؤ نہ واری
تم روؤ گے اس ڈر سے میں کرتی نہیں زاری

ہندوستانی تہذیب کا پس منظر اور رسم و رواج کا ذکر انیس نے سب سے کم زینب کے بیان میں کیا ہے۔ بس کہیں کہیں جھلک سی ضرور نظر آتی ہے جیسے یہاں " بن بیاہے ہو تم لاشوں کے پاس آؤ نہ واری "۔ لیکن ٹیپ کا بند (جس کو بعض بدذوق انیس کے کلام کی خامی اور معاذاللہ زینب کی غلط بیانی سمجھتے ہیں) غضب کی نسوانی فطرت کی ترجمانی کرتا ہے کہ بین کر رہی ہیں، تڑپ رہی ہیں، آنکھوں سے سیلاب اشک بہہ رہا ہے مگر پیارے بھتیجے کی تسلی کے لیے بے ساختہ یہ کہنا ؎

باتوں میں مری بین کے پہلو نہیں نکلے
آنکھوں سے مری دیکھ لو آنسو نہیں نکلے

عین عورت کے مزاج اور فطرت کے مطابق ہے جب وہ سخت صدمے اور بیقراری کی حالت میں تسلی دینے والوں اور سمجھانے والوں سے یہ کہتی سنائی دیتی ہے کہ میں کہاں رو رہی ہوں۔ یعنی یہ رونا کیا اس کے دل کی اصلی کیفیت کا ترجمان ہے۔

فرماکے یہ غش ہو گئیں، اور پھر ہوئیں ہشیار — پوچھا کہ کدھر ہے علی اکبر مرا دلدار
بانو نے کہا شاہ سے با دیدۂ خونبار — اب فرق بصارت میں بھی ہے یا شہِ ابرار

اب کی جو غش آیا تو گذر جائیں گی زینب
لے جایئے لاشے نہیں مر جائیں گی زینب

اور پھر دل کو چیر کر یہ آواز نکلتی ہے۔ شاید اس چھپے احساس کے ساتھ کہ اس پر بھی یہ قیامت جلد ٹوٹنے والی ہے ؎

فرزند کا غم خالقِ اکبر نہ دکھائے — اللہ کسی ماں کو یہ ماتم نہ دکھائے

اور پھر آہ کے ساتھ یہ اضافہ ؎

دو غم کے پہاڑ ایک ضعیفہ پہ گرے ہیں

امام حسینؑ بچوں کے لاشے اٹھا کر لے جانے لگتے ہیں۔ تو بے قرار ہو کر زینب کہتی ہیں ؎

گھر میں مرے کاہے کو یہ پھر آئیں گے جا کے
دینے دو کفن دونوں کو زہرا کی ردا کے

اور ؎

در تک گئیں لاشوں سے لپٹنے کو کھلے سر — پر رانڈوں نے جانے نہ دیا خیمے کے باہر
چلائیں در خیمے کے پردے کو اٹھا کر — گاڑو گے کہاں بھائیوں کو اے علی اکبر

ڈر ہے کہ خفا مجھ سے مرے لال نہ ہو جائیں
صدقے گئی لاشے کہیں پامال نہ ہو جائیں

یہ عالی ظرفی اعلیٰ تربیت یہ صبر اور ایثار اور وقار اور ضبط کسی مثالی عورت ہی میں ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی بھائی سے گہری محبت ان کے اعلیٰ مقصد کی لگن ان کے ریشے ریشے میں پیوست ہے مگر دوسری طرف انیسؔ ایک چاہنے والی ماں کی سیرت د

کردار کو بھی پوری طرح ابھار کر سامنے لائے ہیں۔ جو اپنے بچوں کی والہانہ محبت کا فطری جذبہ رکھتی ہے۔ ماتا کا جذبہ دنیا کی ہر محبت، ہر جذبے سے شدید تر ہوتا ہے اور زینب کا دل بھی اس سے معمور ہے۔ ہاں حق کی محبت اس سے بڑھ کر ضرور ہے اولاد کی الفت، اس کی جدائی پر درد و غم کی انتہائی شدت، ماتم و گریہ وزاری انسانی فطرت کی کمزوری اور خصوصیات ہیں اور حق کا پالن کرنا اس کے لیے جان دینا، خاصانِ خدا کا حصّہ۔ زینب کے کردار میں انیسؔ نے ان دونوں جذبوں کو اس خوبی سے سمویا اور ان کا ایسا دل کش مرقع کھینچا ہے کہ سبحان اللہ۔

انیسؔ دکھاتے ہیں کہ زینب کا دل ماتا کا بیکراں ساگر تھا۔ اولاد تو خیر اولاد ہی ہوتی ہے مگر ان کی تو ہر محبت میں ماں کا جلوہ موجود تھا۔ بڑے بھائی سے وہ محبت تھی کہ وہ اکثر چھوٹی بہن کو "ماں" یا ماں کی جگہ کہتے نظر آتے ہیں۔ بھتیجے سے وہ عشق کہ اولاد کی محبت بھی ماند پڑ گئی۔ چھوٹے سوتیلے بھائی سے وہ الفت کہ وہ اپنی ماں کو ان کے سامنے بھول جاتے ہیں۔ پھر خاندان بھر کے لڑکے لڑکیوں بچے بچیوں سے محبت اور شفقت کا برتاؤ، سب کی فکر۔ کسی عورت کی ماتا کی یہ معراج ہے کہ وہ دوسروں کی اولاد کو اپنی اولاد کے برابر چاہنے لگے۔ زینبؑ اس سے بھی ایک درجہ بلند ہے کہ وہ اپنے بیٹوں سے زیادہ بھائی اور ان کے بچوں کو چاہتی بھی ہیں اور اس کا عملی ثبوت بھی دیتی ہیں۔ خاص طور پر علی اکبر حسینؑ کے منجھلے بیٹے سے انھیں بہت محبت ہے۔ علی اکبر سے زینب کی محبت کا ذکر جہاں کہیں شاعروں نے کیا ہے، بڑے جذبے کے ساتھ کیا ہے۔ اور انیسؔ کا تو یہ سب سے محبوب موضوع ہے۔ دونوں پھوپھی بھتیجے کی سیرت نگاری میں کمال کر دیا ہے۔ خاص کر زینب کے کردار اور مزاج کی عکاسی میں وہ وہ موشگافیاں کیں، ایسے ایسے نکتے پیدا کیے کہ وہ شاعر سے زیادہ سیرت نگار معلوم ہوتے ہیں۔ علی اکبر سے متعلق مرثیوں میں

چار کردار شہر بانو، زینب، امام حسینؑ اور خود علی اکبر نظر آتے ہیں اور ہر کردار اپنی ایک منفرد شان رکھتا ہے۔

زینب علی اکبر کو اتنا کیوں چاہتی ہیں؟ اس کی وضاحت نہیں مگر اشارے ضرور ملتے ہیں جو کبھی کبھی وضاحت سے زیادہ بلیغ ہوتے ہیں۔ اکبر ہم شکلِ رسولِ خدا ہیں۔ اسی لیے زینب اور حسینؑ اس بچے کو اور سب سے زیادہ چاہتے ہیں کہ اس میں انھیں اپنے محبوب و محترم نانا کی شبیہہ نظر آتی ہے۔ پھر زینب نے انھیں بچپن سے پالا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ پالے کی محبت ماتا کی محبت سے کم نہیں ہوتی۔ بعض صورتوں میں تو اس سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ گود کا پالا اٹھارہ برس کا نوجوان، خوبصورت، بہادر، خلیق، اعلیٰ اخلاق و عادات کا مالک ہے جس پر خاندان بھر جان دیتا ہے۔ پھر ایسے ہونہار بھتیجے سے ان کو کیوں نہ سب سے زیادہ الفت ہوتی۔ چنانچہ ان کی الفت کا اظہار ہر جگہ نظر آتا ہے۔ چاند دیکھ کر ان کا یہ کہنا ؎

آئے تو رخِ اکبرِ ذی جاہ کو دیکھوں
شکلِ مہِ نو دیکھ چکی، ماہ کو دیکھوں

اور جب علی اکبر صبحِ عاشور اذان دیتے ہیں تو ؎

ہر ایک چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسول کی کانوں میں آ گئی

خیمے کے اندر یہ حال تھا ؎

ناموسِ شاہ روتے تھے خیمے میں زار زار
چپکی کھڑی تھی صحن میں بانوئے نامدار
زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھی میں نثار
صدقے نمازیوں کے موذن کے میں نثار
کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذوالجلال کی
لوگو! اذاں سنو مرے یوسف جمال کی

ماں پر اتنا گہرا اثر ہے کہ وہ خاموش بت بنی کھڑی ہے اور پالنے والی
پھوپھی بے ساختہ تعریف کر رہی ہے دعائیں دے رہی ہے، فخر کر رہی ہے۔
دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر اثر ہیں۔
اپنے لاڈلے بھتیجے کی قابلیت، حسنِ سیرت اور حسنِ صوت پر چھاتی پھول اٹھتی
ہے ؎

یہ حسنِ صوت اور یہ قرأت یہ شدّ و مد — حقّا کہ افصح الفصحا ہے انھیں کا جد
گویا ہے لحنِ حضرتِ داؤدِ با خرد — یارب رکھو اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں

یہ داد ایسی ہی ہستی دے سکتی ہے جو ان صفات کی سچی پرکھ رکھتی ہو۔ جو
خود علم و فضل کی کان، فصاحت و بلاغت کی جان ہو۔ پھر "عقیلہ[1] بنی ہاشم"
پر یہ کہتے کہتے نسوانیت غالب آجاتی ہے ؎

میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے — عین الکمال سے تجھے بچے خدا بچائے
غربت میں پڑ گئی ہے مصیبت حسین پر
فاقہ یہ تیسرا ہے مرے نورِ عین پر

روزِ عاشور ظہر تک جب حسینؑ کے سب یاور و انصار شہید ہو گئے اور
سب عزیز بھی جانیں قربان کر چکے۔ عباس تک نے جامِ شہادت پی لیا۔ تب
صرف علی اکبر باقی رہ گئے جو بار بار باپ سے جنگ کی اجازت مانگ رہے ہیں ؎

شہ نے کہا خوشی ہے بہرحال خاکسار — تم سے جو سو پسر ہوں تو اس راہ میں نثار
پر میں نہ دوں گا رخصتِ میدانِ کارزار — اس امر میں تمھاری پھوپھی کو ہے اختیار

[1] حضرت زینب کا لقب تھا۔

راضی ہوں وہ تو داغ ہمیں دے کے جایئے
پالا ہے جس نے اس سے رضا لے کے جایئے

اکبر خیمے میں آکر بجائے پھوپھی کے ماں کے پاس جاتے ہیں۔ شاید پھوپھی کی بے پناہ محبت انھیں مرنے کی اجازت نہ دے مگر ماں کو ضد کر کے راضی کرنا آسان ہے کہ آخر اور مائیں بھی تو اپنے بیٹوں کو حسینؑ پر قربان کر چکی ہیں۔ میری ماں کیا ان سے کم ہے؟ اس طرح وہ چپکے سے میدانِ جنگ میں جا سکتے ہیں۔ ماں سے باپ کی حالت یوں بیان کرتے ہیں ؎

اعدا کا ظلم بھائی کا غم تین دن کی پیاس
بازو شکستہ ضعفِ بصارت ہجومِ یاس
اب میں ہوں اور کوئی نہیں شاہِ دیں کے پاس
اس پر بھی اضطراب نہیں واہ رے حواس

وہ اس وقت ماں کی ممتا، پھوپھی کی محبت، سب سے بے نیاز ہیں۔ بس بیکس باپ پر اپنی جان قربان کرنے کا ولولہ ہے ؎

صدقے ہوں غیر سبطِ نبی کے قدم پہ سب
بیٹا مدد نہ کر سکے بابا کی ہے غضب
للہ ہاتھ اٹھایئے اب نورِ عین سے
اماں ہمیں عزیز نہ کیجیے حسین سے

آپ اجازت نہ دیں گی تو نافرمانی تو نہیں کر سکتے مگر ؎

جنگل کی راہ لیں گے گریباں کو پھاڑ کے
کافی ہیں منہ چھپانے کو دامن پہاڑ کے

ماں بھی وہی کہتی ہے جو اس کے عالی مرتبت شوہر نے کہا تھا ؎

مجھ سے نہ کچھ نہ سیدِ عالی سے پوچھیے
گر پوچھیے تو پالنے والی سے پوچھیے

علی اکبر ماں سے یہ سننے کے بعد پھوپھی کے پاس آتے ہیں جو صدمے سے نیم بیہوش

کی حالت میں پڑی ہیں۔ اور ے

اس حال میں بھی لب پہ یہی ہے کلام یاس

اب تاب و طاقت و جسد و روح و دل گئی　　کیوں صاحبو رضا علی اکبر کو مل گئی

یہاں انیس نے عورت کی نفسیات بڑی خوبی سے دکھائی ہے۔ زینب کی بلند شخصیت اور اعلیٰ سیرت میں نسوانی کمزوریوں کو سمو کر اس میں ایسے رنگ بھر دیے ہیں، اتنی حقیقی اور سچی جذبات نگاری کی ہے کہ سبحان اللہ۔ وہ صاحبِ عزم عورت جو اپنے دو بیٹوں کو حسینؑ پر قربان کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے، اس ذرا سی بات پر کہ علی اکبر ان کے بجائے اپنی ماں کے پاس اجازت لینے چلے گئے، صدمے سے بے حال ہو جاتی ہے۔ گلے شکوے کی باتیں منہ سے نکلنے لگتی ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ اسے شاعر کے کلام کی خامی اور حضرت زینب کی سیرت کی مضبوطی کے منافی کہیں، لیکن ایسا وہی سمجھ سکتے ہیں جو عورت کی فطرت اور نفسیات سے ناواقف اور اس کے دل کی گہرائیوں میں پلنے والے جذبوں کے رمز شناس نہیں ہوتے۔

انیس نے یہاں جو دکھایا ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ انسانی فطرت کو سمجھنے اور پرکھنے کی ان میں کتنی غیر معمولی صلاحیت تھی اور ان کا مشاہدہ کس غضب کا تھا۔ عورت کی یہ فطری کمزوری ہے کہ جب وہ دوسروں کے بچوں کو اپنے بچوں کی خاطر چاہے تو یہی توقع وہ ان سے کرتی ہے کہ وہ بھی اسے ماں سمجھیں اور ذرا سی بے پرواہی ذرا سی بے رخی یا غلط فہمی اس کا شیشۂ دل چور چور کر دیتی ہے۔ میرا عاجز قلم اسے کیا بیان کریگا۔ انیس کے معجز بیان قلم سے کھینچا، یہ مرقع دیکھیے ے

اکبر سے مجھ کو یہ نہ توقع تھی ہے غضب　　اتنا نہیں خیال کہ ہے کون جاں بلب

اس گل نے ہائے میری ریاضت بھلائی سب　　نام خدا جواں ہوئے کیا ہم سے کام اب

ہیں محوِ رن کے شوق میں رخصت کے دھیان میں
سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں

پالے ہمارے چین نہ آتا تھا ایک دم — مالک اب اور ہو گئے کوئی ہوئے نہ ہم

یہ "اور" قابلِ غور ہے ۔

جاگی ہوں میں جو چونک کے راتوں کو روئے ہیں
پوچھو تو کس کی چھاتی پہ بچپن سے سوئے ہیں

بھتیجے کی بچپن کی ادائیں یاد آرہی ہیں۔ اپنی خدمت اور محبت یاد آرہی ہے اور اس طرح عورت کا دل اسے یقین دلا رہا ہے کہ صرف ماں ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز تو بچے کی خدمت اور محبت ہے جو انھوں نے کی ہے ۔

کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی — بے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی
بے ان کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی — روئیں بستر پہ ان کو رلاتی نہ تھی کبھی

میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی سو میں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

یا وہ محبت تھی یا اب یوں رُخ پھیر لیا۔ اور پھر یہ بے رخی کا احساس بچوں کی جدائی کے زخم کریدنے لگتا ہے ۔

ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خورد سال — پر ان کے آگے ان کا مجھے کچھ نہ تھا خیال
راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال — میں کہتی تھی ہٹو علی اکبر ہے میرا لال

وہ دونوں مرنے والے تو پہلو میں ہوتے تھے
پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے

جس پھوپھی نے اٹھارہ برس یہ خدمت، یہ محبت دی، آج وہ اس احساس سے کڑھ رہی ہیں کہ یہ محبت ضائع ہو گئی۔ اور اب اپنے جاں باز بیٹوں کا خیال

آ رہا ہے جو اس اظہارِ محبت سے محروم رہے جو علی اکبر سے ہوتا رہتا تھا ؎

چھوٹا تو ضد بھی کرتا تھا راتوں کو بارہا
پر عون کیا عقیل تھا بخشے اسے خدا
دن رات تھی خوشامد ہم شکل مصطفٰےؐ
سینے پہ جب یہ سوئے تو اس نے یہی کہا
آقا کے نورِ عین ہیں عالی مقام ہیں
اماں یہ شاہزادے ہیں اور ہم غلام ہیں

"بخشے اسے خدا" کتنا عام جملہ ہے۔ مگر جب یہ بدنصیب ماں کے منھ سے نکلے تو یہ لفظ نہیں کلیجے کا لہو ہے جو رس رہا ہے۔ رنج اور غصہ بڑھتا جا رہا ہے ؎

میں نے انھیں یہ صدقے کیے اپنے دونوں لال
تسکین تھی کہ باقی ہے اکبر سا نونہال
مانگے تو آکے مجھ سے بھلا رخصتِ جدال
نکلوں گی ساتھ خیمے سے بکھرا کے سر کے بال
ثابت ہوا ادھر سے ادھر مرنے جائیں گے
میں مر بھی جاؤں گی تو وہ یاں تک نہ آئیں گے

کان ادھر ہی لگے ہیں ؎

باہر سدھارے یا ابھی ماں سے ہی کچھ کلام
بھائی نے کیوں لیا تھا ابھی رو کے میرا نام
سینے پہ منہ کو رکھ کے یہ بولا وہ لالہ فام
آنکھیں تو آپ کھولیے حاضر ہے یہ غلام
خادم جدا نہ تھا شہِ گردوں سریر سے
کس جرم پہ حضور خفا ہیں حقیر سے

اپنی صفائی دینے کے بعد لاڈلا بھتیجہ جذباتی انداز میں کہتا ہے ؎

روتا ہوں اب کہ صبر کی مجھ کو نہیں ہے تاب
شکوہ یہ خاکسار سے اے بنتِ بوتراب

اور پھوپھی کی محبت، خدمت اور عظمت کا اعتراف کس اپنائیت اور خلوص سے کیا جارہا ہے ؎

ہر دکھ میں ہر بلا میں مددگار آپ ہیں
پالا ہے مجھ کو مالک و مختار آپ ہیں

پیدا ہوا تو آپ کی صحبت مجھے ملی
کرتی ہے روح شکر وہ دولت مجھے ملی
یوسف کو کب ملی تھی جو دولت مجھے ملی
رکھا عزیز آپ نے عزت مجھے ملی

صدقہ ہے اس قدم کا جو سر تا فلک گیا
کی مہر آفتاب نے ذرّہ چمک گیا

ہر ہر جملہ پھوپھی کے زخم پر مرہم کا کام دے رہا ہے۔ مگر جب حرفِ مطلب زبان پر آتا ہے ؎

مرضی نہ ہو تو ران کو بھی جلئے نہ یہ غلام
بندے ہیں ہم اطاعتِ مالک سے ہم کو کام
تکرار کی مجال، نہ اصرار کا مقام
مرتے اگر تو اس میں بھی تھا آپ ہی کا نام

روتی ہیں آپ کس لیئے اچھا نہ جائیں گے
پر یاد رکھیئے منہ نہ کسی کو دکھائیں گے

یہ کہہ کے جھک گیا جو قدم پر وہ ذی وقار
بس ہوگئیں محبتِ قلبی سے بیقرار
پھیلا کے دونوں ہاتھوں کو اٹھیں بہ حالِ زار
شکوے کے بدلے منہ سے یہ نکلا کہ میں نثار

اٹھا یہ دل کہ چشم کے ساغر چھلک پڑے
دیکھا جو آفتاب کو آنسو ٹپک پڑے

پھوپھی بھتیجے کی اس گہری محبت، بھتیجے کی سعادت مندی اور عقیدت پھوپھی کے شکوے اور شکایت میں ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کی چھاپ صاف دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ وہ روایتیں ہیں جو آج سے چوتھائی صدی پہلے تک کی

ہندوستانی تہذیب کی جان اور آن تھیں۔ پھوپھی کے شکوے کا یہ انداز دیکھیے، ہے نا خالص ہندوستانی ؎

اصغر ہو یا کہ تم ہو مجھے سب سے پاس ہے   رخصت گلا کٹانے کی لو ماں تو پاس ہے

اس پر ماں کا یہ اشارہ ؎

تم سے پھوپھی خفا ہیں جھکا دو قدم پہ سر   قربان جاؤں عذر کرو ہاتھ جوڑ کر

سر کی نہ کچھ خبر ہے نہ چادر کا ہوش ہے
واری یہ پالنے کی محبت کا جوش ہے

اور بھتیجے کا یہ کہنا ؎

میری تو ماں ہیں آپ مجھے کیا کسی سے کام
بندے پہ کی ہے ماں نے یہ شفقت نہ باپ نے   راتوں کو جاگ کر مجھے پالا ہے آپ نے

یہ مشترک ہندوستانی تہذیب کی بڑی دلکش جھلکیاں ہیں۔ افسوس کہ اپنائیت و فراخدلی اور وسعتِ نظر کے یہ مظاہر اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

اب عرب مجاہد اور اس کی بہادر پھوپھی کی سیرت کی جھلک بھی دیکھتے چلیے۔ اکبر پھوپھی سے کہتے ہیں ؎

انصاف کیجیے کسے پیاری نہیں ہے جاں   کرتا ہے کون باغِ جوانی کو رائگاں

ایک نوجوان دل کی آواز ہے۔ مگر یہ آواز کسی مجاہد ہی کی ہو سکتی ہے کہ ؎

لیکن جہاں سے آج گذرنا ہی خوب ہے
عزت پہ آنچ آئے تو مرنا ہی خوب ہے

اب پھوپھی کا جواب سنیے ؎

کیوں کانپتے ہو، شک ہے، آنکھوں سے کیوں رواں   تم راست گو ہو سچ ہے تمھارا یہ سب بیاں
لو میں نے دی رضا تمھیں اے میرے نوجواں   تم جاتو آگے صدقے گئی اور تمھاری ماں

یوں تو تمام گھر کو محبت ہے آپ سے
کچھ ماں کا حق بھی کم نہیں ہوتا ہے باپ سے

اب زینب کے کردار کا ایک اور رخ بھی سامنے آتا ہے۔ وہ پالنے کے حق کا دعویٰ شکوے اور گلے، محبت کا ایک انداز تھا۔ اب انصاف پسندی اور حق کی پاسداری کا جلوہ دیکھیے جس بھاوج کی ابھی شکایت ہو رہی تھی اب بھتیجے کو اس کی محبت اور خدمت یاد دلائی جا رہی ہے ؎

آنکھیں بچھائیں ماں نے جو تم گھٹنیوں چلے ۔۔۔ تلووں سے اس نے دیدۂ حق بیں سدا ملے
نازوں سے منتوں سے مرادوں سے تم پلے ۔۔۔ صدقے گئی کبھی، تو لگایا کبھی گلے

مادر نے اپنی عمر مصیبت میں کھوئی ہے
برسوں یہ بی بی ایک ہی کروٹ سے سوئی ہے

ماں کی ماتا کی کیسی زندہ تصویر ہے۔ پھر کس فراخدلی سے اس حقیقت کا اعتراف ہو رہا ہے ؎

سچ ہے کہ اس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں ۔۔۔ ہوں لاکھ ان کی چاہنے والی، وہ پھر ہے ماں
آنکھوں کا نور، قلب کی طاقت، بدن کی جان ۔۔۔ آنچ آتما کی ہے وہ قیامت کہ الاماں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خبر ہے
ماں ہے تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

سوچ یہ سب خود ہی رہی تھیں مگر انداز بیان نسوانی فطرت کی بڑی خوبی سے ترجمانی کر رہا ہے۔ ابھی ماں کی محبت کا اعتراف جاری ہے ؎

ماں کی نہ کم توجہی اور نے کسی کا پیار ۔۔۔ غصہ ہو یا کہ سخت کہے دل میں ہے نثار
اور ساتھ ہی یہ احساس ؎

میرا ہے جب یہ حال پھر اس کی تو جان ہیں

امام حسینؑ کو معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کو ماں اور پھوپھی نے رخصت دے دی تو بڑی حسرت سے بہن سے کہتے ہیں ؎

تم دو گی رخصت ان کو مجھے یہ نہ تھا یقین سچ ہے اجل سے کچھ کسی انساں کا بس نہیں
لے جا ہے روکنا جو یہ طالب رضا کے ہیں
اب بنتِ فاطمہ یہ کرشمے قضا کے ہیں

علی اکبر کی خیمے سے رخصتی، جہاد اور شہادت کا بیان ہم شہر بانو کے تذکرے میں کر آئے ہیں۔ لیکن جب ماں باپ سے زیادہ چاہنے والی، پالنے والی پھوپھی پر یہ کوہِ الم گرتا ہے تب اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ اس کے جذبات واحساسات کی ترجمانی انیسؔ نے بڑی خوبی سے کی ہے ؎

لکھتا ہے ایک راویِ غمگین و پُر ملال یعنی ہوا ادھر علی اکبر کا انتقال
نکلی حرم سے ایک زنِ فاطمہ جمال گویا جنابِ سیّدہ کھولے ہوئے تھیں بال
تھی اس طرح سے رخ پہ ضیا اس جناب کے
حلقہ ہو جیسے نور کا گرد آفتاب کے

وہ عورت جس نے بیٹوں کے مرنے کے بعد دروازے سے قدم نہیں نکالا، بھتیجے کی شہادت کی خبر سن کر عالمِ بے قراری میں خیمے سے نکل کر میدانِ جنگ کی سمت دوڑتی ہے ؎

چلّاتی تھی ارے مرا پیارا ہے کس طرف اے آسماں وہ عرش کا تارا ہے کس طرف
اے ابرِ شام چاند ہمارا ہے کس طرف اے ارضِ کربلا وہ سدھارا ہے کس طرف
ہے ہے سناں سے جان گئی میہمان کی
میّت کدھر کو ہے مرے کڑیل جوان کی
گود کے پالے کو دیکھنے کو دل تڑپ رہا ہے ؎

اے میرے لمبے گیسوؤں والے کدھر ہے تو ہے ہے مری غریبی کے پالے کدھر ہے تو
واری کہاں لگے تجھے بھالے کدھر ہے تو کیوں کر پھوپھی جگر کو سنبھالے کدھر ہے تو
اٹھارواں برس تھا کہ موت آگئی تجھے
اے نورِ عین کس کی نظر کھا گئی تجھے

عالمِ بے قراری میں لاڈلے کی کیا کیا صفات بیان کرتی جا رہی ہیں ؎

ہے ہے مرے سعید و رشید و متیں جواں خوش رو جواں، غریب جواں، مہ جبیں جواں
صفدر جواں شکیل جواں، نازنیں جواں کس نے تجھے مروڑ لیا اے حسیں جواں
آغاز تھیں میں ابھی ایسے سن نہ تھے
بچے مرے! ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے

"کس نے تجھے مروڑ لیا اے حسیں جواں" اور" بچے ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے" دونوں مصرعے جذبات کی جس طرح ترجمانی کرتے ہیں اور جس سادہ روزمرہ میں ادا کیے گئے ہیں، ان کو سہل ممتنع کہا جاتا ہے۔ اس کا جواب اردو شاعری میں مشکل سے ملے گا۔

زینب کا جلال و دبدبہ دیکھ کر دشمن بھی لرز اٹھتے ہیں۔

گھبرا کے ایک شخص نے راوی سے یوں کہا بی بی یہ کون سی ہے جو نکلی ہے بے ردا
مریم ہے یا خدیجہ ہے یا بنت مصطفےٰؐ بولا وہ کانپ کر کہ قیامت ہوئی بپا
خواہر حسینؑ کی ہے نواسی نبی کی ہے
منھ پھیر لے ارے یہی بیٹی علی کی ہے

زینب ہر بات سے بے خبر، قتل کے میدان کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہیں کہ دور سے حسینؑ بہن کی آواز سنتے ہیں ؎

اس حشر میں جو شہ نے بہن کی سنی صدا جلدی اٹھا کے لاش چلے شاہِ کربلا

دیکھا کہ روتی آتی ہے زینب برہنہ پا — روکر پکارے وا عجبا، وا مصیبتا
سر ڈھانپ لو رِدا سے قیامت بپا نہ ہو
گھر میں چلو بہن علی اکبر خفا نہ ہو

پہلے حسینؑ پر رسول کی نواسی کو فوج دشمن میں ننگے سر دیکھ کر جو گذرتی ہے، اس کا بے اختیار اظہار ہے ”سر ڈھانک لو ردا سے قیامت بپا نہ ہو“ پھر جیسے ہی بہن کے صدمے کی شدت اور بے خودی کا احساس ہوتا ہے تو خود اسی محبت کا واسطہ دیتے ہیں ”علی اکبر خفا نہ ہو“ جانتے ہیں کہ اس وقت بھی وہ پیارے کی خفگی کا لحاظ کرے گی۔ بھائی کو بہن کی فکر ہے اور بہن اس حالت میں بھی بھائی کے صدمے اور حالت کا پورا احساس کر رہی ہے۔ بہن بھائی کی سچی گہری محبت کی کتنی حقیقی اور دلکش مرقع کشی ہے کہ وہ دوسرے کے فکر میں اپنا صدمہ بھول جاتے ہیں ؎

زینب تڑپ تڑپ کے یہ کہتی تھی بار بار — یہ لاش میری گود میں دیجیے بہن نثار
طاقت نہیں ہے آپ میں یا شاہِ نامدار — صدقہ گئی لرزتا ہے فاقوں سے جسمِ زار
شہ کہتے تھے یہ کام ہے مجھ خستہ جان کا
تجھ سے بہن نہ اٹھے گا لاشہ جوان کا

بھائی کی ہی نہیں، بھاوج کی بھی فکر ہے ؎

قربان گئی دیکھ کے حال آپ کا تغیّر — فرزند کو روسکتی نہیں بانوئے دلگیر

انھیں سمجھا رہی ہیں کہ اپنے کو سنبھالیے آپ کی فکر بانو کو اور کھائے جا رہی ہے ؎

دل ماں کا ہے کس طرح کلیجے کو سنبھالے — مرجائے وہ اٹھارہ برس تک جسے پالے
پر اب تو اسے آپ کے جینے کے ہیں لالے — کہتی ہے خدا کوکھ کو زہرا کے بچالے

جو سمجھی ہے بے جا نہیں واللہ بجا ہے
وارث کا غم اولاد کے ماتم سے سوا ہے

دیکھیے ہر ہر مصرع عورتوں کے روزمرہ ہی کا نہیں عورت کے دل کی سچی کیفیت کا بھی آئینہ دار ہے۔

زینب اور حسینؑ کو ایک دوسرے سے کتنی گہری محبت تھی اور دونوں ایک دوسرے کی کتنی عزت کرتے اور بھروسہ رکھتے تھے۔ اس کا انیسؔ کے کلام میں ہزاروں جگہ ذکر آتا ہے۔ کہیں صرف اشارے ہیں کہیں تفصیل کے ساتھ مرقع کشی کی گئی ہے۔ بہن بھائی کے گھر کی مختار، ان کے بچوں کی پرورش اور تربیت کی ذمہ دار ہے۔ ان کا اقتدار صرف بھائی کے گھر پر ہی نہیں بلکہ وہ حسینؑ کے ہر کام کی شریک، مشیر اور ان کے اعلیٰ مقاصد میں ہمیشہ ان کا ساتھ بھی دیتی ہے۔ مدینے سے روانگی کے وقت اور سفر کے دوران زینب کے مشورے اور رائے کا پاس جس قدر حسینؑ کو تھا اس کا ہم پہلے تذکرہ کر چکے ہیں۔ صبحِ عاشور علم بردار کے انتخاب میں بھی زینب کے مشورے کے بعد حسینؑ فیصلہ کرتے ہیں ؂

کی عرض جو صلاح شہِ آسماں حشم
اب تم کہو جسے اسے دیں فوج کا علَم
اس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم
فرمایا جب سے اٹھ گئیں زہرائے باکرم
مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خورد ہو
جس کو کہو اسی کو یہ عہدہ سپرد ہو

"بزرگ ہو یا خورد" میں یہ اشارہ پنہاں ہے کہ اگر تم کمسن عون و محمد کو اس جلیل عہدے کے قابل سمجھو تو حسینؑ اس پر تیار ہے۔ بہن کی دلداری ہے، اس کی رائے پر اعتماد ہے۔ اس کا احترام کرتے ہیں۔ یہ ہر ہر بات سے ظاہر ہو رہا ہے۔

مزاج آشنا بہن جانتی ہیں کہ حسینؑ کس کو علمبردار بنانا چاہتے ہیں۔ وہ مدبّر اور دانش مند ہیں۔ اس لیے سمجھتی ہیں کہ عباس کا انتخاب بہترین ہے۔ مگر ایک دم رائے ظاہر نہیں کی جاتی۔ حسینؑ بھائی ضرور ہیں لیکن امام اور ہادی بھی تو ہیں۔ اس لیے لحاظ مراتب رکھتے ہوئے کہتی ہیں۔

بولی بہن کہ آپ بھی تو لیں کسی کا نام — ہے کس طرف توجّہِ سردارِ خاص و عام
گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہِ آسماں مقام — قرآں کے بعد ہے تو علی ہی کا کچھ کلام

شوکت میں، قد میں، شان میں ہم سر کوئی نہیں
عبّاس نامدار سے بہتر کوئی نہیں

دلیلوں میں خلوص، جوش، محبت، فخر کیا نہیں ہے ؎

عاشق غلام، خادمِ دیرینہ، جاں نثار — فرزند، بھائی، زینتِ پہلو وفا شعار
جرّار، یادگار پدر، فخرِ روزگار — راحت رساں، مطیع و نمودار و نامدار

صفدر ہے شیر دل ہے بہادر ہے نیک ہے
بے مثل سینکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

بہن کے منھ سے بھائی کا ذکر اس انداز میں سن کر حسینؑ پر بہت اثر ہوتا ہے ؎

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن — ہاں تھی یہی علی کی وصیّت بھی اے بہن
اچھا بلائیں آپ کدھر ہے وہ صف شکن — اکبر چچا کے پاس گئے سن کے یہ سخن

کی عرض انتظار ہے شاہِ غیور کو
چلیے، پھوپھی نے یاد کیا ہے حضور کو

"آپ بلائیں"، یعنی چھوٹے بھائی کو یہ جلیل عہدہ آپ ہی کی بدولت مل رہا ہے۔ اکبر بھی جا کر چچا سے یہ نہیں کہتے کہ حسینؑ بلا رہے ہیں۔ بلکہ "پھوپھی نے یاد کیا ہے" عباس حسینؑ کے پاس آتے ہیں تو ؎

"جاؤ بہن کے پاس یہ بولا وہ دیں پناہ"

تو ے

زینب وہیں علم لیے آئیں بہ عزّ و جاہ — بولے نشاں کو لے کے شہِ عرش بارگاہ

ان کی خوشی ہے وہ جو رضا پنجتن کی ہے

لو بھائی لو علم یہ امانت بہن کی ہے

یہ وضعداری و دلداری کی وہ ادائیں ہیں جو کم سے کم ہندوستانی تہذیب کی جان سمجھی جاتی تھیں۔ خاص کر یہ آخری شعر کیا پورے قصیدے پر بھاری نہیں کہا جا سکتا۔

چھوٹے بھائی کو علم دیتے ہی زینب کے دل کی بات زبان پر آجاتی ہے ے

بھیّا تمھیں تو ہوگی خبر کتنی فوج ہے

کتنے جواں اُدھر ہیں اِدھر کتنی فوج ہے

اندازہ کرنا چاہتی ہیں کہ دشمن سے کہاں تک مقابلہ ہو سکے گا۔ مگر جب عباس یہ بتاتے ہیں کہ اِدھر بہتّر جوان ہیں اور اُدھر ہزاروں کی فوج تو بہلا ردِّ عمل عین نسوانی فطرت کے مطابق ہے ے

یہ سن کے بنتِ فاطمہ کی چھاتی پھٹ گئی — پھیلا کے ہاتھ شہ کے گلے سے لپٹ گئی

پھر فوراً ہی رضائے الٰہی پر راضی رہنے اور خدا پر بھروسہ رکھنے کا جذبہ غالب آجاتا ہے اور سر کھول کر دعا میں مشغول ہو جاتی ہیں ے

کی یہ دعا کریم مجھے شاد کیجیو

اس لشکرِ قلیل کی امداد کیجیو

معرکۂ حق و باطل ابھی گرم نہیں ہوا تھا کہ یزیدی لشکر کا ایک سردار حر بن ریاحی حسینؑ کی طرف آجاتا ہے۔ وہ واحد انسان جس پر حسینؑ کی تبلیغ و

ہدایت کا اثر ہوا تھا۔ وہی سب سے پہلے حسینی لشکر کی طرف سے یزیدی لشکر سے جا کر جنگ کرتا اور شہید ہوتا ہے۔ بھائی کے ایسے سچے جاں نثار کی آمد سن کر بہن کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ اس بات کو بھی باریک بین انیسؔ نظر انداز نہیں کرتے۔ فضّہ فوراً ہی خیمہ سے نکل کر امام حسینؑ سے کہتی ہے :۔

کی عرض یا امامِ دو عالم فلک جناب
کہتی ہیں میہماں کو دعا بنتِ بوتراب

اور فرماتی ہیں ؎

ان کا یہی ہے کام جو خوش اعتقاد ہیں — زہرا کی بہوئیں بیٹیاں سب اس سے شاد ہیں

پھر دل میں جو بات مدت سے کھٹک رہی ہے۔ وہ بے اختیار پوچھ بیٹھتی ہیں۔ کہ آخر پسرِ سعد کیوں میرے بھائی کا دشمن ہے۔ کیوں شام کی فوجیں حسینؑ پر چڑھائی کرنے آئی ہیں ؎

فرمایا ہے کہ اے مرے بھائی کے خیر خواہ — چڑھ آئی ہے حسین پہ کیوں شام کی سپاہ
ہے کیا ارادہ پسرِ سعدِ روسیاہ — اللہ جانتا ہے کہ سید ہے بے گناہ
کشتی محمدِ عربی کی اجڑ نہ جائے
پردیس میں حسین سے زینب بچھڑ نہ جائے

آخر کے تین مصرعے۔ جیسے کلیجہ چیر کر نکل پڑے ہیں۔ عباس میدان جنگ میں جاتے ہیں تو اگرچہ چھوٹے بھائی کی جدائی کا صدمہ ہے۔ فکر اپنی نہیں یہ ہے کہ حسینؑ پر کیا گذر جائے گی ؟۔ اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے (اپنا اپنا اندازِ فکر ہے) کہ زینب کو عباس سے کم محبت ہے کہ وہ سوتیلے بھائی ہیں۔ لیکن گہری نظر سے واقعاتِ کربلا کو دیکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے حسینؑ ماں جائے بھائی ہی نہیں امام اور رہنما بھی ہیں اور عباس و زینب دونوں ہی ان کی جان سب سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں۔

حسینؑ کی محبت میں احترام اور عقیدت ہے اور یہ عقیدہ کہ وہی تو دینِ محمدؐ کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ جو عورت اپنی کوکھ کی اولاد سے بھائی سے زیادہ محبت نہیں کرتی اور ان کی شہادت پر سجدۂ شکر کرتی ہے وہ اگر عباس کی رخصت پر اس حال میں کہ ؎

ڈھلکی ہوئی ہے سر سے ردا اور کھلے ہیں بال

یہ کہتی سنائی دے کہ ؎

چھوڑو نہ شہ کو اے اسد کبریا کے لال

کیا کہتے ہو سکینہ سے منھ موڑ موڑ کے
بھیا کدھر چلے مرے بھائی کو چھوڑ کے

تو کیا تعجب ہے؟ یہ دونوں بھائی بہن ایک ہی طرح شمعِ حسینؑ پر پروانہ ہیں اور اسی لیے دونوں ایک دوسرے کے دل کا حال اور محبت کی گہرائی کو سمجھتے، اپنے دل کی کیفیت ایک دوسرے سے کہہ لیتے ہیں ؎

دیکھو تو حالِ سبطِ رسولِ فلک اساس
بیٹے کا غم، بھتیجے کا ماتم، ہجومِ یاس
ہے کثرتِ سپاہ میں تنہا وہ حق شناس
قربان جاؤں تم تو رہو بے وطن کے پاس
عاشق ہو دلبرِ اسدِ ذوالجلال کے
بازو قوی تمھیں سے ہیں زہرا کے لال کے

عباس کی شہادت کی روح فرسا خبر سن کر حسینؑ بے قراری کے عالم میں بہن ہی کو آواز دیتے ہیں ؎

دریا پہ فوجِ شام نے مارا دلیر کو
زینب اجل نے چھین لیا میرے شیر کو

ان کا درد صرف بہن سمجھ سکتی ہے ؎

وہ عاشقِ حسین زمانے سے اٹھ گیا
زینب ہمارا چین زمانے سے اٹھ گیا

یہ سنتے ہی ؎

اکبر کو ہاتھ اٹھا کے پکاری وہ سوگوار　　ہے ہے حسین ہو گئے بے یار و غمگسار
ماتم جوان بھائی کا ہے تم پہ میں نثار　　اکبر خدا کے واسطے بابا سے ہوشیار
گرنے لگیں تو حیدرِ صفدر کا نام لو
بیٹا پدر کے ہاتھوں کو مضبوط تھام لو

بڑی فطری بات ہے جس بہن کا ایک بھائی اللہ کو پیارا ہو جائے۔ دوسرے کی محبت اور فکر دگنی ہو جاتی ہے۔

روزِ عاشورہ انیسؔ دوبار بہن بھائی کی رخصت دکھاتے ہیں۔ ایک صبح عاشورہ پہلی رخصت۔ دوسری بعدِ ظہر آخری رخصت۔ اس کی انھوں نے متعدد مرثیوں میں مرقع کشی کی ہے۔ اور ان دونوں رخصتوں میں جو نازک سا مگر بڑا اہم فرق ہے وہ بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ صبحِ عاشور زینب اگرچہ بہت فکر مند ہیں مگر ابھی امید باقی ہے۔ بھائی، بھتیجے، بیٹے سلامت ہیں حسینی فوج کمر بستہ حسینؑ کی نصرت کے لیے تیار کھڑی ہے۔

شبِ عاشور بھائی کی اور کنبے بھر کی سلامتی کے لیے بیقراری سے دعائیں مانگتے گذری تھی اور صبح کو ان کا یہ عالم تھا کہ ؎

زینب بلک رہی تھی پریشاں تھے سر کے بال　　نعلین کا نہ ہوش نہ چادر کا تھا خیال
سینہ کبود چاک گریباں شکستہ حال

اور جب امام حسینؑ نمازِ فجر کے بعد رخصت کے لیے خیمے میں جاتے ہیں تو ؎

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال　　چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینب کی یہ دعا ہے کہ اے ربِ ذوالجلال　　بچ جائے اس فساد سے خیر النساء کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

آفت میں ہے مسافرِ صحرائے کربلا بیکس پہ یہ چڑھائی ہے سیّد پہ یہ جفا
غربت میں بٹھن گئی جو لڑائی تو ہوگا کیا ان ننھے ننھے بچوں پہ کر رحم اے خدا
فاقوں سے جاں بلب ہیں عطش سے ہلاک ہیں
یارب ترے رسول کی ہم آلِ پاک ہیں

حسینؑ بہن کی بے قراری دیکھتے ہیں، دعائیں سنتے ہیں، حوصلہ بندھانے کے لیے اس وقت دلاسہ دینا ضروری ہے ؎

بولے قریب جا کے شہِ آسماں جناب مضطر نہ ہو دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب
مغرور ہیں خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب خود جا کے میں دکھاتا ہوں ان کو رہِ صواب
موقع بہن ابھی نہیں فریاد و آہ کا
لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

دوسرے مصرعے کی بلاغت قابلِ غور ہے پانچویں مصرعہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے کہ حسینؑ کے سمجھانے کا یہ مقصد نہیں کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ دشمن جنگ سے باز آجائے گا۔ لیکن عورتوں اور بچوں کی تسلی کرنا بھی ان کا فرض ہے مگر بہن سے "ابھی فریاد و آہ کا موقع نہیں" کہہ کر بات اشارۃً کہہ دی جاتی ہے کہ یہ وقت زیادہ دور بھی نہیں ہے بہن کو ابھی بہت کچھ سہنا اور جھیلنا اور بڑی بڑی ذمہ داریاں اٹھانا ہیں۔ اس لیے اس کو سنبھالے رکھنا ضروری ہے۔ بہن جو بھائی کے ہر حکم کو بجالانا اپنی سعادت سمجھتی ہے ؎

معراج میں رسول نے پہنا تھا جو لباس
کشتی میں لائیں زینب اسے شاہِ دیں کے پاس

حسینؑ اس مقدس پوشاک کو زیب تن کرتے ہیں ؎

بر میں درست و چست تھا جامہ رسول کا
رومال فاطمہ کا عمامہ رسول کا

بہن کو بھائی میں بزرگوں کی شان دکھائی دیتی ہے ؎

لے کر بلائیں بھائی کی رونے لگی بہن
چلائی ہائے آج نہیں حیدر و حسن — اماں کہاں سے لائے تمھیں اب یہ بے وطن
رخصت ہے اب رسول کے یوسف جمال کی
صدقے گئی بلائیں تو لو اپنے لال کی

دل میں وسوسے ہیں اندیشے ہیں جو دبائے نہیں دب رہے اور بے اختیار ایسی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں ؎

پوچھے گا کون ساتھ چھٹے گا جو آپ کا — ماں کا نہ آسرا ہے مجھے اب نہ باپ کا

بھائی بہن کے عزم حوصلۂ صبر و رضا سے آگاہ ہے مگر سمجھ رہا ہے کہ یہ بیقراری اس بے پناہ محبت کی وجہ سے ہے جو زینب کو مجھ سے ہے اور ایسی صاحبِ عزم کا اضطراب حسینؑ جیسے صابر کو بھی لرزا دیتا ہے ؎

زینبؑ کے اضطراب پہ شہ روئے زار زار — فرمایا اے بہن تری الفت کے میں نثار
یاد آگیا حسین کو اس وقت ماں کا پیار — لیکن میں کیا کروں نہیں کچھ میرا اختیار
واللہ اپنے قول کا ہر دم خیال ہے
بہنا حسین مخبرِ صادق کا لال ہے

جانتے ہیں کہ بزرگوں کے کردار اور مقام کو یاد دلا کر اور اپنے فرض اور وعدے کے نباہ کا تذکرہ کر کے ہی وہ بہن کو اس عظیم مصیبت کو سہارنے کے قابل بنا سکتے ہیں ؎

یہ سن کے گر پڑی جو قدم پر وہ نوحہ گر — لپٹا لیا گلے سے بہن کو بچشمِ تر
رو کر کہا کہ ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر — زینب خدا کے واسطے پیٹو نہ اپنا سر
خاصانِ حق کا خلق میں رتبہ بلند ہے
صابر رہو کہ صبر خدا کو پسند ہے

یہ پہلی رخصت تھی جس کے بعد حسینؑ باہر چلے جاتے ہیں اور اس کے بعد حسینؑ باہر اور زینب اندر معرکۂ حق و باطل کے نشیب و فراز دیکھتے رہتے ہیں، اور عزیزوں دوستوں اور لخت جگر بیٹوں تک کو راہِ رضا پر قربان کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر بعد ظہر اپنا سب کچھ راہِ حق پر نچھاور کرنے کے بعد صابر و شاکر حسینؑ اپنا سرِ اقدس راہِ خدا میں نذر دینے سے پہلے آخری بار حرم سے رخصت کے لیے خیمے میں آتے ہیں۔ اس وقت امام حسینؑ کی حالت کیا تھی ؎

رہتی یہ عزیزوں کا مرقع تو ہے ابتر　　شہ کا ہے یہ نقشہ کہ ہیں تصویر سے ششدر
فرزند نہ مسلم کے نہ ہمشیر کے دلبر　　قاسم ہیں نہ عباس نہ اکبر ہیں نہ اصغر
سب نذر کو دربارِ پیمبر میں گئے ہیں
رخصت کو اکیلے شہِ دیں گھر میں گئے ہیں

پہلی رخصت کے وقت اٹھارہ نوجوانوں کے ساتھ خیمے میں آئے تھے مگر اس وقت تن تنہا تشریف لائے ہیں ؎

خیمے میں مسافر کا وہ آنا تھا قیامت　　اک ایک کو چھاتی سے لگانا تھا قیامت
آنا تو غنیمت تھا یہ جانا تھا قیامت　　تھوڑا سا یہ رخصت کا زمانہ تھا قیامت
واں بین ادھر صبر و شکیبائی کی باتیں
افسانۂ ماتم تھیں بہن بھائی کی باتیں

اس آخری رخصت کا سماں انیسؔ نے کتنے ہی مرثیوں میں دکھایا ہے مگر اس مرثیے میں تو قلم توڑ دیا ہے۔ جیسے شاعر کا تخیل آنکھوں سے سب دیکھ رہا ہے۔ کانوں سے وہ مکالمہ سن رہا ہے جو بہن بھائی کے درمیان ہوا ہوگا۔ بہن عورت ہے جذبات کی شدتِ فرقت کا احساس اسے کچل رہا ہے۔ بھائی مرد ہے صاحبِ حوصلہ مردِ خدا جو اعلیٰ مقصد کے لیے جان دینے جا رہا ہے مگر سمجھ رہا ہے کہ اس کی مصیبتوں کا خاتمہ

بہن کی انتہائی مصیبتوں کی ابتدا ہے ے

حضرت کا وہ کہنا کہ بہن صبر کرو صبر
امت کے لیے والدہ صاحب نے سہے جبر
وہ کہتی تھی کیونکر نہ میں روؤں صفتِ ابر
تم بہنوکفن اور نہ بنے ہائے مری قبر
لٹتے ہوئے گھر اماں کا کن آنکھوں سے دیکھوں
ہے ہے تہ خنجر تمھیں ان آنکھوں سے دیکھوں

امید کا ہر تار ٹوٹ چکا ہے۔ بھائی سے جدائی مقدّر ہو چکی۔ اس لیے بیقراری صبح کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ گذرے مصائب نظروں میں پھر رہے ہیں اور آنے والی قیامت کا تصوّر لرزا رہا ہے ے

اس عمر میں تھوڑے غم جانکاہ اٹھائے
اشک آنکھوں سے اماں کے جنازے پہ بہائے
آنسو نہ تھمے تھے کہ پدر خوں میں نہائے
ٹکڑے دلِ شبّر کے لگن میں نظر آئے
حضرت کے سوا اب کوئی سر پر نہیں بھائی
انساں ہوں کلیجہ مرا پتھر نہیں بھائی

آخری مصرعے میں انسانی فطرت کی بولتی عکاسی نظر آتی ہے۔

یہ حقیقت جانتی ہیں کہ جو اس دنیا میں آیا وہ راہِ عدم کو ضرور جائے گا۔ مگر مصائب کے ایسے پہاڑ اتنے سے وقت میں کس پر ٹوٹے ہوں گے ے

ہر شخص کو یوں تو ہے سفر خلق سے کرنا
دشوار ہے اک آن مسافر کا ٹھہرنا
ان آنکھوں نے دیکھا ہے بزرگوں کا گذرنا
ہے سب سے سوا ہائے یہ مظلومی کا مرنا
صدقے گئی یوں رن کبھی پڑتے نہیں دیکھا
اک دن میں بھرے گھر کو اجڑتے نہیں دیکھا
ہے ہے میں تمھیں لے کے کہاں چھپ رہوں بھائی
لٹتی ہے مرے چار بزرگوں کی کمائی
کس دشت پر آشوب میں قسمت مجھے لائی
یارب کہیں مرجائے ید اللہ کی جائی

زہرا کا پسر وقت جدائی مجھے روئے
سب کو تو میں روئی ہوں یہ بھائی مجھے روئے

سارے آسرے مٹ گئے۔ دعائیں بے کار ہو گئیں مگر یہ دعا تو اب بھی قبول ہو سکتی ہے۔ مصیبت کی ایک آخری حد وہ بھی ہوتی ہے جب انسان صدقِ دل سے موت کی تمنا کرتا ہے۔ حسینؑ کی شہادت اٹل ہے مگر زینب کو اس سے پہلے موت تو آسکتی ہے۔ جانتی ہیں کہ بھائی راضی بہ رضا ہے جو ہونا ہے وہ ضرور ہو گا۔ مگر خود بھائی سے پوچھا جاتا ہے ؎

عادل ہو عدالت سے کہو یا شہِ صفدر — کیا کہہ کے دلِ زار کو سمجھائے یہ خواہر
دنیا میں کوئی اور ہے زینب کا برادر — قربان گئی صبر مجھے آئے گا کیونکر
مسند کو محمدؐ کی الٹتے ہوئے دیکھوں
ہے ہے یہ گلا تیغ سے کٹتے ہوئے دیکھوں

عجیب مجذوبانہ کیفیت ہے کہ کس طرح بھائی کی مصیبت اپنے سر لے لی جائے ؎

صدقے میں ترے اے اسد اللہ کے پیارے — اماں کے وہ دکھ درد مجھے یاد ہیں سارے
آقا ترے بدلے مجھے نیزہ کوئی مارے — سید ترے قدموں پہ کوئی سر مرا وارے
پردیس میں رسّی سے بندھیں ہاتھ بہن کے
مانجائے کو رہنے دیں مگر ساتھ بہن کے

بھائی کے دل پر بہن کی حالت دیکھ کر کیا بیت رہی تھی ؎

ہر آہ تھی حضرت کے کلیجے کے لیے تیر

مگر امید و رجا کا وقت گذر چکا، اب تو بہن کو حقیقت کا سامنا کرنے اور عزم و حوصلے کا درس دینے کا وقت ہے ؎

سر چھاتی سے لپٹائے ہوئے کہتے تھے شبیر — بس صبر کرو غش تمھیں آجائے گا ہمشیر

اور پھر یہ کہنا ؎

کیا جان گنوا دو گی بہن بھائی کے غم میں

مگر اس وقت جان دے دینا تو بہن کے دل کی سب سے بڑی تمنا ہے! مگر حسینؑ جانتے ہیں کہ اب ان کے مقصد کی تکمیل اور اس لٹے قافلے کی سنبھالنے کی ساری ذمہ داری زینب ہی پر آنے والی ہے ؎

گر مر گئیں ہو جائے گا گھر اور بھی خالی　　صدمے سے جیے گی نہ سکینہ مری پالی
ہو میرے یتیموں کو تمھیں پالنے والی　　صابر جو ہیں ملتا ہے انھیں رتبۂ عالی
ایسا تو کسی کو غمِ تنہائی نہ ہوگا
اللہ تو سر پر ہے اگر بھائی نہ ہوگا

جانتے ہیں زینب کس عظیم ہستی کی نواسی اور کن عالی مرتبت ماں باپ کی بیٹی ہے اس لیے انھیں سمجھاتے وقت معرفت میں ڈوبے جملے منھ سے نکل رہے ہیں جس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے ؎

عالم میں جو تھے فیض کے دریا وہ کہاں ہیں　　جو نورِ خدا سے ہوئے پیدا وہ کہاں ہیں
ہم سب سے جو تھے افضل و اعلیٰ وہ کہاں ہیں　　پیدا ہوئی جن کے لیے دنیا وہ کہاں ہیں
جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدؐ مرسل نہ رہے کون رہے گا

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ مرثیے رونے رلانے کے لیے ہوتے ہیں، اور محمدؐ مصطفیٰ کے نواسے کی شانِ صبر اور تسلیم و رضا کے منافی ہیں۔ وہ دیکھیں انیسؔ کے مرثیوں کو جن میں ہزاروں جگہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی تلقین، بے مثال صبر و برداشت اور یقین و ہدایت کے معرفت میں ڈوبے پیام مل سکتے ہیں۔

حسینؑ اب بہن کو دوسرے انداز میں سمجھاتے ہیں ؎

کیا آگے بہن کے کوئی مرتا نہیں بھائی — برسوں جو رہے وصل تو اک دن ہے جدائی
لٹ جاتی ہے اک آن میں برسوں کی کمائی — جاتی نہیں بے جان لیے جب اجل آئی

ملتا نہیں پھر خلق سے جو جاتا ہے زینب
رونے سے مسافر کہیں پھر آتا ہے زینب

یہ گریز دیکھیے ؎

زندہ ہوں تو آخر کبھی مرتا کہ نہ مرتا — آتی نہ اجل، سر جو تہ تیغ نہ دھرتا
پیمانہ کبھی عمر کا آخر مری بھرتا — گھر میں بھی جو ہوتا تو سفر خلق سے کرتا

اس اٹل حقیقت کو سمجھا کر پھر دل کی بات یوں کہنا ہے

پر آج کے مرنے میں بہن اور مزا ہے
خوشنودیٔ معبود ہے امت کا بھلا ہے

ایک ایک لفظ نواسۂ رسول کی سیرت اور کردار کا آئینہ دار ہے۔ ساتھ ہی دلداری اور اظہار محبت سے بہن کے زخموں پر مرہم بھی رکھا جا رہا ہے ؎

ہمشیر کا غم ہے کسی بھائی کو گوارا — مجبور ہے لیکن اسد اللہ کا پیارا
تیغِ غمِ فرقت سے کلیجہ ہے دوپارا — کس سے کہوں جیسا مجھے صدمہ ہے تمہارا

اس گھر کی تباہی کے لیے روتا ہے شبیر
تم چھٹتی نہیں ماں سے جدا ہوتا ہے شبیر

بہن کی خدمات اور قربانیوں کا اعتراف کر رہے ہیں ؎

مر کر بھی نہ بھولوں گا میں احسان تمہارے — بیٹوں کو بھلا کون بہن بھائی پہ وارے
پیارا نہ کیا ان کو جو تھے جان سے پیارے — بس ماں کی محبت کے یہ انداز ہیں سارے

مگر اب تمھارا فرض یہ ہے کہ ؎

فاقے میں ہمیں برچھیاں کھانے کی رضا دو — بس اب یہی الفت ہے کہ جانے کی رضا دو

یہ سن کر بہن بڑی عاجزی، بڑے دکھ سے جواب دیتی ہے ؎

زینب نے کہا مجھ سے نہ کچھ ہو سکا بھائی
شرمندہ ہوں میں آپ کے کچھ کام نہ آئی
بیٹوں کو فدا کر کے بھی تسکین نہ پائی
میری کہاں دولت کہاں زہرا کی کمائی
بے حکم جلو میں بھی بہن جا نہیں سکتی
زندہ تو ہے کس کام کی کام آ نہیں سکتی

جب کہ یہ روح فرسا حقیقت مان لی تو یہ پوچھنا بھی پڑتا ہے ؎

بعد آپ کے جیتی رہے زینب تو کرے کیا؟
تربت پہ رہوں آپ کی جاروب کشی کو
یا جاؤں وطن لے کے میں ناموسِ نبی کو

اتنا ہی نہیں یہ بھی پوچھ لیتی ہیں ؎

سب مر چکے قاسم ہیں نہ عباس نہ اکبر
عابد ہے سو بیمار ہے وہ بےکس و مضطر
ہے کون جو فکرِ کفن و گور کرے گا
مظلوم ہو تربت میں تمھیں کون دھرے گا

یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں ہم زینب میں ہندی عورت کا نہیں عرب عورت کا روپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستانی عورت کے منہ سے کسی پیارے کی زندگی میں ایسے لفظ نکلنا محال ہے۔

اب امام حسینؑ کی وصیت سنیے ؎

اور تم سے بہن اب یہ وصیت ہے ہماری
کھینچیو نہ بہت بعد مرے گریہ و زاری
ہر دم رہے لب پر کلمہ شکر کا جاری
خوش ہوتا ہے صابر سے بہت ایزد باری
تم واقفِ سر رشتۂ تسلیم و رضا ہو
منہ ڈھانپیو بالوں سے جو سر پہ نہ ردا ہو

ابّا کا گلا رسّی سے بندھتے ہوئے دیکھا　　رسّی سے بندھیں بازو تو کچھ کیجیو نہ شکوہ
بیٹی ہو ید اللہ کی ورثہ ہے تمہارا　　تقسیمِ صعوبات میں حصہ ہے تمہارا

اس طرح صبر و حوصلے کی تلقین کر کے اب دوسری ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور قدرتی طور پر ایسے وقت دل پر اثر اور جذبات کی شدّت نظر آتی ہے ؎

ہر چند کہ ہر بندے کا خالق ہے نگہبان　　کیا کیا کہوں دل میرا ابھر آتا ہے اس آن
کمسن ہے بہت بعد مرے اس کا رہے دھیان　　پر جانتی ہو تم کہ سکینہ ہے مری جان

گھر جلنے لگے جب تو کہیں اس کو چھپانا
معصوم کو ظالم کے طمانچوں سے بچانا

باتیں کیا تیر و نشتر ہیں جو سننے والوں کے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں اور اس عظیم انسان کو ہمارا آپ کا سا انسانی جذبات کا حامل پا کر اس سے ہماری محبت اور گہری ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس بچی سکینہ کو حسینؑ نہ تو اس کی ماں کے سپرد کرتے ہیں اور نہ اپنے وارث اور چوتھے امام سید سجاد کے بلکہ بہن کے سپرد کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس واقعے میں اپنا جانشین زینب ہی کو جانتے تھے آخری وصیّت کرتے وقت عام انسان اور فوق البشر کی سیرت کی کشمکش کس خوبی سے دکھائی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اُس دم درِ خیمہ سے سرک جائیو زینب
سر ننگے نہ لاشے پہ چلی آئیو زینب

خیال آتا ہے کہ اگر زینب میرا گلا تیغ سے جدا ہوتے دیکھے گی تو برداشت نہ کر سکے گی اور اس کی بے قراری اس آخری وقت میں خود انھیں بے چین کر دے گی، فرماتے ہیں ؎

خالق نے بنایا ہے تمھیں صاحبِ توقیر سر ننگے اگر خیمے سے تم نکلو گی ہمشیر
دشمن یہ کہیں گے ہے یہی خواہرِ شبیر بہنا میں تڑپ جاؤں گا اُس دم تہِ شمشیر

نہیں چاہتے کہ آخری وقت سوا یادِ الٰہی اور عشقِ الٰہی کے کوئی اور جذبہ، کوئی اور محبت دامن گیر ہو ؎

وہ وقت ہے ایسا کہ عبادت میں بسر ہو جز جلوۂ معشوق نہ کچھ پیشِ نظر ہو
امت کی دعا لب پہ ہو اور سجدے میں سر ہو کب حلق کٹا تیغ سے یہ بھی نہ خبر ہو

سب بھولا ہوں معنی یہی ہیں تسلیم و رضا کے
اپنی بھی نہ ہو یاد، سوا یادِ خدا کے

بہن کی محبت بڑھ کر اگر کوئی محبت ہے تو وہ خدا ہی کی ہے۔ ویسے اس کی حالت کا احساس اور اس کے دکھوں اور غموں کا اثر سب سے زیادہ گہرا ہے۔ بیوی سے رخصت ہوتے وقت انھیں سمجھاتے ہوئے جو منہ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے ؎

زینب کو تو دیکھو کہ ہیں کس دکھ میں گرفتار ایسا کوئی اس گھر میں نہیں بیکس و ناچار
تنہا ہیں کہ بے جاں ہوئے دو چاند سے دلدار دنیا سے گیا اکبرِ ناشاد سا غمخوار

بیٹے بھی نہیں گود کا پالا بھی نہیں ہے
ان کا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے

بہن کی بے کسی اور ساتھ ہی صبر و حوصلہ دکھا کر بیوی کو یہ ہدایت ؎

دیں وہ تمھارا ساتھ تم ان سب کے ساتھ ہو
میرا یہی ہے ساتھ کہ زینب کے ساتھ ہو

کہ جانتے ہیں کہ میرے بعد قیادت بہن ہی کے ہاتھ میں آئے گی۔

امام حسینؑ کی رخصت کے وقت تک زینب کی بے قراری اور بے خودی کی کیفیت حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ لیکن حسینؑ کے باہر جاتے ہی ذمہ داری کا احساس

بیدار ہو جاتا ہے۔ حسینؑ خیمے سے باہر آکر دیکھتے ہیں کہ گھوڑا کھڑا ہے اور کوئی رکاب تک تھامنے والا نہیں تو فوراً یہ احساس ہوتا ہے کہ بھائی اکیلا باہر گیا ہے اس وقت اندر سے ؎ زینب نے پکارا کہ تھمو آتی ہے خواہر

اے بھائی دکھاؤں کیسے تنہائی تمہاری تھامے گی رکاب آج یہ ماں جائی تمہاری

شہ نے کہا زینب تری الفت کے میں قرباں پھر گھوڑے کے نزدیک گئے سرورِ ذیشاں

اور پھر ؎

زینب نے رکھا ہاتھ رکابِ شہِ دیں پر
شبیر ہوئے جلوہ نما خانۂ زیں پر

امام حسینؑ میدانِ جنگ میں جاتے ہیں اور آخری حجت بھی تمام کرتے ہیں۔ کہ گمراہوں کو راہِ راست دکھانا اور اسلام کی سچی تعلیم دینا ان کا ورثہ ہے لیکن دشمن پر ہر بات بے اثر ثابت ہوتی ہے۔ وہ فوج سے جہاد کرتے ہیں۔ یہاں ہم شاعر کے عقیدے اور حقیقت کا ایک عجیب امتزاج دیکھتے ہیں۔ وہ نہایت خوبی اور کمال کے ساتھ ایک اور ہزاروں کی جنگ کی نقشہ کشی کرتا ہے۔ حسینؑ کی جنگ ہمارا موضوع نہیں اور میدانِ جنگ کا جو نقشہ انیسؔ نے کھینچا ہے اس پر ویسے بھی کوئی ایسا شخص ہی روشنی ڈال سکتا ہے جو اس فن سے کسی حد تک آگاہ ہو۔ مگر سبھی نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ انیسؔ نے اس میدان میں بھی وہ جوہر دکھائے ہیں جو اور کسی کے بس کے نہ تھے۔ بہر حال مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حسینؑ جو عرب کے بہادر ترین ہستیوں محمدؐ اور علیؑ کے ورثہ دار تھے۔ ان کی تیغ میں ذوالفقارِ حیدری کی کاٹ اور بازو میں زورِ حیدری تھا اور یہ تو تاریخی حقیقت ہے کہ ہزاروں کی اس فوج سے کچھ دیر حسینؑ نے بے مثال بہادری کے ساتھ جہاد کیا تھا۔ اس وقت بھی زینب درِ خیمے پر بہادر بھائی کی جنگ دیکھ رہی ہے لکھا ہے۔

جیسے ساری جان کھنچ کر آنکھوں میں آگئی ہے۔ میدانِ جنگ دُور ہے مگر خیمے بلندی پر ہیں اور کسی نہ کسی حد تک لڑائی کی صورتِ حال سمجھی جا سکتی ہے۔ بھائی ہمیشہ ال بہادری سے جہاد کر رہا ہے تو اس وقت علیؑ کی بیٹی پر بھی غم کا وفور نہیں شجاعت کا جذبہ طاری ہے ۔

زینب نے درِ خیمہ سے دیکھا جو یہ ساماں — چلاّئی کہ بھیا بہن اس ضرب کے قرباں
یہ پیاس کئی دن کی یہ دھوپ اُف یہ میداں — جلد آؤ کہ اب تن سے نکلتی ہے مری جاں

بچہ جو چھٹے باپ سے پالا نہیں جاتا
اب مجھ سے سکینہ کو سنبھالا نہیں جاتا

بات دادِ شجاعت سے شروع ہوتی ہے مگر فوراً ہی محبت غلبہ پا جاتی ہے اور بھائی کو میدانِ جنگ سے دم بھر کے لیے سہی بلا لینے کی کوشش پر ختم ہوتی ہے۔ نام اپنا نہیں سکینہ کا لیا جا رہا ہے کہ جانتی ہیں کہ بھائی کی جان اس بچی میں بستی ہے۔ مگر جنگ قریب الختم ہے زخمی حسینؑ وقت عصر قریب دیکھ کر ذوالفقار روک لیتے ہیں تو زینب بے قراری کے عالم میں چلاّتی ہیں ۔

کس نے کہا کہ ہاتھ لڑائی سے تھام لو
پھر کھینچو ذوالفقار کو یا شاہِ دیں پناہ — ہم کو بچاؤ قید سے ہم ہوئیں گے تباہ
شفقت کریگا آن کے رانڈوں پہ کون آہ — صدقے گئی سکینہ کے سن پر کرو نگاہ

مگر وہاں اب اور ہی عالم ہے۔ راہِ وفا کی آخری منزل تمام ہو رہی ہے۔ اور ہادیٔ برحق کا نواسہ ہزاروں زخموں سے چور ہو کر گھوڑے سے گر پڑتا ہے اور اپنی زخمی پیشانی جھلستی ریت پر سجدے میں رکھ دیتا ہے ۔

تھرّا کے جھکے سجدۂ حق میں شہِ ابرار — شورِ دہل و طبل ہوا فوج میں اک بار
خوش ہو کے پکارا پسرِ سعدِ جفا کار — اے خولی و شیش و بن ذی الجوشنِ جرّار

آخر ہے بس اب کام امامِ ازلی کا
سر کاٹ لو سب مل کے حسین ابن علی کا

لکھتا ہے یہ راوی کہ بپا ہو گیا محشر ۔۔۔ بارہ ستم ایجاد بڑھے کھینچ کے خنجر
اک سیدہ نکلی درِ خیمہ سے کھلے سر ۔۔۔ برقع تھا نہ مقنع تھا نہ موزے تھے نہ چادر
چلائے لعیں خوف سے ہاتھ آنکھوں پہ دھر کے
لو فاطمہ آتی ہیں بچانے کو پسر کے

دشمن کی فوج ہی کے راویوں نے جو واقعات امام حسینؑ کی شہادت کے وقت کے بعد میں بتائے اور تاریخ میں محفوظ رہ گئے ہیں ان کو انیس نے اپنے شاعرانہ انداز میں متعدد مرثیوں میں بیان کیا ہے ؎

اس بھیڑ میں آکر وہ ضعیفہ یہ پکاری ۔۔۔ اے سبطِ نبی ابن علی عاشقِ باری
گھوڑا تو ہے کوتل کہاں اتری ہے سواری ۔۔۔ بھیا بہن آئی ہے زیارت کو تمہاری
مرجاؤں گی حضرت کو جو پانے کی نہیں میں
بے آپ کو دیکھے ہوئے جانے کی نہیں میں

عالمِ بے قراری میں وہ بھول جاتی ہے کہ بھائی نے بے چادر نکلنے کو منع کیا تھا۔ یاد نہیں رہتا کہ انھوں نے یہ وصیت کی تھی کہ اس وقت میں سوائے خدا کی یاد کے سب بھول جانا چاہتا ہوں۔ یہ سب زینب کو یاد رہتا تو انیس کے کلام میں ان کا درجہ مقدس فرشتے کا ہوتا جو نازک اور دلکش انسانی جذبات سے محروم ہوتا ہے۔ وہ عاشقِ زار، جاں نثار بہن نہ ہوتی۔ یہی حال حسینؑ کا ہے کہ اپنے عالی مقام کے باوجود وہ انسانی رشتوں سے منسلک اور محبت کے بندھنوں میں بندھے ہیں۔ تبھی تو بہن کی آواز سن کر قاتل سے یہ کہتے ہیں ؎

آخر تو سفر ہوتا ہے اس دارِ محن سے
دو باتیں تو کر لینے دے بھائی کو بہن سے

یہ سن کر پتھر بھی پگھل جاتا ہے ؎

منہ پھیر لیا شمر نے خنجر کو ہٹا کے
دی شہ نے یہ زینب کو صدا اشک بہا کے
تڑپاتی ہو بھائی کو بہن بلوے میں آکے
دیکھو گی کسے ہم تو ہیں پنجے میں قضا کے
اٹھ سکتے نہیں جسم پہ تلواریں پڑی ہیں
گھبراؤ نہ اماں مرے پہلو میں کھڑی ہیں

انتہائی ناامیدی کی حالت میں بھائی کی آواز سن کر بہن کی کیا حالت ہوئی ہوگی یہ کوئی دردِ ہجر کی ماری بہن ہی سمجھ سکتی ہے۔ بلکتی ہوئی بھائی کی طرف دوڑی جا رہی ہیں ؎

اس وقت سب جہاں مری آنکھوں میں ہے سیاہ
لوگو! خدا کے واسطے مجھ کو بتاؤ راہ
سید کدھر تڑپتا ہے اماں کدھر ہیں آہ
کس سمت ہے نبی کے نواسے کی قتل گاہ
شعلے دل و جگر سے نکلتے ہیں آہ کے
یہ کون نام لیتا ہے میرا کراہ کے

کس نے صدا یہ دی کہ بہن اس طرف نہ آؤ
بس اب سفر قریب ہے للہ گھر میں جاؤ
اب ڈوبتی ہے آلِ رسولِ خدا کی ناؤ
یا مرتضیٰ غریبوں کے بیڑے کو تم بچاؤ
اب چھوڑ لو نہ دشتِ بلا میں حسین کو
یا فاطمہ چھپا لو ردا میں حسین کو

لیکن جب ؎

پہنچی جو قتل گاہ میں اس روک ٹوک پر
دیکھا سرِ حسین کو نیزے کی نوک پر

ایسے موقع پر اگر شاعر بہن کے جذبات اور احساسات کی کیفیت خود بیان کرتا تو تاثر دگنا اور منظر کشی حقیقی ہو جاتی مگر انیسؔ کتنا ہی بڑا شاعر سہی، دوسرے مرثیہ گوؤں کی طرح ان کا مقصد بھی مجلس کے آخر میں رونا رلانا ہوتا ہے اور عام طور پر سبھی مرثیہ نگار بین پر یعنی رنج و غم کے اظہار کو ماتم دار کی زبان سے بیان کرنے پر زور دیتے ہیں۔ انیسؔ بھی اس روایت کی پابندی کرتے ہیں۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہاں بھی ان کے ہاتھ سے حقیقت نگاری کا دامن نہیں چھوٹتا اور جذبات و احساسات کی شدت و نزاکت کا احساس ان کے قلم کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ زینب عالم بے قراری میں دشتِ کربلا میں بھائی کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں تو ایسے وقت بھی ان کے منھ سے جو فقرے نکل رہے ہیں وہ ثابت کرتے ہیں کہ چاہنے والی بہن کوئی معمولی عورت نہیں۔ بیاروں موئی، بے کس، بے سہارا عورت کس کو پکارے، کس سے فریاد کرے؛ ایسی حالت میں بے اختیار ماں اور باپ سے مدد کا طالب ہونا فطری بات ہے۔ دشمن کی صف لبستہ فوجیں، نیزوں کی نوکیں، تلواروں کی چمک کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکی ہے

زینب کو منع کرتے تھے ہر چند اہلِ شر — لیکن وہ دوڑی جاتی تھی بھائی کی لاش پر

یہ وہ مقام ہے جہاں تصور بھی ساتھ نہیں دے سکتا کہ بہن پر کیا گذری ہوگی مگر انیسؔ کو تو بہر حال اس کی حالت اور جذبات کی عکاسی کرنا ہے۔ اور کسی حد تک وہ اس میں کامیاب ہوتے ہیں ہے

نیزے کے نیچے آکے پکاری وہ سوگوار — سیدتری لہو بھری صورت کے میں نثار
ہے ہے گلے پہ چل گئی بھیا لہو کی دھار — بھولے بہن کو اے اسدِ حق کی یادگار

صدقے گئی لٹا گئے گھر وعدہ گاہ میں
جنبش لبوں کو ہے ابھی یادِ الٰہ میں

ابھی ابھی تو بھائی نے اسے پکارا تھا اور اب وہ صورت لہو میں نہا گئی، سر تن سے جدا ہو گیا۔ کس کا سر؟ سیّد کا سر، نواسۂ رسول کا سر، یہاں بھیّا کی جگہ سیّد کہہ کر شاعر بتانا چاہتا ہے کہ بہن کو اس کا شدّت سے احساس اور سخت صدمہ ہے کہ رسول کے نواسے کو ان کی امّت نے شہید کیا ہے۔ "وعدہ گاہ" اور "یادِ الٰہی" میں لبوں کی جنبش کا ذکر بھی ایسے وقت حسینؑ کی بہن ہی کر سکتی ہے۔ اپنی بے کسی کی حالت کا بیان کتنا سچا اور دردناک ہے ؎

بھیّا میں اب کہاں سے تمہیں لاؤں کیا کروں
کیا کہہ کے اپنے دل کو میں سمجھاؤں کیا کروں

کس کی دہائی دوں کسے چلّاؤں کیا کروں
بستی پرائی ہے میں کدھر جاؤں کیا کروں

دنیا تمام اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا
بیٹھوں کہاں کہ گھر تو عزاخانہ ہو گیا

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد زینب کی زندگی کا ایک باب ختم ہو جاتا ہے وہ باب زندگی جس میں اس نے بہت کچھ پایا تھا۔ بھائیوں کی رفاقت، بزرگوں کی محبت، بیٹوں اور بھتیجوں کا پیار، عزت، وقار، پھر سب کچھ کھو دیا۔ حسینؑ کی شہادت کے بعد اس بے کس، بےیار و مددگار، غم نصیب عورت کی زندگی میں کچھ بھی نہ رہا مگر......

اس وقت انھوں نے کس طرح حالات کا مقابلہ کیا؟ زندگی کے اس مختصر مگر کٹھن ترین زمانے کو کس شان سے گذارا؟ یہ آپ دوسرے باب میں دیکھیں گے۔

کردار زینب

شہادت حسینؑ کے بعد

خاندان کا رہبر و سرپرست شہید ہو چکا۔ فوج ختم، بیٹے، بھائی، بھتیجے خدا کو پیارے ہوئے۔ اب خاندانِ نبوت میں مردوں میں صرف ایک بیمار نوجوان سیّد سجاد باقی ہیں۔ جو نحیف و بے ہوش ہیں۔ باقی بیوہ عورتیں ہیں، ننھے یتیم بچے ہیں۔ نو عمر بے سہارا لڑکیاں اور یتیم بچی سکینہ ہے۔ بوڑھی خادمہ فضّہ ہے۔ اور حسینؑ کی دو بہنیں زینب اور کلثوم۔ زینب عمر میں بہن سے بڑی ہیں اور عزم و ثبات میں بھی۔ ان کی شخصیت بھی زیادہ مضبوط ہے اس لیے اگرچہ خاندان کی حفاظت کا کام دونوں انجام دیتی ہیں مگر اس کا زیادہ بار اور پوری ذمہ داری زینب ہی کے سر ہے۔

امام حسینؑ کو شہید کرنے کے بعد بھی یزیدی فوجوں کی دشمنی کی آگ ٹھنڈی نہیں پڑی بلکہ اب وہ اور زیادہ بے باکی سے اہل بیت رسول کو ستانے پر تُل گئے۔ وہ خاندانِ نبوت کے خیموں میں درانہ گھسے، عورتوں کے سروں سے چادریں چھینیں۔ بچے بچیوں کو نیزوں کی نوکوں سے زخمی کیا، اور بعد میں سب خیموں میں آگ لگا دی

حسینؑ کے گھرانے نے یہ رات جلے خیموں کے پاس جھلستی ریت پر گزاری۔ تاریخی روایتوں میں یہ واقعات مجمل طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ مرثیہ گو شاعروں نے انھیں اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ میرانیسؔ نے بھی شاعرانہ تخیل کی آنکھ سے یہ سب واقعات دیکھے اور متعدد مرثیوں میں ان واقعات کو اس طرح نظم کیا گویا شاعر وہاں موجود سب دیکھ اور سن رہا ہے۔ ان مرثیوں میں یوں ذکر سبھی کا آتا ہے مگر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پورے ماحول پر جو ہستی چھائی ہوئی ہے وہ زینب کی ہے۔

دشمن کی فوج خیموں میں گھس کر سب سے پہلے اہلِ بیتِ رسول کے سروں سے چادریں چھیننے کی کوشش کرتی ہے کہ باعزت عالی خاندان خواتین کی (معاذ اللہ) شان اور وقار اس سے کم ہوگا۔ اس وقت زینب غم اور غصّے میں یہ کہتی سنائی دیتی ہیں ؎

امت کا بزرگوں کی اگر دھیان نہ آتا   اے شمر ردا کو تو مری ہاتھ لگاتا
طاقت تھی کہ تجھ کو کوئی یوں آکے ستاتا   چادر تو مری چھینتا کوئی نہ بچاتا

اور پھر زبان پر بے خودی کے عالم میں یہ کلمات جاری ہوتے ہیں ؎

اس وقت نہیں مصلحتِ حضرتِ معبود   نانا یہیں موجود ہیں بابا یہیں موجود
پر کرتے ہیں ہم صبر کہ اللہ ہو خوشنود

یہ رنج گنہ گاروں کی راحت کے لیے ہیں
یہ ظلم سب امت کی شفاعت کے لیے ہیں

یزیدی فوج بے ہوش سیّد سجاد کو نیزے کی نوکوں سے ہوشیار کر کے قید کرنے لگتی ہے۔ تو وہ پہلو سے تلوار کھینچ کر غصّے میں کہتے ہیں ؎

او لعیں صاحبِ شمشیر کا پوتا ہوں میں   قید ہونے کا نہیں شیر کا پوتا ہوں میں

زینب کو اندیشہ ہوتا ہے کہ دشمن سید سجاد کو مار نہ ڈالے۔ حسینؑ کی نسل نہ مٹ جائے۔ وہ جانتی ہیں کہ اسی سے سادات کا نام باقی اور امامت کا سلسلہ قائم رہے گا۔ فوراً بھتیجے اور دشمنوں کے بیچ میں آجاتی ہیں، اور ان کو سمجھاتی ہیں ؎

کہا زینب نے پھوپھی صدقے ہوئے نورِ نظر　　کچھ تمھیں یاد ہے کیا کہہ گئے تھے تم سے پدر

جنگ کا قصد نہ اے سیدِ سجاد کرو
صدقے ماں باپ کی باتوں کو ذرا یاد کرو

یزید کے بعض مکار فوجی افسر سوچتے ہیں کہ اگرچہ حسینؑ کا سر یزید کے سامنے نہ جھک سکا۔ اُن کا ہاتھ اس کی بیعت کے لیے نہ بڑھا مگر ان کے گھرانے کی عورتیں اور یہ بیمار لڑکا مصیبتوں سے گھبرا کر ضرور بیعت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اور حسینؑ کے ہاتھوں جو شکست انھیں نصیب ہوئی اس کی کچھ تلافی ہو جائے گی۔ وہ لالچ دیتے ہیں کہ تم لوگ یزید کی بیعت کر لو پھر کوئی مصیبت نہیں سہنی پڑے گی اور یہی نہیں اپنے کشتوں کو دفن بھی کر سکو گے۔ یہ سن کر ابنِ حسینؑ سید سجاد غیض میں آجاتے ہیں ؎

خیمے جلیں اسیر ہوں ناموسِ مصطفیٰؐ　　زہرا کی بیٹیوں کو میسر نہ ہو ردا
سو بار تیغ سے کوئی کاٹے مرا گلا　　عابد کرے اطاعتِ فاسق یہ دخل کیا

میں جانشیں ہوں بادشہِ مشرقین کا
میرا چلن وہ ہے جو چلن ہے حسینؑ کا

زینب دشمن کی مکارانہ باتیں بھی سنتی ہیں اور امام ابنِ امام بھتیجے کا عارفانہ جواب بھی! خود ان ظالم جاہلوں کو بتاتی ہیں کہ تم جس سے یہ بات کر رہے ہو وہ کس قدر عالی مقام ہستی ہے ؎

عابد سے باتیں مکر کی کرتا ہے او پلید　　بابا شہید ہو، یہ کرے بیعتِ یزید

یہ دلبرِ بتول کا قائم مقام ہے
اس کا پدر امام تھا یہ بھی امام ہے

دشمن اس ناکامی سے اور بھی برافروختہ ہو جاتے ہیں اور خیموں کو لوٹنے پر تل جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر زینب ان کو سختی سے ملامت کرتی ہیں اور بھائی کے فقر و فاقے کا حال بتاتی ہیں مگر اس پر جو فخر اور ان کے کردار کی جس عظمت کا اظہار ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے ؎

گھر سخی کا ہے یہ بیجا ہے یہاں زر کا خیال　　کرتا تھا فاقے پہ فاقہ اسداللہ کا لال

اور ان کو آگاہ کرتی ہیں ؎

نہ دفینہ ہے نہ زیور ہے نہ دولت ہے نہ مال

اور پھر انتہائی حسرت سے یہ کہنا کہ خزانہ تو تم پہلے ہی لوٹ چکے ؎

اب حسین ابن علی سے ہے زمانہ خالی
ہو گیا آج محمدؐ کا خزانہ خالی

دشمن بے کجاوہ اور بے عماری اونٹوں پر ناموسِ محمدؐ کو بٹھاتے اور اونٹوں کی مہار سید سجاد کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ سواری کے وقت بے اختیاری کے عالم میں زینب کے منھ سے نکلتا ہے ؎

کس طرف ہو علی اکبر یہ پھوپھی تم پہ نثار
گرد اونٹوں کے قنات آکے لگا دو بیٹا　　ہاتھ پکڑو مجھے محمل میں بٹھا دو بیٹا

مدینے سے روانگی کے وقت کا منظر نظروں میں پھر رہا ہے اور پیاروں کی یاد دل پر چھریاں چلا رہی ہے ؎

اونٹ آئے ہیں سواری کو یہ اے نورِ نظر　　نہ کجاوہ ہے نہ ہودج نہ عماری جن پر
دیر سے بھائی کو چلاتی ہوں میں خستہ جگر　　اپنی ماں جائی کی لیتے نہیں اس وقت خبر

سر پہ چادر نہیں ہے شان ہماری دیکھو
آج ناموسِ محمدؐ کی سواری دیکھو

آخری شعر پورے مرثیے پر بھاری ہے۔

کوفے کے سفر پر دشمن اہلِ بیت کو لے کر روانہ ہوتے ہیں۔ قافلہ مقتل کی طرف سے گذرتا ہے تو باغِ محمدی کے سارے نونہال سر بریدہ نظر آتے ہیں ؎

مقتل میں جو وہ قافلہ سب نوحہ گر آیا — تیغوں سے قلم باغِ محمدؐ نظر آیا

اپنے پیاروں کی لاشیں دیکھ کر عورتیں نالہ و ماتم کرنے لگتی ہیں۔ بچے تڑپ جاتے ہیں ؎

اہلِ حرم میں ہائے حسینا کی تھی پکار — بائیں جو بیٹھی تھیں تو بچے تھے بے قرار
چلاتی تھی یہ زینبِ مغموم بار بار — بھیا تمہارے لاشۂ بے سر کے میں نثار
کیوں کر ردا اڑھاؤں تنِ چاک چاک پر
مسندِ نبی کی چھوڑ کے سوتے ہو خاک پر

انقلابِ زمانہ کا گلہ کرنے کا انداز کتنا پر درد مگر باوقار ہے ؎

بچپن سے سدا دوشِ نبی پر تمھیں دیکھا — چھاتی پہ یداللہ کی اکثر تمھیں دیکھا
گودی سے جدا ماں کی نہ دم بھر تمھیں دیکھا — اور آج کے دن خاک پہ بے سر تمھیں دیکھا

بھائی کے بچپن کی شان یاد آئے چلی جا رہی ہے ؎

اک روز وہ تھا بھیجی تھی اللہ نے پوشاک — اور اونٹ سواری کا بنے تھے شہِ لولاک
یا جامۂ تن آج ہوا تیغوں سے صد چاک — کس بیکسی سے آج پڑے ہو بسرِ خاک
آرام پس از رنج و محن بھی نہیں ملتا
مظلوم ہوا ایسے کہ کفن بھی نہیں ملتا

جب تک مرحوم کا کفن دفن نہ ہو جائے پس ماندوں کو قرار نہیں آتا

اس وقت سید سجاد اور زینب کے لیے سب سے زیادہ یہ چیز کرب ناک تھی کہ وہ اپنے پیاروں کو بے گور و کفن چھوڑ کر دشمن کی قید میں جا رہے ہیں۔

فوجِ دشمن پر نہ بچوں کی بے قراری کا اثر ہوتا ہے نہ بیبیوں کی گریہ وزاری کا، چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد ابن زیاد اور یزید کے دربار میں سرِ حسینؑ اور ناموسِ حسینؑ کو لے کر جائیں اور انعام واکرام و جاگیر و عہدے پائیں۔ چنانچہ اس حالت میں کہ ننگے اونٹوں پر اہلِ بیت جن کے بازو رسی سے بندھے تھے اور اونٹوں کی مہار طوق و رسن پہنے سید سجاد ہاتھ میں لیے تھے، یہ لٹا قافلہ کوفے پہنچتا ہے تو زینب دیکھتی ہیں کہ سارا شہر تماشا دیکھنے جمع ہے۔ عورتیں اور بچے در و بام سے نظارہ کر رہے ہیں۔ یہ کوفہ زینب کے والد محترم علیؑ مرتضیٰ کا دارالخلافہ ہے جہاں عورتیں درسِ ہدایت لینے علیؑ کی عقیلہ بیٹی کے پاس آیا کرتی تھیں۔ اور مردِ عقیدت سے ان کا نام لیتے تھے۔ اور اس وقت ؟ ؎

ننگے سر بیٹھی تھی اک اونٹ پہ بنتِ زہراؑ ۔۔۔ نہ قصابہ تھا نہ برقع تھا نہ تھی سر پہ ردا
دیکھ کر سوئے فلک کہتی تھی اے بارِ خدا ۔۔۔ آل کا یہ ترے محبوب کی رتبہ پہنچا
یہ ستمگار نہیں پاس ہمارا کرتے
پاس آ آکے ہیں رانڈوں کا نظارا کرتے

اور جب فوجِ یزید زینب کو اندر دربار میں لے جانا چاہتی ہے تو وہ کہتی ہیں ؎
وہ ہے مرتد اسے صورت نہ دکھاؤنگی میں
سامنے حاکم اظلم کے نہ جاؤنگی میں

جب ابنِ زیاد کو یہ معلوم ہوتا ہے تو وہ غصے میں کہتا ہے ؎
میں تو سنتا ہوں بہت بے کس و مجبور ہیں وہ
کوئی وارث ابھی جیتا ہے کہ مغرور ہیں وہ

دشمن زینب کو رسی سے باندھ کر دربار میں کھینچ کر لے جانا چاہتا ہے تو امامِ وقت اس کو سرزنش کرتے اور خود پھوپھی سے درخواست کرتے ہیں ؎

آپ کے رتبے سے آگاہ یہ جلاد نہیں
بابا صاحب کی وصیت تمھیں کیا یاد نہیں

زینب دربار میں جاتی ہیں، وہ کم ظرف نبی کی نواسی سے کہتا ہے ؎

شرط اب ہے کہ نہ آنے کی سزا میں تجھے دوں

تو زینب فرماتی ہیں ؎

دین و دنیا کے شہنشاہ کی بیٹی ہوں میں
او ستمگر اسد اللہ کی بیٹی ہوں میں

تیغ کیوں سبطِ پیمبر پہ چلائی تو نے | کی بلا کر مرے بھائی سے برائی تو نے
شکل نامحرموں کو میری دکھائی تو نے | ہائے لوٹی مری اماں کی کمائی تو نے

کیا جواب اس کا پیمبر کو تو دے گا ظالم
تو نے برباد کیا خانۂ زہرا ظالم

ظالم اپنی تحقیر پر بے آپے ہو کر زینب کے قتل کا حکم دے دیتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ یہ اسی بھائی کی بہن ہے جس نے راہِ حق میں دل کی پوری آمادگی کے ساتھ جان دے دی ؎

سن کے یہ کھینچ لی اک دشمنِ دیں نے تلوار | سر جھکا خاک پہ تب بیٹھ گئیں زینبِ زار
دوڑے تھامے ہوئے زنجیر امامِ بیمار | لپٹیں تب کہہ کے یہ اس بی بی سے اے انڈین ناچار

ظلم عورت پہ یہ اللہ سے ڈر اے ظالم
دخترِ فاطمہ کو قتل نہ کر اے ظالم

شاعر اپنے عقیدے کے مطابق بتاتا ہے کہ شہیدوں کے سردار امام حسینؑ کا

سرا عجاز سے حاکم کوفہ سے خطاب کرتا ہے ؂

قتل زینب کو کرے تو یہ ترا کیا مقدور

فضل خالق سے ہیں مجبور نہیں ہوں ظالم   اب بھی چاہوں تو ترا تخت الٹ دوں ظالم

زینب مہینوں کا صعوبت کا سفر طے کر کے دمشق پہنچتی ہیں اور دربارِ یزید میں جاتی ہیں اس وقت کی مرقع کشی انیسؔ نے زیادہ چابکدستی اور خوبی سے کی ہے اس میں آورد نہیں آمد کی شان ہے اور جزئیات پر نظر اور زیادہ گہری ہے، دیکھیے ؂

پیچھے بیمار کے ہے قافلۂ اہلِ حرم   چپ ہیں تصویر سے گویا کہ کسی میں نہیں دم
دخترِ فاطمہ زہرا کا عجب ہے عالم   تھرتھری جسم میں ہے اٹھ نہیں سکتے ہیں قدم

روکے فرماتی ہیں کس گوشے میں جائے زینب

ہاتھ کھل جائیں تو منھ اپنا چھپائے زینب

امام بھتیجے سے التجا کر رہی ہے ؂

مجھ کو دربار کی آفت سے بچاؤ واری

اس وقت سید سجاد کی یہ دلیل اہلِ بیت کے کتنے شایان شان ہے ؂

تم نورِ خدا ہو تمھیں کیا دیکھیں گے ناری

ادھر یزید بے چین ہے ؂

دم بدم تخت سے اٹھ اٹھ کے یہ کہتا ہے شریر   قیدی کیوں جلد نہیں آتے ہیں کیا ہے تاخیر

کوئی شخص جواب دیتا ہے ؂

ضعف سے پاؤں کو تھم تھم کے اٹھاتے ہیں اسیر

اس میں یہ نکتہ بھی چھپا ہے کہ یہ بات سن کر اسے خوشی ہوگی کہ حسینؑ کے گھرانے والوں کا بھوک، پیاس اور تکلیفوں سے یہ حال ہو گیا ہے کہ چلتے بھی نہیں بنتا، ساتھ ہی کوئی یہ بھی بتاتا ہے ؂ ہر قدم ایک ضعیفہ کو غش آجاتا ہے

اس پر ؎

بولا وہ کون سی عورت ہے، وہ محبوسِ ستم　　　عرض کی اس نے کہ ہمشیرِ شہنشاہِ امم
باپ جس کا ہے علی پشت پناہِ عالم　　　جس کی ماں فاطمہ ہے فخرِ جنابِ مریم
ہے جو سلطانِ عجم اس کی نواسی ہے وہ
کلمہ گو جس کے ہیں سب اس کی نواسی ہے وہ

یزید ہی کے مصاحب کے منھ سے زینب کے مرتبے کا اظہار کرا کے انیس یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ لوگ ان کے مرتبے سے آگاہ تھے اور ان کے بزرگوں کے شرف سے منکر نہ تھے نہ ہو سکتے تھے۔ (کتنے ہی تاریخی واقعات ایسے ملتے ہیں جب ابنِ زیاد یا یزید کے دربار کے لوگوں نے اس ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کیا اور یزید کو لعنت و ملامت کی ہے)

وہی شخص حضرت زینب کی بزرگی اور حالت کا بیان کیے جا رہا ہے ؎

ہے وہی حضرتِ جعفر کی بہو سینہ فگار　　　وہی زینب ہے جو شبیر کی تھی عاشقِ زار
لاشۂ شہ پہ وہ اشتر سے گری تھی کئی بار　　　بعد مرنے کے بھی ہے بھائی بہن میں ہی پیار
قافلہ یوں تو سبھی شام و سحر روتا ہے
پر وہ روتی ہے تو شبیر کا سر روتا ہے

اور جب اس دربار خاص و عام میں آلِ محمدؐ داخل ہوتے ہیں تو ؎

گو کہ اس روز تھیں سیدانیاں کھولے ہوئے بال　　　منہ چھپانے کو کسی پاس نہ تھا ایک رومال
بیٹیوں کا اسد اللہ کی اللہ رے جلال　　　آنکھ اٹھا کر کوئی دیکھے نہ کسی کی تھی مجال
جلوۂ روشنیِ طور نظر آتا تھا
کچھ نہ آنکھوں کو بجز نور نظر آتا تھا

دربار پہ سناٹا چھا گیا۔ لوگوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ بعض ایسے

کور باطن بھی تھے جو اس وقت بھی اہلِ بیت کو ستا کر خوش ہو رہے تھے۔ یزید سید سجاد اور زینب پر طنز وطعن کی بوچھار کرتا اور بزعم خود انھیں شرمندہ اور ذلیل کرنا چاہتا ہے ؎

تخت کے سامنے روتے ہوئے آئے جو اسیر — دیکھ کر سیدِ سجاد کو بولا وہ شریر
سرکشی کر کے نہ سربر ہوئے مجھ سے شبیر — شکر کرتا ہوں کہ خالق نے کیا تم کو حقیر
بیٹھنے کا کہیں دنیا میں ٹھکانہ نہ رہا
پنجتن اٹھ گئے اب زور تمھارا نہ رہا

جن پنجتن کی عظمت سے آگاہ ہے انھیں کے لیے ہوسِ دنیا اور ظاہری فتح نے دل کی آنکھیں کور اور ضمیر مردہ کر دیا ہے اور جس پیغمبر کا کلمہ گو ہے انھیں کے لیے کہتا ہے ؎

ہاں کہو آج بچانے کو پیمبر ہیں کہاں — کیا ہوئے ابنِ علی حیدرِ صفدر ہیں کہاں
قید میں ان کے بہو آئی ہے شبر ہیں کہاں — ننگے سر زینبِ دلگیر ہے اکبر ہیں کہاں
ذبح خنجر سے ہوا جو، وہ پدر کس کا ہے
اک ذرا غور سے دیکھو تو یہ سر کس کا ہے

کس کے ناموس لٹے کس کا ہوا گھر تاراج — کون بے سر ہوا اور کون ہوا صاحبِ تاج
ایک چادر کے لیے کس کی بہن ہے محتاج — کون کمزور ہے اور کون زبردست ہے آج
فوج بے سر ہوئی، سلطانِ حجازی نہ رہے
جن کی تلوار کا شہرہ تھا وہ غازی نہ رہے

حسد، جلن، رقابت، احساسِ کمتری اور ظلم وہوس کی دنیا ایک ایک مصرعے میں چھپی ہے۔ شاعر حسینؑ اور خاندانِ حسینؑ کے دشمنوں کی نفسیاتی کیفیت اور اس حسد وجلن کی وجہ بڑے کمال سے دکھاتا ہے اس شیخی اور غرور میں ہم اس کی ذہنی سطح کی

پستی صفائی سے دیکھ سکتے ہیں۔

قاتل، غاصب، مرتد دشمن کے منہ سے اپنے بزرگوں کی شان میں یہ گستاخی سنتیں اور اپنے پیارے بھائی کی شہادت اور اہلِ حرم کی حالت پر خوش ہوتے دیکھتی ہیں تو علیؑ کی بیٹی کو غصہ آجاتا ہے۔ وہ پورے جلال اور اپنے باپ کی سی فصاحت و بلاغت کے ساتھ جواب دیتی ہے۔ (ان کی یہ تقریر دوسری تقریروں کی طرح تاریخ کربلا میں محفوظ ہے۔) اس تقریر کی روانی، جوش و خلوص اور درد ایسا ہے کہ دشمن شرم سے پانی پانی ہوجاتے ہیں۔ زینب کی ان تقریروں کا خلاصہ مرثیہ گو شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ میرانیسؔ نے بھی بڑی خوبی سے اس کو نظم کیا ہے جس سے زینب کی خوداعتمادی، بے خوفی، بہادری اور حق گوئی پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ باطل سے نہ دبنے والی اور ببانگِ دہل اپنی بات تلواروں کے سایے میں کہنے والی مضبوط شخصیت کی مالک تھیں ؎

سن کے یہ آگیا بنتِ شہِ مرداں کو جلال تھرتھرا کر کہا کیا بکتا ہے او بداقبال
صاحبِ عزت و توقیر محمدؐ کی ہے آل کبھی ہم لوگوں کی عزت پہ نہ آئیگا زوال
ہم کو بے قدر جو سمجھا تو خطا کرتا ہے
دیکھ مصحف میں خدا کس کی ثنا کرتا ہے

اپنے نانا محمد مصطفٰےؐ کے مرتبے کا اظہار فرماتی ہیں ؎

ہاں بتا آیۂ تطہیر کسے آیا ہے دوست اپنا کسے اللہ نے فرمایا ہے
ھَل اَتیٰ کس کے لیے روح امیں لایا ہے کس نے معراج کا دنیا میں شرف پایا ہے
قرب ایسا کسے اللہ کی درگاہ میں ہے
فرق قوسین بتا کس میں اور اللہ میں ہے

اپنے باپ کا پیشِ خدا جو رتبہ ہے اس کا ذکر کرتی ہیں ؎

زور اپنا کسے اللہ نے امداد کیا — خانۂ کفر کو کس شیر نے برباد کیا
حق نے قرآن کے سورہ میں کسے یاد کیا — کس کو اکملت لکم دینکم ارشاد کیا
کس کی ہر جنگ میں حاضر صفِ کفار آئی
بدر میں کس کے لیے عرش سے تلوار آئی

ملامت کی جا رہی ہے تو آلِ احمدؐ کی تحقیر کرنا چاہتا ہے یہ نہیں جانتا کہ ان کا رتبہ کیا ہے؛ اور اس ظلم کا نتیجہ بہت جلد تیرے سامنے آنے والا ہے ؎

آلِ احمدؐ کو حقارت سے نہ دیکھ او مقہور — سب پہ روشن ہے کہ ہم لوگ ہیں اللہ کا نور
مار کر سبطِ پیمبر کو یہ نخوت یہ غرور — خیر ہم دور نہ تو دور نہ محشر ہے دور
حق کا دریائے غضب جوش میں جب آویگا
باندھنا ہاتھ کا سادات کے کھل جاوے گا

پھر اندازِ ملامت بدلتا ہے۔ یہ تنگ دل، تنگ نظر جس کے دل پر کفر کا غلاف اور آنکھوں پر ہوس کے پردے پڑے ہیں، سمجھتا ہے کہ حسینؑ کو قتل کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ حسینؑ کا قتل پنجتن کا قتل ہے۔ ملامت میں طنزیہ انداز نے اور زیادہ زور واثر پیدا کر دیا ہے ؎

فخر کیوں کر نہ کرے تو کہ یہ ہے فخر کی جا — تو نے اللہ کے محبوب کا کاٹا ہے گلا
ہو گئے سرخ لہو میں حسنِ سبز قبا — فاطمہ ذبح ہوئی شیرِ خدا قتل ہوا
آگ دی خیموں کو اور زیور و زر لوٹ لیا
جس کے درباں تھے ملک تو نے وہ گھر لوٹ لیا

یہ کہتے کہتے اپنی اور اپنی بہن بھاوجوں اور لڑکیوں کی موجودہ حالت کا احساس غالب آجاتا ہے۔ اور لہو میں ڈوبے جملے منہ سے نکلتے ہیں ؎

تیرے ناموس تو ہیں پردہ نشین او ظالم — بال بکھرائے کھڑے ہیں ترے دربار میں ہم

ہائے بے پردہ ہے بانوئے امامِ عالم ہے سکینہ پہ وہ ظلم اور یہ کبریٰ پہ ستم

ننگے سر قید میں اک رات کی بیاہی آئی

تجھ کو شادی ہوئی اور ہم پہ تباہی آئی

سامنے آلِ رسول اور بنتِ علیؑ کا یہ بیان! دربار میں جتنے لوگ تھے وہ لرز اٹھے۔ دل سینوں میں کانپنے لگے۔ کچھ بے اختیار رونے لگے، یزید دوسروں کی اور خود اپنی نظروں میں ذلیل و خوار ہوگیا تو غصے سے بے آپے ہوکر اپنی ذلت کو چھپانے اور زینب کو دکھ دینے کے لیے اس نے وہ حرکت کی کہ زینب بے قرار ہوگئیں ؎

تخت کے نیچے دھرا تھا جو سرِ پاکِ امام متوجہ ہوا شرما کے ادھر حاکمِ شام

اور ان ظلم رسیدوں پہ جفا کرنے لگا

لبِ فرزندِ پیمبر پہ چھڑی دھرنے لگا

زینبِ عالمِ غیض میں اسے للکارتی ہیں ؎

اس چھڑی کو مرے بھائی کے لبوں سے سرکا بوسے لیتے تھے انھیں ہونٹوں کے محبوبِ خدا

یہ چھڑی ہائے غضب اور لبِ پاکِ شبیر نہ ستا مجھ کو میں ہوں بنتِ شہِ خیبر گیر

جس صابرہ نے ہر صدمہ، ہر ستم خاموشی سے جھیلا۔ بھائی کے قتل، خیموں کی غارت گری اور آتش زنی تک سہار لی۔ قید و بند کی صعوبت خاموشی سے جھیل لی حسینؑ کے سرِ اقدس اور لب ہائے مطہر کے ساتھ یہ بے ادبی کسی طرح برداشت نہ کر سکی ؎

ان کھلے بالوں کو اب ہاتھوں پہ دھرتی ہوں میں

لے شکایت تری اللہ سے کرتی ہوں میں

مظلوم کی آہ جب عرش تک پہنچے تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ تھرتھرا نہیں جاتا اور ظالم کا سنگھاسن ڈول نہیں سکتا۔ اور یہ تو علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹی محمدؐ کی

نواسیؐ مظلوم شہید کی بہن کی فریاد تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس کی فریاد ظالم کا تختہ ضرور الٹ دے گی۔ اس عقیدے کو شاعر یوں بیان کرتا ہے ؎

کہہ کے یہ غیض میں آئی جو علی کی جائی　　آسماں آ گئے جنبش میں زمیں تھرائی

مگر سید مظلوم حسینؑ شہید کو یہ گوارا نہ ہوا کہ نانا کی امت پر اس طرح تباہی آئے اس لیے ؎

سرِ شبیر سے ناگاہ صدا یہ آئی　　تھام لے غصے کو زینب ترے صدقے بھائی
نہ تلاطم میں کہیں قہرِ الٰہی آئے
کہیں امت کی نہ کشتی پہ تباہی آئے

تم تو آگاہ ہو شبیر نے جو دکھ پائے　　پر نہیں حرفِ شکایت کا زباں پر لائے
سر کو چھوڑا لیا حبِ نبی کو قاتل آئے　　ہم نے امت کے لیے چھاتی پہ نیزے کھائے
چپ ہیں ہم جو بھی ستم راہِ رضا میں ہوگا
اس کا انصاف تو دربارِ خدا میں ہوگا

یزید ایک تیرہ و تار زنداں میں اہل بیت کو قید کر دیتا ہے۔ حساس شاعر کا تصور قید خانے کی حالت دیکھ لیتا ہے ؎

کیجیے شکستگی کا خرابے کی کیا بیاں　　ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر، ہراس کی جا خوف کا مکاں　　وہ شب کہ الحذر وہ اندھیرا کہ الاماں
ظلمت سرائے گور تھی زنداں کا گھر نہ تھا
حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

اس گھر میں اہلِ بیتِ محمدؐ ہوئے تھے بند　　جز کھنگی جسے نہ کسی نے کیا پسند
تنگی سے ایک ایک کو تکلیف تھی دو چند　　تھوڑی سی جا مگر کہیں پست اور کہیں بلند

گھبرا کے چھت کو بیبیاں ہر بار تکتی تھیں
ٹوٹے مکاں کی رات کو کڑیاں کڑکتی تھیں

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر　　ظاہر تھے جا بجا حشراتِ زمیں کے گھر
تھے وقفِ آشیانِ ابابیل سقف و در　　نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

گرمی کی فصل اور ہوا کا وہ احتباس　　وہ ضیق اس مکان کی اور قید کا ہراس
اندوہ کا وفور دلوں پر ہجوم یاس　　مائیں جو تہلکے میں تو بچے تھے بے حواس
دیواریں بھی شکستہ تھیں در بھی جھکے ہوئے
جانیں بھی غم سے تنگ تھیں دل بھی رکے ہوئے

لیکن اس وقت بھی حسینؑ کی بہن کا صبر اور حوصلہ قائم ہے دوسروں کی ہمت بندھائی جا رہی ہے، راضی برضا رہنے کی تلقین ہو رہی ہے ؎

ایک ایک سے یہ کہتی تھی زینب جگر فگار　　لائق نہ اس مکان کے تھے ہم گناہگار
مجبور جو غریب ہوں کیا ان کا اختیار　　سایہ تو ہے سروں پہ کرو شکرِ کردگار
ہے جائے گریہ حالِ شہِ مشرقین پر
کیا گذری ہوگی دھوپ میں لاشِ حسین پر

بہرحالت، ہر مصیبت میں دھیان بھائی ہی کی طرف جاتا ہے۔ ہمارے سروں پر سایہ تو ہے پر پیارے بھائی کی لاش تو دھوپ میں پڑی ہے یہ احساس کلیجے کے ٹکڑے کر رہا ہے مگر ایمان کا ثبات اور رضائے الٰہی پر شاکر رہنے کے جذبے میں کوئی فرق نہیں ؎

پیاسا گلا کٹا کے موئے جس کی راہ میں　　سونپی ہے میں نے لاش اسی کی پناہ میں

بھائی کا ذکر لب پر آتے ہی دریائے الفت جوش میں آجاتا ہے۔ ایسی حالت میں حسرت وتمنّا کا یہ بے اختیار اظہار کتنا فطری محسوس ہوتا ہے ؎

رسّی مرے گلے کی کوئی کھول دے اگر
مقتل کو ڈھونڈتی ہوئی جاؤں برہنہ سر
نکلی میں جب تو پھر نہیں درکار راہبر
رستے میں پوچھ لوں گی کہ ہے کربلا کدھر
ممکن ہے یہ کہ لاش کو زینب نہ پائے گی
بھائی کے خون کی بو مجھے کوسوں سے آئے گی

اور جب پھوپھی کی یہ باتیں یتیم سکینہ سنتی ہے اور بے تاب ہو کر کہتی ہے کہ پھوپھی خدا کے لیے مجھے بھی ساتھ لیتی چلو۔ تو بدنصیب بہن تصور کی دنیا سے حقیقت کی پتھریلی چٹان پر آگرتی ہے ؎

رو کر تب اس یتیم سے زینب نے یہ کہا
واری کہاں میں اور کہاں دشتِ کربلا
بے کس اسیرِ دامِ بلا غم کی مبتلا
قیدی کو کون جانے کی دیگا بھلا رضا
بھائی کی لاش پاس اگر رہنے پاتی میں
زنداں میں قید ہونے کو کاہے کو آتی میں

ایک ایک لفظ خونِ حسرت میں ڈوبا ہوا ہے ؎

ہے دشتِ کربلا تو کئی دن کی یاں سے راہ
ایسے کہاں نصیب کہ حاصل ہو وصلِ شاہ
گھر میں یزید کے ہے سرِ شاہ دیں پناہ
ہم قید اس مکاں میں ہیں بے جرم و بیگناہ
ہم سا کوئی جہاں میں نہ آفت نصیب ہو
ممکن نہیں کہ سر کی زیارت نصیب ہو

یزید کی بیوی ہندہ خاندانِ رسالت کی پروردہ ہے جہاں وہ زینب و کلثوم کو دین کی شہزادیاں سمجھتی تھی اور اپنے کو لونڈی ــــ وہ ان سے بے حد محبت و عقیدت رکھتی تھی۔ مگر گردشِ روزگار سے آج وہ حاکمِ وقت کی بیوی ہے اور علیؑ کی بیٹیاں

اس کے شوہر کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر قید خانے میں ہیں۔ لیکن وہ اس سے بے خبر، صرف ہمدردی میں کچھ مصیبت زدہ قیدیوں کو دیکھنے کے لیے قید خانے میں آجاتی ہے۔ اس خبر کو سن کر اگرچہ ہر بی بی پر اثر ہوتا ہے مگر یہ وقت زینب کے لیے سب سے زیادہ سخت ہے۔ زینب جو کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک ننگے سر پھر چکی ہیں۔ زینب جو کوفہ و دمشق کے درباروں میں جا چکی ہیں۔ آج ایک شناسا عورت کا سامنا کرنے سے لرز رہی ہیں۔ یہ خالص نسوانی فطرت ہے جسے شاعر سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ عالی مرتبت امام زادی بھی اس سے مبرا نہیں ہو سکتی۔ انھیں ماضی کی یاد آتی ہے، بزرگوں کی عزت کا خیال آتا ہے، حال کی تباہی نظروں میں پھر رہی ہے کس درد سے کہتی ہیں ؎

اپنا نہیں خیال بزرگوں کا پاس ہے
ہے ہے کہاں چھپوں وہ مری روشناس ہے

یہاں شاعر کا کمال دیکھیے، کس طرح زینب کی سیرت کی عالی ظرفی اور شرافت اور اخلاق کو ایک لفظ میں سمو دیا ہے۔ "روشناس" ہے۔ وہ یہ نہیں کہتیں کہ وہ میرے گھرانے کی باندی تھی۔ آج ظالم حاکم کی بیوی بن کر ہمیں ذلیل کرنے آرہی ہے۔ کوئی سخت کلمہ یا لفظ منہ سے نہیں نکلتا۔ شوہر کے جرم کا ذمہ دار وہ اسے نہیں سمجھتی ہیں۔ اور پھر روشناس کہہ کر اسے برابری کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ مگر بھائی کی عزت و وقار کا پاس خون رلا رہا ہے ؎

ہے شرم کی جگہ کہ میں ہوں خواہرِ امام
غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام
ہم ہیں فقیر ہم میں امیروں کا کیا ہے کام
لوگو بتا نہ دیجیو کہیں اس کو میرا نام
پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینب کہاں گئی
کہہ دیجیو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی

پھر دوسری بیویوں کے پیچھے سر جھکاکر چہرہ بالوں میں چھپاکر بیٹھ جاتی ہیں کہ شاید ہند کی نظر نہ پڑے۔ ہند آتی ہے قیدیوں میں آلِ رسول کی شباہت پاکر لرزتی، کانپتی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ کبھی سید سجاد میں حسینؑ کا جلوہ دیکھ کر کلیجہ تھام لیتی ہے۔ کبھی بانوے حسینؑ کی شان اور جمال دیکھ کر حیران ہوتی ہے ایک ایک سے مدینے والوں کی خیریت تڑپ تڑپ کر پوچھتی جاتی ہے ؎

سنتی ہوں میں مدینے میں ہے آپ کا وطن　　للّٰہ کچھ کہو خبرِ سرورِ زمن
ہیں خیریت سے حضرتِ شبیر کی بہن　　زندہ رکھے جہاں میں انھیں ربِ ذوالمنن
وہ بی بی روحِ بنتِ رسالت پناہ ہے
عصمت پہ جس کی خالقِ اکبر گواہ ہے

انیس نے دکھایا ہے کہ شیریں جو شہر بانو کی کنیز رہ چکی ہے۔ اگرچہ اہلِ بیت سے بے حد عقیدت رکھتی ہے مگر وہ ان کے لیے بیقرار نظر آتی ہے ہند کو بھی اگرچہ سارے اہلِ بیت سے عقیدت اور محبت ہے مگر زینب سے جو گہری عقیدت اور محبت ہے وہ اور کسی سے نہیں۔ وہ ایک ایک سے ان کا حال پوچھتی آگے بڑھتی ہے یہاں تک کہ پریشان حال زینب تک پہنچ جاتی ہے اور ؎

جوڑ کر ہاتھ کہا سر تو اٹھاؤ بی بی　　کیوں جھکی جاتی ہو صورت تو دکھاؤ بی بی
کیا مصیبت ہوئی روداد سناؤ بی بی　　میں موئی جاتی ہوں آنسو نہ بہاؤ بی بی

وہ زینب کی کنیزی میں رہی ہے اس لیے اس کے دل میں درد اور انسانیت کا جذبہ ہے اسیروں کو یہ کہہ کر تسلی دینا اس کا ثبوت ہے ؎

گر ردا سر پہ نہیں کون سی ہے شرم کی بات　　صدقے جاؤں یہ زمانے کے ہیں سب مکروہات
نہ تو دولت کو نہ حشمت کو ہے دنیا میں ثبات　　روزِ بد واسطے نیکوں کے ہے اے نیک صفات
رنج دنیا میں ہے خاصانِ خدا کی خاطر
سب سے افزوں ہے بلا اہلِ ولا کی خاطر

اس کے بعد وہ سیدۃ النساء فاطمہ زہرا کی عسرت اور مصیبت اور ان کے مرتبے کا ذکر کرتی ہے تو فضہ بیتاب ہو کر رونے لگتی ہے اس وقت زینب اس اندیشے سے کہ ہند کو حقیقت حال کی خبر نہ ہو جائے کہتی ہیں کہ ہم فاطمہ زہرا کے پڑوس میں رہتے تھے۔ یہاں انیس زینب کو ایک عام عورت کی طرح بہانے اور عذر تلاش کرتے دکھاتے ہیں، جو ان کے کردار کے منافی ہے۔ خود انیس نے جو نقشہ ان کی سیرت کا پیش کیا ہے۔ اس میں بھی یہ ٹکڑا کھپتا نہیں ہے۔ لیکن عام انسانی اور نسوانی فطرت کے عین مطابق کہا جا سکتا ہے ؎

تب کہا ہند سے زینب نے یہ با دیدۂ نم
زیرِ دیوارِ رسول دوسرا رہتے تھے ہم

رتبۂ فاطمہ کو یوں سبھی پہچانتے ہیں ۔۔۔ ان پہ گذری جو مصیبت وہ ہمیں جانتے ہیں

ہند امام حسینؑ اور ان کے بچوں کا حال پوچھتی ہے کہ ؎

حُسنِ ہمشکلِ پیمبر کا بہت ہے شہرا ۔۔۔ سن میں اٹھارہ برس کا ہے وہ خورشید لقا
روحِ مادر ہے دل و جان شہ والا ہے
کہتے ہیں حضرتِ زینب نے اسے پالا ہے

اور اس طرح ذکر کرتے کرتے کہتی ہے ؎

شہر بانو کا بھی ہے دیکھنے کا شوق کمال ۔۔۔ بیٹی سلطانِ عجم کی ہے وہ فرخندہ جمال
شور سنتی ہوں کہ رکھتی ہے عجب حسن و جمال ۔۔۔ اس پہ شیدا ہے نہایت اسد اللہ کا لال
اس کے بچے بھی جئیں اور وہ سدا شاد رہے
کوکھ آباد رہے مانگ بھی آباد رہے

کوکھ اجڑی سہاگ لٹی شہر بانو کی یہ سن کر حالت ابتر ہو جاتی ہے ؎

مُردنی سی رخ بانوئے حزیں پر چھائی ۔۔۔ اڑ گیا رنگ مگر آہ نہ لب تک آئی

پر دلِ زار نے سینے میں نہ آرام لیا
یک بیک ہائے پسر کہہ کے جگر تھام لیا

ہند سخت پریشان ہوکر وجہ پوچھتی ہے تو زینب کلیجے پر پتھر رکھ کر یہ کہتی ہیں کہ ان کا بھی جوان بیٹا مرگیا ہے اس لیے ؎

دردِ دل ہے کوئی دم چین نہیں لیتی ہے ذکر اولاد کا جب آتا ہے رو دیتی ہے

اسے ہم انیس کے بہترین مرثیوں کی خصوصیات کا حامل نہیں کہہ سکتے۔ اس میں حقیقت کا وہ رنگ نہیں جھلکتا جس کی بدولت کربلا کی خونیں کہانیوں میں انیس جان ڈال دیتے ہیں۔ بلکہ کسی داستان کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب ہند خود حضرت زینب سے یہ کہتی ہے ؎

ہرگز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے زینب تمھیں ہو خالقِ اکبر گواہ ہے

تو زینب کا یہ کہنا ؎

دخترِ حیدرِ کرّار کہاں اور میں کہاں

گو کہ دنیا میں پیمبر نہیں سر پر اس کے سچ ہے یہ حیدرِ صفدر نہیں سر پر اس کے
واقعی خلق میں شبرؑ نہیں سر پر اس کے کیا حسین اس کا برادر نہیں سر پر اس کے

سن میں چھوٹے ہیں یہ بیٹوں کی اسے آس تو ہے
علی اکبر تو ہے قاسم تو ہے عباس تو ہے

دخترِ فاطمہ اور شام کے زنداں میں اسیر؟ بیٹی محتاجِ ردا باپ دو عالم کا امیر؟
کیا محمدؐ کی نواسی کی یہی ہے توقیر؟ قید کیونکر وہ ہوئی قتل ہوئے کیا شبیر؟

رتبۂ دخترِ زہرا کے برابر کب ہوں؟
گر حسین اٹھ گئے دنیا سے تو میں زینب ہوں؟

ہر ہر انکار میں اقرار ہے، درد ہے، گلا ہے، جو قیامتیں لوٹی ہیں ان کی

طرف بے اختیار اشارہ ہے۔

اور یہ باتیں کرتے کرتے بے ہوش ہوجاتی ہے تو فضہ رو کر پکار اٹھتی ہے ؎

قتل شبیر کا احوال سنایا نہ گیا　　قید میں نام بھی غیرت سے بتایا نہ گیا

ہند پر حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے تو وہ چلّا اٹھتی ہے ؎

اے میری شاہزادی چھپاؤ نہ مجھ سے حال

تم کو قسم ہے فرقِ شہِ مشرقین کی　　جلدی کہو خبر مرے آقا حسینؑ کی

(تو ہند کی بے قراری زینب کے ضبط کے بندھن توڑ دیتی ہے وہ حسینؑ کے دشمن اور قاتل کی بیوی سے نفرت نہیں کرتیں! اسے لعنت ملامت نہیں کرتیں! یہ تک نہیں کہتیں کہ تیرے شوہر نے میرے بھائی اور سارے خاندان کو قتل کرا ڈالا۔ بلکہ اس کی محبت اور وفاشعاری سے متاثر ہوتی ہیں۔ اسے اپنا ہمدرد پا کر انسانی فطرت کے عین مطابق خود بھی اس کے ساتھ نالہ و فریاد کرنے لگتی ہیں ؎

اے ہند کٹ گیا سرِ شبیر نامدار

پانی دیا نہ سبطِ رسالت پناہ کو　　حاکم نے بے گناہ کیا قتل شاہ کو

اور یہ حاکم کون ہے تیرا شوہر، اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتیں یشکوہ کا جو انداز بے اختیار پیدا ہوگیا ہے اس میں بھی ہند سے شکایت کا کوئی پہلو نہیں نکلنے پاتا ہے

اے ہند کیا کہوں خبرِ شاہِ تشنہ لب　　ہنگامِ عصر کٹ گیا زہرا کا باغ سب

مطلق ڈرا نہ خالقِ اکبر سے بے ادب　　چوبِ یزید اور لبِ شبیر ہے غضب

رونے نہ پائے ماتمِ شاہِ شہید میں

سر ننگے لے گئے ہمیں بزمِ یزید میں

اے ہند رن میں شاہ کے یاور ہوئے شہید　　عباس قتل ہوگئے اصغر ہوئے شہید

بن بیاہے دشت میں علی اکبر ہوئے شہید　　شبّر کا لال اور مرے دلبر ہوئے شہید
مرجھا کے فاطمہ کی نہ کھیتی ہری ہوئی
بچوں سے گود ہو گئی خالی بھری ہوئی

یہاں بھی اپنے بچوں کا ذکر سب سے بعد میں آتا ہے اور آخری مصرعے میں صرف اپنی بھری گود کا نہیں سب کو کھ اجڑی ماؤں کی گودوں کا ماتم ہے۔

بے قراری کی یہ کیفیت جو ہند کے سامنے ظاہر ہوئی ایک بے ساختہ اور فطری عمل تھا لیکن جب یزید دوبارہ اہلِ بیت کو اپنے دربار میں بلاتا ہے اور دربان وغیرہ کہتے ہیں کہ اب تمھیں حاکم رہا کر دے گا خوشی مناؤ، تو زینب کی کیا حالت ہوتی ہے ؎

میں سوگ میں ہوں کیسی خوشی کیسی رہائی　　کس سے ملوں گی چھوٹ کے کیا جیتے ہیں بھائی
ماں جائی نے گردن تہِ شمشیر کٹائی　　بھائی سے تو اب تابہ قیامت ہے جدائی
کیا لطف چھٹے قید سے گر پیاروں کو کھو کر
دکھلاؤں گی صورت کسے بن بھائی کی ہو کر

ہر زخم سے تازہ لہو رِس رہا ہے ؎

بتلاؤ خوشی قید سے اب چھوٹنے کی کیا　　بیٹے ہیں کہ پھر جن سے ہو ملنے کی تمنا
قاسم ہیں کہ دکھلائیں گے آکر مجھے سہرا　　اکبر ہیں جنھیں دیکھ کے ٹھنڈا ہو کلیجہ
لاشے بھی ابھی تو نہیں پیاروں کے گڑے ہیں
آباد تھا گھر جن سے وہ جنگل میں پڑے ہیں

سید سجاد سمجھاتے ہیں کہ اس وقت حاکم کی بات مان لی جائے۔ کیوں؟
کب سے نہیں کی سبطِ پیمبر کی زیارت
شاید ہو میسّر سرِ سرور کی زیارت

تو زینب یہ کہہ کر ؎

مختار ہو تم اب تو میں ہوں ساتھ تمھارے

بھتیجے کے ساتھ دربار میں جانے پر تیار ہو جاتی ہیں۔

یزید سال بھر میں اندازہ کر چکا ہے کہ حسین پر یہ "فتح" اسے بہت مہنگی پڑی گی ساری دنیائے اسلام میں جو اضطراب و بے چینی پھیل چکی ہے اس کا نتیجہ اس کے حق میں کیا ہوگا اور حسینؑ کا خونِ ناحق کس طرح رنگ لائے گا اس خوف سے اس کا خواب و خور حرام ہو رہا ہے۔ اب وہ اہلِ بیتِ رسول کو قید سے رہا کر کے مدینے روانہ کرنا چاہتا ہے کہ شاید اس طرح آنے والا خطرہ ٹل جائے اور مکاری سے سید سجاد اور زینب کے سامنے شرمندگی کا اظہار کرتا اور "خون بہا" دینے کی تجویز رکھتا ہے ؎

تم فیض کے دریا ہو سخی ابنِ سخی ہو — سرزد ہوا ہے جرم جو مجھ سے اسے بخشو

تو سید سجاد جو امامِ وقت ہیں اس مکارانہ عذر کا جواب صرف اتنا دیتے ہیں ؎

مجھ سے یہ نہ کہہ زینبِ دلگیر کے ہوتے — مالک میں نہیں شاہ کی ہمشیر کے ہوتے

اور اس طرح بتا دیتے ہیں کہ حسینؑ کے بعد خاندان کی سردار زینب اور صرف زینب ہیں اور ہر معاملے میں ان کا فیصلہ آخری فیصلہ ہے ؎

زینب سے مخاطب ہوا کہنے وہ اظلم — اے بنتِ علی دخترِ مخدومۂ عالم

فی الواقعی بھائی کا نہایت ہے تمھیں غم — پر کرتا ہوں جو عذر، پذیرا ہو وہ اس دم

بے جرم کٹا حلق حسین ابنِ علی کا

جو مانگو وہ دوں خون بہا سبطِ نبی کا

غمزدہ بیمار وں موئی نحیف و نزار قیدی بے بس عورت کی یہ سن کر کیا حالت

ہوتی ہے ؟

یہ سنتے ہی تھرّانے لگی زینبِ مضطر — سینے میں کلیجے پہ لگا ظلم کا خنجر
رو رو کے لگی کہنے کہ خاموش ستم گر — میں کون ہوں جو لوں دیتِ خون برادر

قیدی ہوں گنہگار ہوں نالاں و حزیں ہوں
واللہ میں اس خون کی مختار نہیں ہوں

اور پل بھر میں یہ قیدی و بے بس مظلوم و ستم رسیدہ عورت پس پشت رہ جاتی ہے اور علیؑ کی نڈر، بہادر، حق گو بیٹی، قاتل، غاصب، ظالم کو ملامت کرتی للکارتی نظر آتی ہے ؎

اس خون کے خواہاں ہوں تو ہوں احمدؐ مختار — اس خون کا دعویٰ کریں یا حیدرِ کرّار
یا حشر کے دن ہوئے گی ماں اس کی طلبگار — یا خالقِ اکبر کو ہے اس خوں سے سروکار

کیوں ذبح کیا سبطِ رسولِ عربی کو
اس خوں کی دیت دیجیو زہرا و علی کو

غصّہ بڑھ رہا ہے کہ اس مردود کی یہ ہمت کہ حسینؑ کا خوں بہا دینے کا نام لے ؎

واللہ ہے اس ذکر سے چھاتی مری پھٹتی — میں ایسی ہوں جو لوں گی دیت لینے پہ راضی
اس خون کے بدلے دو جہاں بخشے جو کوئی — قیمت نہ ہو اک موئے حسین ابنِ علی کی

مقدور تجھے کیا ہے تو کیا دیوے گا ظالم
کس کس کا ابھی خون بہا دیوے گا ظالم

جلال کے عالم میں زینب کی آواز کی کڑک گویا عرش کو ہلا رہی ہے ؎

شبیّر کا خوں احمدِ مختار کا خوں ہے — شبیّر کا خوں حیدرِ کرّار کا خوں ہے
یہ خون تو زہرا جگر افگار کا خوں ہے — یہ خونِ حسن سیدِ ابرار کا خوں ہے

تنہا نہیں سبطِ شہِ لولاک کو مارا

تو نے تو لعیں پنجتنِ پاک کو مارا

دلیلیں ابھی ختم نہیں ہوئیں ؎

مارے گئے سرور تو ہوئے قتل پیمبر　　　بے سر ہوئے شبیر تو بے سر ہوئے حیدر

تلوار چلی فاطمہ زہرا کے جگر پر　　　پھر ہو گیا ٹکڑے جگرِ حضرتِ شبر

بے جرم مرے بھائی کا سر تن سے اتر جائے

ممکن ہے کہ یہ خوں تری گردن سے اتر جائے

یزید لاجواب ہے، کیا کہے، کیا نہ کہے؛ بات ٹال کر کہتا ہے ؎

بولا کہ رہا میں نے کیا قید سے تم کو　　　اسباب ضروری جو تمھیں چاہیے سو لو

تو بھائی سے بچھڑی بہن بے اختیار چلاتی ہے ؎

نے مال نہ اسباب نہ زر چاہیے مجھ کو　　　بچھڑی ہوئی ہوں بھائی کا سر چاہیے مجھ کو

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یزید سچ مچ شرمندہ ہوا ہوگا۔ لیکن جب زینب حسینؑ کے سر کا مطالبہ کرتی ہیں تو یزید کی مکاری کا پول کھل جاتا ہے وہ جواب میں کہتا ہے ؎

سب کچھ دیا پر ایک نہ دوں گا سرِ شبیر

اور اس پر یہ دیدہ دلیری "زر میں نے لٹایا ہے تو سر ہاتھ لگا ہے" یہ سن کر سید سجاد سے ضبط نہیں ہو سکتا وہ غصے میں کہتے ہیں ؎

سجاد نے فرمایا کہ او کاذب و مکار　　　وہ عذر ابھی تھا ابھی یہ کرتا ہے گفتار

لیکن یزید پر ہر بات بے اثر ہے، وہ سرِ سید الشہدا منگاتا، زلفیں پکڑ کر اٹھاتا اور بے دردی سے زینب سے کہتا ہے ؎

لے دیکھ کہ یہ سر ترے بھائی کا ہے آیا

سب اہلِ بیت حسینؑ کا سر دیکھ کر نالہ و فریاد کرنے لگتے ہیں۔ ایسے وقت میں

حاکم کی شقی القلبی کا یہ عالم ہے ؎

بیٹھا ہوا تھا تخت پہ وہ ظالمِ اظلم　　زلفیں سرِ شبیرؑ کی تھامے خوش و خرم
اور غش میں پڑی خاک پہ تھی زینبِ پر غم　　پر الفتِ شبیرؑ کا میں کیا کہوں عالم
زینب کے تو بہتے تھے ادھر خاک پہ آنسو
جاری تھے ادھر شہ کے رخِ پاک پہ آنسو

اور اس حالت میں حاکم سرِ حسینؑ لے کر دربار سے اٹھ جاتا ہے امامِ وقت سمجھ جاتے ہیں کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تو پھوپھی کو سمجھاتے ہیں ؎

تب آئے وہاں روتے ہوئے عابدِ دلگیر　　زینب کو اٹھا خاک سے کی رو کے یہ تقریر
موقوف بس اب نالہ و افغاں کرو حضرت
چلنے کا وطن کے کوئی ساماں کرو حضرت

امام حسینؑ کی شہادت تک میر انیسؔ کے کلام میں حضرت زینب کی جو سیرت اور کردار سامنے آتا ہے۔ اس میں اخلاق کی بلندی ہے، شخصیت کی پختگی ہے اور ایک سمجھ دار باوقار خاندان کی سرپرست اور کرتا دھرتا عورت کا جلوہ ہے۔ سب سے گہرا تاثر جو قاری پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ زینب ایک فرض شناس ماں، خاندان کی چاہنے والی بزرگ اور عاشقِ زار بہن ہے۔ اس وقت تک یہ محسوس ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کی شخصیت ایک آفتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور زینب کی ماہتاب کی۔ ان کا ہر عمل، ہر کام، ہر محبت کا مرکز حسینؑ کی ذات ہے۔

لیکن شہادتِ حسینؑ کے بعد زینب کا بھرپور کردار سامنے آتا ہے اور میر انیسؔ نے اس کو بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ زینب کا یہ کردار بتاتا ہے کہ وہ اور حسینؑ ایک ہی شاخ کے دو پھول، ایک ڈالی کے دو ثمر، ایک تصویر کے دو رخ ہیں۔ ان دونوں کی تعلیم اور تربیت ایک ہی ماحول میں ہوئی۔ دونوں کے اصول اور مقاصد ایک

تھے۔ ایک ہی شمعِ ایمان بہن بھائی دونوں کے سینے میں روشن تھی۔ عزم و ثبات کی ایک ہی روح زینب اور حسینؑ دونوں کے اندر تھی۔ اسلام کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے اور اس کی روح کو بچانے کی جس لگن کی خاطر حسینؑ نے جان دی اس مقصد کے لیے زینب نے زندہ رہنا گوارا کیا۔ انھیں مر کر اپنا مقصد واضح کرنا اور انھیں زندہ رہ کر اس مقصد کو تکمیل کو پہنچانا تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حسینؑ کی شہادت سے پہلے زینب بھائی بہن کی بے پناہ اور جذباتی محبت میں اس طرح سرشار ہیں کہ ان کی ہر سوچ اور ہر عمل اس کے گرد گھومتا نظر آتا ہے۔ ان کی گریہ وزاری و بے قراری اور حسینؑ کی سلامتی کی جد و جہد آخر تک قائم رہتی ہے۔ بھائی کے شہید ہونے کے بعد چند لمحوں تک ان کی وہی کیفیت نظر آتی ہے جو ایسی عاشقِ زار بہن کی ہونی چاہیے۔ مگر جیسے ہی شدتِ غم انھیں سوچنے کا موقع دیتی ہے اور اس فرض کا احساس ہوتا ہے جو اب ان کے صرف ان کے سر آیا ہے تو زینب رنج و غم کے ساگر کو سینے میں چھپا لیتی ہیں۔ اور پورے استقلال کے ساتھ ان ذمہ داریوں کو اپنے بوڑھے شانوں پر اٹھا لیتی ہیں۔ جو سردارِ خاندان کی شہادت اور سید سجاد کی بیماری کی وجہ سے ان پر آن پڑی ہیں۔ ساتھ ہی انھیں یہ احساس ہے کہ حسینؑ نے جس مقصد کے لیے جان دی اس کو دنیا کے سامنے واضح کرنا ان کا فرض ہے اور اس عظیم مقصد کو پورا کرنا بھی وہ اپنا فرض سمجھتی ہیں۔

یہیں سے زینب کے کردار کی انفرادیت ابھرتی ہے۔ اب وہ محض حسینؑ کا سایہ نہیں نظر آتیں بلکہ اب اس عورت کی شخصیت اُبھرتی ہے جسے علیؑ مرتضیٰ نے خود تعلیم دی ہے اور جو سارے عرب میں عقیلہ بنی ہاشم کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے فصیح و بلیغ و پر اثر، پر جوش خطبے (جو تاریخ کربلا میں محفوظ ہیں)، ان کی شجاعت اور بے خوفی، وقت کی سب سے بڑی طاقت کو للکارنے اور ملامت کرنے کی جرأت اور

ہر جگہ ہر وقت حق گوئی کا پرچم بلند کرنے کا حوصلہ انھیں تاریخِ انسانی کا ایک بے مثال اور دلکش کردار بنا کر سامنے لاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں عورتوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں اس میں کوئی شک نہیں لیکن پچپن برس کی ایک ایسی بوڑھی عورت جس پر چند دنوں میں مصائب کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں۔ جس کا چند گھنٹوں میں سارا خاندان آنکھوں کے سامنے شہید کر ڈالا گیا ہے اس پر ذمہ داری آن پڑتی ہے بیوہ عورتوں کی، نوجوان اور کمسن لڑکیوں کی، ننھے یتیم بچّوں کی، اور ایک بیمار و نزار نوجوان کی۔ جس کی جان کی حفاظت بھی اسی کے ذمہ ہے کہ اسی سے حسینؑ کی نسل چلنے والی ہے۔ اور یہ بہادر عورت ساری ذمہ داریاں سنبھال لیتی ہے ظالم بے درد دشمنوں کی بھری محفلوں میں بہادری اور جرأت کے کرشمے دکھاتی، تلواروں کے سائے میں سچائی کی تبلیغ کرتی اور نیزوں کی نوکوں اور درّوں کی بوچھاروں میں حق گوئی کا پرچم بلند کرتی، سال بھر تک جہاد کرتی رہتی ہے۔ بدی کی قوتوں سے بے تشدّد جہاد، وہ جہاد جس نے دشمن کی ہر تلوار توڑ دی، ہر نیزہ کند کر دیا۔ ہر عمل خاک میں ملا دیا۔ حق و صداقت کا جو علم اس کے بھائی نے جان دے کر بھی نہ جھکنے دیا تھا، اسے اس ضعیف عورت نے بلند رکھا۔ یہاں تک کہ دشمن ہار گیا اور اسے وہ شاندار فتح حاصل ہوئی جس کا نقارہ چودہ صدیوں سے فضاؤں میں گونج رہا ہے۔

یوں تو میر انیسؔ نے کربلا کے سبھی مجاہدوں کی سیرت نگاری کمال کے ساتھ کی ہے اور اسی طرح ان سب خواتین کی سیرت اور شخصیت کو بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا ہے، جن کا واقعاتِ کربلا سے براہِ راست یا بالواسطہ تعلق ہے لیکن حضرت زینب کا کردار جن کی حیثیت المیۂ کربلا میں سب سے زیادہ اہم ہے جس انداز میں انیسؔ نے پیش کیا ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس شخصیت کے لیے میر انیسؔ جیسا فن کار ہی موزوں اور مناسب تھا۔

داستانِ اشک و خون

از

خواجہ غلام السیدین (مرحوم)

مقدمہ

کرنل سید بشیر حسین زیدی

خواجہ غلام السیدین ہمارے ان چند دانش وروں میں تھے جن کی شہرت حدودِ ملک و وطن میں محصور نہیں تھی۔ وہ ایک ماہرِ تعلیم، دانش ور اور ادیب کی حیثیت سے دنیا بھر میں جانے اور مانے جاتے تھے۔

خواجہ صاحب سیاست داں نہیں تھے، لیکن ان کے پہلو میں حساس دل تھا۔ سالِ گذشتہ کی ابتدا سے بالخصوص ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد سے بنگلہ دیش میں جو روح فرسا واقعات رونما ہوئے، اخلاق و اقدار کا جس طرح خون ہوا اور جمہوری اصولوں کو جس طرح کچلا گیا اس سے انھیں سخت دکھ ہوا، انھیں سب سے بڑا قلق یہ تھا کہ یہ سب اسلام اور مذہب کے نام پر کیا جا رہا ہے وہ مذہب جو امن و آشتی کا پیغامبر ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنے دلی کرب و اضطراب کو چند تقریروں اور مضامین میں ظاہر کیا ہے۔ یہ تقریریں اور مضامین اس لیے کتابی صورت میں شائع کیے جا رہے ہیں تاکہ ہندوستان اور پاکستان کے دانش ورانِ میں اپنے جذبات اور احساسات کی گونج سن سکیں۔

قیمت ۲۰/۱

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

معیاری ادب

	مرتب	لائبریری ایڈیشن	طلبہ ایڈیشن
مقدمۂ شعر و شاعری	رشید حسن خاں	۳/۲۰	۲/۶۰
انتخابِ سراج اورنگ آبادی	(ڈاکٹر) محمد حسن	۱/۷۰	۱/۲۰
موازنۂ انیس و دبیر	رشید حسن خاں	۴/۲۵	۳/۲۵
انتخابِ مراثی (انیس و دبیر)	رشید حسن خاں	۴/۰۰	۳/۰۰
انتخابِ نظیر اکبرآبادی	رشید حسن خاں	۴/۴۰	۳/۴۵
نیرنگِ خیال	مالک رام	۲/۳۰	۱/۵۰
فسانۂ آزاد (تلخیص)	(ڈاکٹر) قمر رئیس	۷/۵۰	۶/۲۰
فردوسِ بریں	(ڈاکٹر) قمر رئیس	۲/۶۰	۲/۱۰
شریف زادہ	(ڈاکٹر) قمر رئیس	۳/۰۰	۲/۵۰
حیاتِ سعدی	رشید حسن خاں	۴/۰۰	۳/۲۵
انتخابِ اکبر الٰہ آبادی	(ڈاکٹر) صدیق الرحمٰن قدوائی	۲/۵۰	۲/۰۰
انتخابِ میر	(ڈاکٹر) محمد حسن	۴/۵۰	۳/۶۰
دیوانِ درد	رشید حسن خاں	۳/۳۰	۲/۷۵
مجالس النسا	صالحہ عابد حسین	۳/۰۰	۲/۵۰
انتخابِ مضامینِ شبلی	رشید حسن خاں	۸/۵۰	۷/۰۰
امراؤ جان ادا	(ڈاکٹر) محمد حسن	۷/۵۰	۶/۰۰
یادگارِ غالب (حصۂ اردو)	مالک رام	۶/۵۰	۵/۵۰
یادگارِ غالب (حصۂ فارسی)	مالک رام	۸/۰۰	۶/۵۰
مثنوی گلزارِ نسیم	رشید حسن خاں	۳/۰۰	۲/۵۰
گذشتہ لکھنؤ	رشید حسن خاں	۱۰/۰۰	۹/۵۰
فسانۂ مبتلا	(ڈاکٹر) صدیق الرحمٰن قدوائی	۶/۰۰	۵/۰۰
انتخابِ ولی	(ڈاکٹر) سید ظہیر الدین مدنی	۳/۰۰	۲/۵۰
افاداتِ سلیم	(ڈاکٹر) خلیق انجم	۶/۳۰	۵/۵۰
توبۃ النصوح	مالک رام	۵/۵۰	۴/۵۰
قصۂ حاتم طائی	اطہر پرویز	۴/۰۰	۶/۰۰
انتخابِ ناسخ	رشید حسن خاں	۷/۵۰	۶/۵۰
انتخابِ سودا	رشید حسن خاں	۱۱/۵۰	۱۰/۰۰
انتخابِ محمد قلی قطب شاہ	محمد اکبرالدین صدیقی	۵/۵۰	۴/۵۰
انتخابِ ذوق	(ڈاکٹر) تنویر احمد علوی	۴/۲۵	۳/۵۰
انتخابِ مضامینِ سرسید	انور صدیقی	۳/۲۰	۲/۸۰